بیادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیرِ اعزازی

قاضی اطہر مبارکپوری

مُرتّب

جمیل مہدی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق وفلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخِ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج وزوال۔ تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ"۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ سرایہ۔ تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج وزوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ"۔ تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر ومغربِ اقصیٰ"۔ تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔
اشاعتِ اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ"۔ بارج برنارڈشا۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
ازسرِنو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابتِ حدیث۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

برہان

مدیر مسئول: عمید الرحمن عثمانی

جلد نمبر ۹۸ — ذیقعدہ سنہ ۱۴۰۶ھ مطابق جولائی سنہ ۱۹۸۶ء — شمارہ نمبر ۱

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

وقت آگیا ہے کہ فرقہ وارانہ مسائل اور ان کے سماجی اثرات کے بارے میں مسلمانوں کی زبان پر صاف صاف سوال ہو اور وہ سیاسی رہنماؤں اور فرقہ پرست تنظیموں کے لیڈروں سے حقائق کی روشنی میں اس سب سے بڑے الزام کی وضاحت اور قطعی فیصلہ طلب کریں کہ ملک کی تقسیم کی ذمہ داری، مسلمانوں پر کس طرح یکطرفہ طور پر عائد کی جا سکتی ہے۔ ۳۸ برس ہندوستان کی آزادی پر گذر گئے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سیاسی رہنماؤں اور فرقہ پرست ہندو تنظیموں نے ابھی تک مسلمانوں کو تقسیم کے الزام سے بری نہیں کیا، بلکہ جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں اس الزام کی سختی اور تلخی بڑھتی ہی جاتی ہے اور اس کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کی کروڑوں پر مشتمل اقلیت کو ملک دشمنوں کا ایک ایسا مجموعہ قرار دیدیا گیا ہے جو ہندوستان کی ہر پریشانی اور دشواری کی ذمہ دار ہے، اور جو ملک کی تقسیم کے ناقابل معافی جرم کی وجہ سے مستقبل میں بھی کسی درجہ کے اعتماد اور اعتبار کی مستحق نہیں سمجھی جا سکتی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تقسیم کے الزام کو مسلمانوں پر اس قطعیت کے ساتھ عائد کیا گیا ہے کہ عام لوگوں کی بات تو الگ رہی، اچھے اچھے سمجھدار قومی لیڈروں نے ایک ناقابلِ انکار اور طے شدہ حقیقت کے طور پر قبول کر رکھا ہے اور ہر چھوٹے بڑے فرقہ وارانہ فساد کے وقت اس الزام کی گونج، حالات کی تحلیل وتجزیہ کے دوران سننے میں آتی ہے اور اس بات کو فرقہ وارانہ منافرت کے ایک لازمی عنصر کی حیثیت دی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے ملک تقسیم کرانے کے اقدام نے جو تلخی اور زہر سماج میں گھولا تھا وہ ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے اور فسادات کا ماحول اور خمیر تیار کرنے میں بدستور کام کرتا رہتا ہے وہ کہتے ہیں کہ فرقہ وارانہ سیاست کی پیدا کی ہوئی مذہبی منافرت جس کا مسلم لیگ کی سیاست کی دع

سے فروغ ہوا، اس درجہ پائیدار بن گئی کہ ملک کی ۸۰ فیصدی ہندوؤں پر مشتمل اکثریت کو اس بات کا یقین ہی نہیں آتا کہ مسلمان کبھی دیس کے وفادار بن سکتے ہیں اور موقع ملنے پر دوبارہ اکثریت کی راہ میں دشواریاں کھڑی کرنے سے باز رہ سکتے ہیں۔

مسلمانوں پر عدم اعتماد اور ان کے بارے میں شکوک وشبہات کی فضا آہستہ آہستہ اتنی گہری اور زہر آلود ہوگئی ہے کہ ملک کی اکثریت کا ضمیر ان کے وجود کو ہی ملک کے نحوست کی ایک علامت اور خطرہ کی لال روشنی سمجھنے لگا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ انھیں ایسا کوئی موقع اور مہلت دینے پر تیار نہیں جو ان کے اندر خود اعتمادی اور حوصلہ پیدا کرسکے، دوسرے الفاظ میں وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک محکوم طبقہ بنا کر رکھنا چاہتا ہے اور ہر عملی اور ہر طریقہ سے ان پر اس حقیقت کو ثابت کردینا چاہتا ہے کہ یہ ملک پورے طور پر ہندوؤں کی ملکیت ہے اور ہندوؤں کے علاوہ سبھی اقلیتی طبقوں اور فرقوں کو ہندوؤں کی مکمل متابعت پر رضامندی دینے کے بعد ہی ملک میں رہنے اور زندگی بسر کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک طرف فرقہ پرست تنظیموں کیطرف سے اس ملک کو ایسی ہندو اسٹیٹ ثابت کرنے کی کوشش کیجارہی ہے جہاں ہندوؤں کی خواہش اور مرضی کو سبھی معاملات پر تفوق حاصل ہے۔ اور ان تنظیموں کے اس خیال کو انتظامیہ پولیس اور پی اے سی کی پوری تائید اور ہمنوائی حاصل ہے۔ جو فرقہ وارانہ فسادات کے موقعوں پر ہر شہر اور ہر ریاست میں اقلیتوں کے خلاف یکطرفہ کاروائی کا فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں، اور مسلمانوں کے دلوں پر جان ومال اور عزت، آبرو کے نقصان کی صورت میں ایسے زخم لگاتے ہیں جنکی لرزہ خیز یاد، زندگی کے آخری لمحوں تک انکے لئے ناقابلِ فراموش رہتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ ایک عجیب، مضحکہ خیز اور دردناک حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ تقسیم ملک کے نتیجہ میں، ہندوستان اور پاکستان کے جو دو ملک عالم وجود میں آئے تھے ان کی آزادی کی جدوجہد اور تشکیل کے نصب العین ایک، دوسرے سے بالکل مختلف تھے، اور انکے سیاسی نظریات میں زمین و

آسمان کا فرق پایا جاتا تھا، مسلم لیگ کی جد وجہد کا سارا زور اسلام کے نام اور وحدت کلمہ کی منطق پر تھا وہ دو قومی بلکہ مختلف قومی نظریہ کی دلیل میں اس بات کو ظاہر اور ثابت کرنے میں پیش پیش تھے کہ مذہب، قومیت، نسل، زبان، علاقائیت اور تہذیب سے بالاتر ایک چیز ہے اور اسلام پر عقیدہ کے ساتھ ہی یہ ساری زنجیریں اس طرح ٹوٹ کر گر جاتی ہیں کہ ان کی کوئی جکڑ، اسلامی ریاست کے عمل و کار پر باقی نہیں رہ جاتی۔ انکے برعکس کانگریس کے نصب العین اور جد وجہد آزادی کے سیاسی نظریات کی اساس متحدہ قومیت پر تھی، اور اس کا سارا زور مذہب کو سیاسی دائرے سے الگ رکھکر سیکولر اور جمہوری اصولوں کی بنا پر ایک فلاحی ریاست کے قیام پر تھا، وہ کہتے تھے کہ قومیں وطن کی بنیاد پر بنتی ہیں، اور اختلاف مذہب قومیت کے تانے بانے پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا، بلکہ اسکی اہمیت علاقائیت، زبان، تہذیب اور کلچر جیسے ایک عنصر کی ہوتی ہے جو قومیت کی تشکیل میں اجزاء لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں وہ کہتے تھے کہ جسطرح پنجابی، گجراتی، بنگالی، مدراسی، اور مراٹھی، علاقائی قومیں تہذیبی اعتبار سے اپنی الگ شناخت رکھتی ہیں، اور سناتن دھرمی ہندوؤں، جینیوں، بودھوں، سکھوں، پارسیوں اور عیسائیوں کے مختلف مذہبی عقائد پر عمل کرتی ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی ان علاقائی تہذیبوں میں منقسم ہیں اور ان سے مختلف مذہب اسلام پر اپنا عقیدہ رکھتے ہیں، اس لئے ہندوستان کی ایک متحدہ قوم کی تشکیل اور ریاست کی تعمیر میں مذہبی اختلاف کی بنا پر متحدہ قومیت اور دو قومی نظریہ کا تصور کسی طرح نہ تو حقیقت اور منطق کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے نہ ہی قابل قبول ہے مسلم لیگ اور کانگریس کے سیاسی نظریات کا یہ بنیادی اختلاف نہ صرف دونوں سیاسی جماعتوں کی کشمکش کے آخری نقطۂ عروج تک قائم رہا اور ملک کی تقسیم کا کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان باقاعدہ سمجھوتہ کی بنا پر فیصلہ ہونے کے بعد بھی ہندوستان نے سیکولر جمہوری نظریات اور متحدہ قومیت پر اپنا سیاسی عقیدہ برقرار رکھا اور اسکی بنا پر وہ سیکولر دستور کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی نے مرتب کیا جو سنہ ۱۹۵۰ء سے ہندوستان کے سیاسی اور قومی کردار کی رہنمائی کر رہا ہے۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ملک کی تقسیم کے بعد دونوں ملکوں کا قومی کردار انکے بنیادی سیاسی

عقائد اور قومی نصب العین کے برخلاف، کھلے انحراف کے راستہ پر چل پڑا، اور اس انحراف کی بدولت پاکستان میں جو رنگ، نسل علاقائیت اور زبان کے جھگڑوں سے بالاتر، اسلام کی مذہبی حاکمیت کے قیام کے مقصد کے تحت عالم وجود میں لایا گیا تھا، زبان، علاقائیت اور جغرافیائی اختلاف کے عناصر ایسی شدت کیساتھ حکومت اور سیاست کے اندر داخل ہوئے کہ صرف ۲۵ برس کے اندر پوری مملکت ٹوٹ کر دو ٹکڑوں پاکستان اور بنگلہ دیش میں بٹ گئی، اور پنجابی، سندھی، سرحدی اور بلوچستانی قومیتوں کے درمیان کشمکش کی ایک ایسی شدید کشمکش اٹھ کھڑی ہوئی جس میں مذہب کی گرفت کا ادنیٰ سا بھی زور باقی نہ رہا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ۳۸ برس کی طویل مدت گذر جانے کے باوجود پاکستان میں نہ تو کوئی ایسا دستور بن سکا جو پاکستانی قوم کی سمت اور سیاسی کردار کو واضح کر سکے، نہ ہی وہاں صوبائی کشمکش کے خاتمہ کی کوئی صورت پیدا ہو سکی جس کی وجہ سے اس کا سیاسی مستقبل ہی بے یقینی ہو کر رہ گیا ہے، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ ۲۵ برسوں میں وہاں کے حالات کونسا رخ اختیار کریں گے، —— ہندوستان میں بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہیں، جہاں قومی کردار اس دستور کے رہنما اصولوں اور سیکولر اور جمہوری ریاست کے نصب العین کے بالکل خلاف، ہندو اسٹیٹ کے کھلے رجحان کی طرف مڑ گیا ہے، اور ملک پر خالص دو قومی نظریہ کے تحت ہندو قوم کی حاکمیت قائم کرنے کا فلسفہ اتنی تیزی کے ساتھ قبول عام کا درجہ حاصل کرنے کی طرف بڑھ رہا ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ، دوسری مذہبی اقلیتوں میں بھی عدم تحفظ اور مستقبل کیطرف سے تشویش کا احساس اتنا شدید ہو گیا ہے جس کی بدولت پورے ملک میں شدید بے چینی اور بدگمانی پیدا ہو گئی ہے، اور جگہ جگہ اس بے چینی کے مظاہر مختلف قسم کی شورشوں اور تحریکوں کی صورت میں دکھائی دے رہے ہیں۔ پنجاب اس بے چینی اور بداعتمادی کی ایک نمایاں مثال ہے جو اس سکھ قوم کی دہشت گردی کے سبب جہنم کا نقشہ پیش کر رہا ہے جو اب تک ہندو قوم کا بازوئے شمشیر زن سمجھی جاتی تھی،

اتنی تفصیل کے ساتھ ہم نے ۱۹۴۷ء کی ملکی تقسیم اور اسکے اثرات و مضمرات کا پس منظر اس لئے پیش کیا ہے۔

تاکہ اس بنیادی الزام کی حقیقت ظاہر ہو سکے جو مسلمانوں پر اس تقسیم کے بارے میں لگایا جاتا ہے اور پورے ۳۸ برس سے مسلمانوں کے دل میں پشیمانی اور مجرمانہ غلطی کا احساس پیدا کرنے میں سب سے زیادہ موثر ثابت ہوتا رہا ہے۔ اس پورے عرصہ میں ہندوستان کے قومی ضمیر کے اندر حقیقت شناسی اور حقیقت بیانی کا کوئی تقاضا اور کوئی روشنی دیکھنے میں نہیں آئی ہے جبکہ تاریخ اور حقیقت دونوں کا فیصلہ اسکے خلاف ہے بلکہ منطق کے اصول پر اس الزام کو پرکھا جائے تو وہ لوگ زیادہ خطاوار ثابت ہوتے ہیں، جو اپنی کمزوری اور غلطی کو چھپانے کے لئے اس الزام کو اونچی آواز وں کیساتھ مسلمانوں پر رکھتے رہے ہیں۔ ——— تاریخ کا کوئی ناظر اور ان طلاطم خیز واقعات کا ابتک زندہ رہنے والا کوئی مشاہد اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ ملکی تقسیم کا فیصلہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت اور سمجھوتہ کے تحت کیا گیا تھا، اور اس کے دو فریقوں۔ مسلم لیگ اور کانگریس۔ میں سے کانگریس پر تقسیم کی ذمہ داری اس لئے زیادہ ہے کہ اس کے فیصلے پر تقسیم کو ماننے یا نہ ماننے کا دار و مدار تھا۔ مسلم لیگ تقسیم ملک کی خواہاں اور طالب ضرور تھی، لیکن اس کی خواہش اور مطالبہ صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا تھا کہ کانگریس اس مطالبہ کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جا۔

اس سلسلہ میں تاریخی ریکارڈ سے یہ بات پوری طرح ثابت ہے کہ ایک گاندھی جی اور دوسرے مولانا آزاد۔۔ بس یہ دو آدمی تھے جنہوں نے تقسیم کی تجویز کو آخر تک قبول نہیں کیا، گاندھی جی نے تو تقسیم سے متعلق بیزاری کا اظہار ایسے پیغمبرانہ پیشینگوئی کی صورت میں کیا تھا کہ "برطانیہ نے تقسیم کی صورت میں کانگریس کے ہاتھ میں لکڑی کی ایسی روٹی تھمادی ہے جیسے وہ نہ کھائینگے تو بھوک سے مرجائیں گے، کھائینگے تو ویسے مرجائیں گے" اور مولانا آزاد وہ کانگریسی لیڈر تھے جو آخر تک تقسیم کی مخالفت کرتے رہے اور تقسیم کے بعد اپنی کتاب انڈیا ونس فریڈم میں گاندھی جی تک کو اس بارے میں مورد الزام ٹھہراتے رہے کہ انھوں نے اس تباہ کن تجویز کی مخالفت اور کھلے مقابلہ سے گریز کیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ ملک کی تقسیم قائداعظم جناح نے نہیں بلکہ جواہر لال نہرو، سردار پٹیل راج

گوپال اچاریہ، پنڈت گوبند پنتھ، ڈاکٹر بی سی رائے، بی، جی کھیر اور دوسرے لیڈروں نے کرائی تھی، تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا، کیونکہ یہ ہی وہ ممتاز قومی لیڈر تھے جنہوں نے ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ کے دائمی حل کی صورت میں ملک کی تقسیم کو واحد حل قرار دیکر نہ صرف قبول کیا بلکہ صاف طور پر اپنے اس خیال کو تاریخ میں ریکارڈ کرایا، کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کیلئے تقسیم کے علاوہ دوسرا چارۂ کار موجود نہیں ہے، اس تاریخی شہادت اور واقعاتی حقیقت کے بعد کسی ایسے آدمی یا کسی قومی تنظیم اور کسی فرقہ پرست جماعت کے لیڈر کو جو ذرا بھی سیاسی دیانت رکھتا ہے مسلمانوں پر ملک کی تقسیم کا الزام لگانے کا کوئی حق نہیں ہے، اور مسلمانوں کو اب صاف طور پر اس سوال کا جواب، قومی قیادت سے طلب کرنا چاہئے کہ جب کانگریس نے جو تقسیم کے تنازعہ میں ایک بڑے فریق کی حیثیت رکھتی تھی تقسیم کی تجویز کو منظور کیا تھا تو یہ الزام مسلمانوں پر کس طرح عائد ہو سکتا ہے۔

قرآن ـــــ عظیم ادب کا معیار

عبدالرحمن محسن انصاری

قرآن مجید قیامت تک کے لیے ایک معجزہ ہے۔ وہ اس وقت بھی ایک معجزہ تھا جب اہل عرب کے درمیان نبیٔ امی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہو رہا تھا اور آج بھی معجزہ کہ جب انسان خلاؤں میں پرواز کر رہا ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ قیامت تک کے لیے ہے کہ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ (یونس ۳۸) "اگر وہ کہتے ہیں کہ اللہ کا نبی یہ قرآن خود بنا کر لایا ہے تو اُن سے کہہ دو کہ اس کی ایک ہی آیۃ کے مثل کوئی کلام بنا کر لاؤ اور اس کام میں اللہ کے ماسوا تم جن کو پکارتے ہو ان سب کی مدد لے لو پھر دیکھیں تم کتنے سچے ہو"

انسانی کلام کے مقابلے میں تمام صحفِ آسمانی کی ایک الگ شان ہے مگر تمام صحفِ آسمانی میں بھی قرآن ممتاز ہے۔ قرآن کے آگے فصحائے عرب کی زبانیں گنگ ہو گئیں شعراء نے اعتراف عجز کر لیا۔ قرآن کے مقابلے میں ان کا عاجز ہونا کس بنا پر تھا؟ قرآن کی فصاحت و بلاغت کی بنا پر۔ شعریت قرآن کی آیتہ آیتہ میں رچی بسی ہے اور یقیناً حق بحث سے بالاتر تھا۔ حق و صداقت، موعظت و حکمت، تذکیر و تبشیر، تاریخی واقعات ان دیکھے حقائق سب اس طرح ساتھ ساتھ قرآن میں بیان ہوئے ہیں کہ جن کے پڑھنے اور سننے سے طبیعت کبھی نہیں اُکتاتی۔ اس کا اثر پورے انسانی وجود کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس کے الفاظ کا زیر و بم شیرینی اور اثر آفرینی کا جواب نہیں۔ وہ پڑھنے اور سننے والوں پر بیخودی طاری کر دیتا ہے۔ کبھی اس کا بیان لرزہ براندام کر دیتا،

کبھی رُلا دیتا اور کبھی کیف و انبساط میں غرق کر دیتا ہے۔ قرآن کی عظمت اور اثر کا کوئی کیا اندازہ لگا سکتا ہے۔ یقیناً اگر وہ پہاڑ پر نازل ہوتا تو وہ بھی خشیتِ الٰہی سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ انسانی قلوب کا کیا ذکر ہے۔ جس طرح قرآن کی کسی ایک آیۃ کا انکار کرنا کفر ہے اسی طرح قرآن کی آیتوں کی ادبی عظمت کا انکار کرنا بھی کفر ہے۔

قرآن کوئی مسلسل تقریر یا منضبط کتاب نہیں۔ اس کا اسلوب بے نظیر ہے۔ اس میں عقائد بھی ہیں، حکایتیں اور تمثیلیں بھی، عبرت آموزی بھی، دعوت مشاہدہ بھی، ڈراوا بھی، خوشخبری بھی۔ غرض مضامین کی تکرار ہر بار ایک نئے معنی اور نئے لطف کے ساتھ۔ اس کے بیان کی تازگی کبھی نہیں جاتی۔ اس کے باغ میں ہمیشہ ایک بہار بے خزاں ہے۔ اس کا اثر جاودانی ہے۔ وہ ہمیشہ قلب و روح کے لیے غذا فراہم کرتا ہے۔ اس کا ادب حق ہے اور اس کے ہر اسلوب سے حق کا اثبات ہوتا ہے۔ وہ حق جس کی گواہی کائنات کا ذرّہ ذرّہ دے رہا ہے۔ یعنی اللہ ہے۔ وہی اوّل ہے وہی آخر وہی ظاہر ہے وہی باطن۔ اُس کی ربوبیت، رحمت، علم، انصاف، حکمت اور قوت پر کائنات کی ہر شے شاہد ہے۔ عقیدۂ توحید قرآن کے تمام عطا کردہ عقائد کی جان ہے۔ شرک اس کے نزدیک ظلمِ عظیم ہے۔ جس طرح کائنات کی ہر شے سے توحید باری تعالیٰ کا اثبات ہو رہا ہے۔ قرآن اپنے ہر مومن کے لیے لازم قرار دیتا ہے کہ اس کے اعمال و افکار بھی توحید کے مطابق ہوں۔

انسان قدرت خداوندی کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ تمام مخلوقات میں اس کے اشرف ہونے کا سبب قرآن نے یہ بیان فرمایا۔ الرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ۝ (الرحمٰن ۱) "نہایت مہربان خدا نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔ اس نے انسان کو پیدا کیا اور اُسے بولنا سکھایا۔" علم بیان سے انسان کا بہرہ ور ہونا اللہ کی عظیم بخشش ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس عطیۂ خداوندی میں انسان کے

اشرف المخلوقات ہونے کا راز پوشیدہ ہے۔ انسان کے علاوہ کوئی جاندار مخلوق کلام پر قادر نہیں۔ مربوط کلام کی شرط عقل ہے اور عقل انسان ہی رکھتا ہے۔ عقل ہی امتیاز و انتخاب کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اسی سے تصوّر و تخیّل کا ملکہ حاصل ہوتا ہے قرآن کا علم ان سب عطیاتِ عقلی کا سرتاج ہے اور وہ براہِ راست اللہ کے علم و رحمت سے انسان کو عطا ہوا ہے۔ معلوم ہوا صفتِ بیان انسانی شرف و کمال کی بنیاد ہے۔ اگر انسان اپنے دل کی بات زبان سے دوسروں تک نہ پہنچا سکتا۔ اگر اپنے نتائج فکر اور عقلی قوتوں کا اظہار نہ کر سکتا تو نہ بے شمار علوم و فنون معرضِ وجود میں آتے، نہ حکمت کا سرمایہ ہوتا نہ سیاست کا اقتدار۔ نہ تمدن ہوتا نہ ایجادات۔ نہ شعر ہوتا نہ نغمہ۔ نہ قرآن کی تلاوت کے ذریعے نفوسِ انسانی ذکر کی لذت سے آشنا ہوتے اور نہ علم و حکمت کی تعلیم ہو سکتی۔

ذاتِ الٰہی تمام حسن و خیر کا سرچشمہ ہے۔ تمام اچھے نام اللہ ہی کے ہیں۔ تمام تعریف کا وہی سزاوار ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ ط إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ٥ (لقمان ۲۷) "زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں لکھنے سے ختم نہ ہونگی۔ بیشک اللہ زبردست اور حکیم ہے"۔ ایک دوسری جگہ فرمایا: هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ٥ (حشر ۲۴) "وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے"۔ چنانچہ انسانوں کو بھی حکم دیا

گیا۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ○ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ○ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ○ (الاعلیٰ ۱-۳) "(اے نبی) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا جس نے تقدیر بنائی اور پھر راہ دکھائی۔" ایک دوسری جگہ فرمایا۔ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ج فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ (یونس ۳۱) "اُن سے پوچھو کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں۔ کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے۔ وہ ضرور کہیں گے اللہ۔ کہو پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) کیوں پرہیز نہیں کرتے۔" قرآن نہیں کہتا کہ انسان اندھے بہرے ہو کر ایمان لائیں۔ وہ آزادیٔ عمل ہی کی بنا پر انسان کو لائق جزا و سزا سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○ (الزمر ۹) "نصیحت تو عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔" انسان کی فطرت محبت، پرستش اور علو چاہتی ہے۔ چنانچہ جس ہستی سے لو لگانے سے یہ تقاضے پورے ہوتے ہیں اس کا نشان اس کی فطرت میں موجود ہے۔ قرآن نے تخلیق آدم کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ۔ قَالُوْا بَلٰى۔ (الاعراف ۱۷۲)۔ اللہ تعالیٰ نے روز ازل میں انسانوں کی روحوں سے فرمایا "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے جواب دیا بیشک تو ہے۔" اللہ کی ربوبیت کا اعتراف نفس انسانی کے اندر موجود ہے۔ ربوبیت کی نشانیاں آفاق میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ البتہ اس کے لیے دیدۂ بینا درکار ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے۔ "وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○ (یوسف ۱۰۵) "زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گذرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے۔"

اللہ کی نشانیوں کے مشاہدے سے انسان کو علم حاصل ہوتا ہے۔ اُن پر غور و فکر کرنے سے ایمان راسخ اور عمل پائدار ہوتا ہے۔

مظاہر فطرت اللہ کی نشانیاں ہیں۔ قرآن نے مناظر فطرت کا بہت مقامات پر خوبصورت الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے: إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ (البقرہ ۱۶۲/۱۶۴) "جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں اُن کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے، پھر اسی کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اس انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے۔ ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں بے شمار نشانیاں ہیں۔"

ایک دوسری مثال: وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ ۝ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ ۝ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ۝ اُس کے آگے فرمایا: مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۝ آگے فرمایا وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ۝ "زمین کو اُس نے مخلوقات کے لیے بنایا اس میں ہر طرح کے بکثرت لذیذ پھل ہیں۔ کھجور کے درخت ہیں۔ کھجور کے درخت ہیں جن کے پھل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ طرح طرح کے غلے ہیں جن میں بھوسا بھی ہوتا ہے اور دانہ بھی۔

اس نے دو سمندروں کو چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں۔ پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔ پس اے جن وانس تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے۔ اور یہ جہاز اسی کے ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے اٹھے ہوئے ہیں۔"

یہ زمین و آسمان بیکار نہیں بنائے گئے ہیں۔ زندگی بے مقصد نہیں۔ مظاہر حیات گورکھ دھندا نہیں۔ کائنات اندھی قوتوں کی جولان گاہ نہیں۔ انسان نے عالم فطرت کا مشاہدہ کر کے اشیاء کے اندر ایک مشترک قانون دریافت کیا اور اس کا نام قانونِ فطرت رکھا۔ قانون فطرت بھی دراصل اللہ ہی کا حکم ہے۔ اِنَّمَا اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (یٰس ۸۲) " وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔" قرآن نے صاف طور پر آگاہ کیا کہ کائنات بے مقصد نہیں بنائی گئی ہے۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (الدخان ۳۸/۳۹) " آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنائی ہیں۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔" یہ نہ جاننے والے مشرکین و ملحدین ہیں جنھوں نے اپنے نفس کو اپنا آلہ بنا لیا ہے۔ وہ اپنی کج دلیوں کو فلسفوں کا نام دیتے ہیں۔ باطل نے کیا کیا فلسفہ آرائیاں کی ہیں مگر قیاس و گمان حق سے بے نیاز نہیں کر سکتے۔ یونان والے لاتعداد دیوی دیوتاؤں پر اعتقاد رکھتے تھے۔ یہی حال اہل ہند کا ہے۔ ہر مظہر فطرت کے لیے ان کے پاس ایک دیوی یا دیوتا ہے اور حاجت روائی کے لیے الگ الگ دیوتاؤں کو پوجا جاتا ہے۔ ایک فلسفہ کی رو سے کائنات میں مادہ کی مقدار محدود ہے اور فطرت اسی محدود مادے سے اشیاء کی تخلیق و صورت گری کرتی ہے۔ چنانچہ اشیاء اسی لیے مٹی میں مل جاتی ہیں اور

پھر مٹی میں نئی زندگی کا ظہور ہوتا ہے۔ مسلسل تخلیق کے راز کو نہ پاکر عقیدہ تناسخ ایجاد ہوا تو ہر تخلیق کو ایک سابقہ تخلیق کا اعادہ سمجھتا ہے۔ اس طرح روح مسلسل ایک قالب کے بعد دوسرا قالب اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ شجر و حجر کی پرستش تو کھلی ہوئی بت پرستی ہے۔ بت پرستی کی بہت سی شکلیں ہیں۔ یہ اعتقاد بھی اس کی ایک شکل ہے کہ زمانہ ہی قادر مطلق ہے۔ وہی جلاتا اور مارتا ہے۔ قرآن نے بالتصریح یہ فرمایا: وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ج وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ج إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝ (الجاثیہ ۲۴) "یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی ہماری زندگی ہے۔ یہیں ہمارا مرنا اور جینا ہے اور گردش ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔ درحقیقت ان کے پاس کوئی علم نہیں۔ یہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں کہتے ہیں"۔ اسی طرح اکابر رجال کو الوہی درجہ دینا جس کا ہمارے زمانے میں عام رواج ہے کہ باقتدار سیاسی رہنماؤں اور حاکموں کے مجسمے نصب کیے جاتے ہیں اور ان کی تصویریں گھروں دفتروں اور عوامی جگہوں پر آویزاں کی جاتی ہیں۔ یہ سب بت پرستی کی شکلیں ہیں۔ اسی طرح سائنس۔ آرٹ اور ایجادات کو وہ درجہ دینا جو خدا کو دینا چاہیے۔ انسان یہ سمجھنے لگا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کی بنا پر وہ خدا سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ اسے اس خبط میں مبتلا کرنے والے ایسے دانشور بھی ہیں جو دنیاوی زندگی کو مطمح نظر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ بلکہ ایک سیاسی جابر نظام ایسے دانشوروں کو اپنے نظام کی مداحی پر مامور کرتا ہے الحادی نقطۂ نظر چاہتا ہے کہ مجرد "زندگی" کے آگے تمام عقیدت و محبت کے جذبات پیش کیے جائیں۔ وہ زندگی کو الٰہ کا درجہ دے کر عبودیت اور آخرت کے تصورات کو مٹانا چاہتا ہے۔ حالانکہ دنیاوی زندگی سے اس کے غم اور زوال کو ہرگز جدا نہیں کرسکتے۔ ملحد شعراء دادبا دنیاوی زندگی کی حد سے زیادہ تعریف و توصیف کر کے یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ بس یہی دنیاوی زندگی سب کچھ ہے۔ زندگی بعد موت

ایک واہمہ ہے۔ وہ دنیاوی زندگی کا ترانہ اتنی اونچی لے سے گاتے ہیں کہ انسان کے باطن میں جو عالم آخرت کا ایک احساس ہے وہ دب کر رہ جائے۔ اس کے ساتھ ہی وہ شعر و نغمہ سے ان کی وہ سرمدی صفت جو کسی دوسرے عالم کا پتہ دیتی ہے چھین لے کر ان سے دنیاوی زندگی کی حمد و تسبیح کا کام لیتے ہیں۔ عوام کی بھلائی کی فکر کرنا۔ ان کے لیے کھانا کپڑا اور مکان مہیا کرنا ہر مہذب حکومت کا فرض ہے مگر "معیار زندگی" کو اپنی تمام مساعی کا ہدف بنا کر آخرت کو فراموش کر دینا بھی ایک طرح کی بت پرستی ہے۔ قرآن دنیاوی زندگی کی حقیقت یہ بیان کرتا ہے: اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ط (الحدید ۲۰)

"خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔"

سائنس غیر شخصی ہوتی اور اس کا طرز فکر معروضی ہوتا ہے۔ جب کہ شعر و ادب کی بنیاد جذبہ و احساس پر ہے۔ ادیب کے عقائد و رجحانات اس کے ادب کو رنگ دیتے ہیں۔ وہ اپنی پیش کش میں تنظیم فکر و خیالات سے بے نیاز نہیں ہوتا مگر وہ حقائق کا دماغ سے زیادہ قلب سے ادراک کرنا سکھاتا ہے۔ ادب و شعر یکسر معروضی نہیں ہو سکتے اور نہ ادب کو ادب رہنے دینے کے لیے یہ ضروری ہے۔ انسان ہمیشہ مظاہر کے پیچھے پوشیدہ حقیقت کی جستجو کرتا رہا ہے۔ روحِ انسانی مظہر و صورت سے کبھی مطمئن نہیں ہوتی۔ حکمت مظاہر و صور میں معنی کی تلاش ہے۔ روح انسانی "جو ہے" پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ "کیا ہونا چاہیے" کے پیچھے ہمیشہ سرگرداں رہتی ہے۔ اور اس کی یہ سعیٔ پیہم زندگی اور صحت کی علامت ہے۔ شعر و ادب میں علامات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ عالم خیال اور عالم روحانی کے کوائف و مشاہدات کا بیان اسی طرح ممکن ہے کہ ان دیکھی چیزوں کا بیان دیکھی ہوئی چیزوں کی

مدد سے کیا جائے۔ لطافتوں کے بیان کے لیے الفاظ کی کثافتوں سے دامن بچانا مشکل ہے۔ ایک طرح سے مظاہر فطرت اور زندگی خود علامات ہیں حقیقت ان کے پیچھے ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فریب والتباس ہیں۔ نہیں۔ وہ اتنے ہی حقیقی ہیں جتنے ہمارے شعور واحساس۔ ہماری زندگی، ہماری آرزوئیں، ہمارے خواب۔ البتہ وہ بھی فانی ہیں اور ہم بھی فانی۔ لیکن یہ حیاتِ گذراں۔ یہ عالم خارجی سے ہمارا ربط، ہماری فتح وشکست، ہماری خوشی اور ہمارے غم، یہ سب پل ہیں جن پر سے گذر کر ہم ایک حیاتِ ابدی سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔ یہ عظیم تر زندگی ہمارے باطن میں ہے اور وہ کامل طور پر ہماری ہو سکتی ہے جب ہم اس عارضی زندگی کے فرائض ان اصولوں کے مطابق انجام دیں جن کی طرف اشارہ ہماری فطرت کرتی ہے۔ اپنی نادانی میں انسان عالم فطرت کا جلال وجمال دیکھ کر مبہوت ہو گیا اور ذات خداوندی کی قدر کرنے سے قاصر رہا۔ وہ واہموں میں گرفتار ہو کر غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے معقولیت کو اس امر پر منحصر سمجھ لیا کہ جو آنکھوں سے دیکھا جائے وہی مانا جائے۔ مگر انسان کے حواس خمسہ کی محدودیت ظاہر ہے۔ قرآن کا ذات خداوندی کے متعلق ارشاد ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ "اس کی مانند کوئی شے نہیں"۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (الانعام ۱۰۲) "نگاہیں اُسے نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ وہ نہایت باریک بیں اور با خبر ہے"۔ چنانچہ اس دنیا میں دیدار خداوندی ناممکن ہے اور وہ عالمِ آخرت میں ان کو حاصل ہوگا جو اس امید میں دنیاوی زندگی بسر کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی صفات بے شمار مقامات پر بیان ہوئی ہیں۔ ہر جگہ ایک نئے مفہوم کو سمجھانے کے لیے اور زیادہ گہرے معنی کے ساتھ، قرآن کا ایک

خاص اسلوب ہے کہ کوئی بات کہنے کے بعد۔ کوئی حکم دینے، کوئی ممانعت کرنے، کوئی تاریخی واقعہ بیان کرنے یا تزکیہ و تربیت کی تعلیم دینے کے بعد ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا ذکر کرتا ہے۔ جیسے اللہ حکیم ہے۔ علیم ہے	خبیر ہے۔ سمیع ہے۔ بصیر ہے وغیرہ۔ دراصل اس سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ اس حکم، واقعہ، تعلیم یا موعظت سے اللہ کی کس خاص صفت کو تعلق ہے۔ اس خاص صفت پر غور و فکر کرنے سے معرفت و حکمت حاصل ہوتی ہے۔ صفات الٰہی قرآنی مضامین کی شاہ کلید کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر قرآن کے ان مقامات کو بہ نظر تامل دیکھیں جہاں روزہ، نماز جمعہ، حج یا ایسے ہی دوسرے عبادات کا حکم دیا گیا ہے تو دیکھیں گے کہ اُن کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کا ذکر کرو۔ چنانچہ اس طرح ہم ذکر کے وسیع تر معنی سے آشنا ہوتے ہیں۔ زبان سے ذکر ادنیٰ درجہ کا ذکر ہے۔ دل سے ذکر اعلیٰ درجہ کا ذکر ہے۔ مگر سب سے اعلیٰ وہ ذکر ہے جو انسان کو اپنی یاد سے فراموش کر کے ذکر حق کے ساتھ وابستہ و زندہ کر دیتا ہے۔ یہ ذکر عملاً ذاکر کے جملہ اعمال سے ظاہر ہوتا ہے۔ اوامر کی بجا آوری ہو یا نواہی سے اجتناب۔ گھر کے معاملات ہوں یا حکومت کے قوانین۔ معاش ہو یا اقتصاد۔ شعر ہو یا ادب۔ غرض زندگی کی ہر حالت اور کیفیت سے۔ یہ ذکر، یہ عشق، حیات جاودانی بخشنے کی قوت رکھتا ہے:

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق	ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

فلسفۂ وحدۃ الوجود نے، جس کے بانی شیخ محی الدین ابن العربی ہیں، اسلامی دنیا کے عوام و خواص پر زبردست اثر ڈالا۔ یہ فلسفہ پورے عالم اسلام کے صوفیاء میں رائج ہو گیا اور چودھویں صدی عیسوی میں تو اسلامی شاعری کا مقبول ترین موضوع رہا۔ جو لوگ حلول اور خدا کی تجسیم کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس طرح وہ خدا کے ساتھ زیادہ جذبے کے ساتھ محبت کر سکتے ہیں۔ اور اُن کی آخری منزل خدا سے وصل یا

اتحاد ہے۔ مگر قرآن صاف کہتا ہے کہ خدا خدا ہے، بندہ بندہ۔ بندہ خدا سے انتہائی قرب حاصل کرسکتا ہے مگر اس کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتا۔ اتحاد کا نظریہ کفر اور زندقہ ہے۔ یہ فلسفہ اخلاق کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور انفرادی عمل کی ذمہ داری بے معنی ٹھہرتی ہے۔ وحدۃ الوجود پر مبنی شعر و ادب نے جوشِ عمل کو سرد کیا اور انسانوں کے اندر انفعالیت پیدا کی۔ ان کو جھوٹے عزعومات میں مست رکھا۔ میدانِ عمل سے گریزاں انسانوں نے اس کے دامن میں پناہ لے کر میٹھے خواب دیکھے۔ قرآن خدا کی ایک ذات کا تصور دیتا ہے اور کہتا ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ ط (البقرہ ۱۶۵) "کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔"

فن انسان کی ان مساعی پر موقوف ہے جو وہ زندگی کے حقائق سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کرتا ہے۔ یہ بات قرین عقل نہیں کہ بڑے بڑے فنکاروں نے اپنی کوششوں کو صرف اس امر پر منحصر رکھا ہوگا کہ ان کے ذریعے تفریح طبع کا سامان بہم پہنچایا جائے یا ذہنی بازی گری یا لہو و لعب میسر آئے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ ان کے کارنامے نوع انسانی کی تھکتی ہارتی ہوئی قوتوں کو بحال کرنے اور تازگی اور قوت بخشنے کے لیے تھے۔ تمام فن کا مقصود حسن کا اظہار رہتا ہے اور وہ ترفع کے ذریعے یا ایک اعلیٰ نصب العین کی طرف رجوع کرنے سے درجۂ کمال کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ اگر انسان محسوسات ہی کے دائرے میں رہ جائے تو علم جہل آمیز ہو کر حجاب اکبر بن جاتا ہے۔ مکمل جمال و جلال کی حامل صرف ذات خداوندی ہے اور اسی کے جمال و جلال کی طلب اولیٰ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کا سرچشمہ مذہب ہے اور تمام علوم و فنون کا مقصود زندگی کے

تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ قرآن کی زبان میں وہ عبادت ہے۔ عبادت میں حُبِّ الٰہی بھی شامل ہے اور مخلوقِ خدا سے محبت بھی۔ اس طرح عشق ایک رہبر قوت ہے۔ وہ انسان کو میدانِ عمل میں سرگرم کرتا ہے۔ اس کو تخلیقی کاموں میں لگاتا ہے اور تسخیرِ فطرت کا سبق دیتا ہے۔ یہ عشق ماسوا اللہ کا ابطال کرتا اور حق کو غالب کرنے کی جدوجہد کرنا سکھاتا ہے۔ عشق کا حلقہ بگوش دُنیا ترک نہیں کرتا مگر دنیا پرستی سے اپنا دامن بچاتا ہے۔ وہ مال و متاعِ دنیوی کی ہوس نہیں رکھتا بلکہ آزادی اور بے نفسی پر جان دیتا ہے۔ اس کے دوسرے معاون اوصاف ہیں۔ صبر، توکل، نیاز، فقر، شجاعت، رواداری وغیرہ۔ وہ اوصاف جو دنیا پرستی کے مقابلے میں انسانی خودی کو آزادی اور پاکیزگی عطا کرنے والے ہیں۔

صحیح روحانی طرزِ زندگی ہر فرد بشر کے لیے ایک سا ہے۔ عملی زندگی میں تقسیم کار کے اصول رائج ہونے سے پہلے شاید عملی زندگی بھی سب انسانوں کے لیے یکساں تھی۔

قرآن کا ارشاد ہے: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (البقرہ ۲۱۳) "ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کجروی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور اُن کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے اور اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق نہیں بتایا گیا تھا۔ نہیں۔ اختلافات ان لوگوں نے کیا جنھیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انھوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے" اس امر کو شدت سے محسوس کرانے کی ضرورت ہے کہ دانشور اور عوام

دونوں ہی انسان ہیں اور ایک ہی خاندان کے افراد۔ مذہب ہی وہ میدان ہے جس میں
وہ ایک مشترک مقصد کے لیے سرگرم کار ہوسکتے ہیں۔ البتہ ادیب اور شاعر کے لیے ایک
داعیانہ جذبہ ضروری ہے جس سے اسے کارکردگی کی مقصدیت حاصل ہو۔ وہ اپنے قلم
کو حق کی امانت سمجھے اور قلم کے ذریعے عبادت کرے۔ تاریخ شعروادب گواہ ہے کہ
عظیم فن وہاں پھولتا پھلتا ہے جہاں مذہبی اور ثقافتی روایات موجود ہوں۔ جو ادب
اپنی روایات سے منحرف ہو وہ ترقی نہیں کرسکتا۔ اس کا عظیم ہونا تو خارج از بحث ہے۔
فنکار کے لیے دروں بینی ضروری ہے۔ وہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ یا فنکار کائنات اور
مخلوق سے کٹ کر اپنی خودی میں کھو جائے یا حقیقت مطلق سے براہ راست اپنے باطن
کی گہرائیوں میں ایک تعلق پیدا کرے۔ پہلی قسم کی دروں بینی منفی ہے اور علیحدگی
پسند اور دوسری مثبت ہے اور وجدانی۔ جو فنکار مذہب سے روشنی حاصل نہیں کرتے۔
وہ قرآن کے ارشاد بغیاً بینہم کے مصداق ہیں۔ وہ ہیں
اور ان کی کوششیں انتشار، فساد اور تباہی کا باعث ہیں۔ قرآن ان کی اور ان جیسے گمراہوں
کی مثال یوں بیان کرتا ہے: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ
مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ۝
صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ
وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ
الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ
كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ
لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (البقرہ
۲۰/۱۷) "ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب اس نے سارے
ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نور سلب کر لیا۔ اور انھیں اس حال میں چھوڑ دیا کر

تاریکیوں میں انھیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ بہرے ہیں۔ گونگے ہیں۔ اندھے ہیں۔ یہ اب نہ پلٹیں گے۔ یا پھر ان کی مثال یہ سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک اور چمک بھی ہے۔ یہ بجلی کے کڑاکے سُن کر اپنی جانوں کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور اللہ ان منکرینِ حق کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ چمک سے ان کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ گویا عنقریب بجلی ان کی بصارت اچک لے جائے گی۔ جب ذرا کچھ روشنی انھیں محسوس ہوتی ہے تو اس میں کچھ دُور چل لیتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت بالکل ہی سلب کر لیتا۔ یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے" یہ بیان تاریخ کے ہر دور میں ہر طبقے کی گمراہی پر صادق آتا ہے۔

تمام علوم و فنون اور مظاہر تہذیب کو باہم متحد رکھنے کے لیے ایک مرکزی نقطہ درکار ہے۔ وہ نقطہ اللہ ہے۔ اس نقطے پر انسانیت کا جمع ہونا حق ہے۔ یہی مرکزی نقطہ آج مغربی اقوام اور ان کی متبع قوموں نے کھو دیا ہے جس کے نتیجے میں وہ گھر، بازار، منڈی غرض ہر جگہ فساد کا شکار ہیں۔ اور انسانی زندگیاں تباہ ہو رہی ہیں۔ اب تو تباہی کا دائرہ بے اندازہ وسعت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ آج ہر دانشور، شاعر اور ادیب کا یہ فرض ہے کہ وہ حالات کی سنگینی کو محسوس کرے اور اعصابی ہیجانات پیدا کرنے والے مادہ پرستی پر مبنی ادب کی تباہ کاری کو بھی محسوس کرے۔ دنیا کی موجودہ حکومتیں بھی اپنے عوام کے حالات بگاڑنے کی ذمہ دار ہیں جنھوں نے عوامی ذرائع ابلاغ کو گھر گھر میں پہنچا دیا ہے تاکہ اس طرح حاکم شخصیتوں کو پرستش کی حد تک پہنچا دیا جائے۔ اور عوام پر ان کی گرفت زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو سکے۔ وہ ایسے ہی علمی، تہذیبی اور تعلیمی پروگرام پیش کرتے ہیں جن سے اُن کے مقاصد حاصل ہو سکیں۔ ایسے دانشور بھی ان کے کاموں میں معاون بنتے ہیں جنھیں آزادیٔ ضمیر و فکر سے زیادہ دنیاوی مفاد عزیز ہوتے ہیں۔

ادب وشعر کو بھی مرکزی نقطہ دینا چاہیے۔ آج کی دنیا میں بغیر ایمان ویقین کے قلم چلانا گمراہی انسانیت کی تباہی میں معاون بننا بھی ہے۔

مجذوب فرنگی نطشے نے کہا تھا "خدا کہاں ہے؟ میں بتاؤں۔ ہم نے اس کو مار ڈالا ہے۔ میں نے اور تم نے۔ ہم سب اس کے قاتل ہیں۔ لیکن ہم نے یہ کام کیا کیسے؟ کیسے ہم سمندر پی گئے؟ کس نے ہمیں اسفنج دیا جس سے ہم نے سارا افق مٹا دیا؟ آخر ہمارا کیا منشا تھا کہ ہم نے زمین کو اس کے سورج کی زنجیر سے علیحدہ کر دیا؟ اب وہ کدھر جا رہی ہے؟ ہم کدھر جا رہے ہیں؟ ہر سورج سے دور۔ کیا ہم مسلسل گرتے نہیں جا رہے ہیں؟ کبھی پیچھے، کبھی آگے، کبھی دائیں، کبھی بائیں۔ ہر طرف۔ کیا اب بھی ہم عرش وفرش کی بات کر سکتے ہیں؟ کیا اب ہم آوارہ گرد نہیں ہیں؟ راہ گم کردہ۔ ایک عدم کے سمندر میں غرقاب۔ کیا رات نہیں آگئی اور کیا ظلمت ہر آن بڑھتی نہیں جا رہی ہے؟ خدا مر گیا۔ اب وہ زندہ نہیں ہوگا۔ ہم نے اسے مار ڈالا۔ مگر ہمیں کون سی راحت ملی۔ یہ اتنا بڑا کام تھا کہ جس کے بوجھ تلے ہم دب گئے ہیں" (Existentialism by Paul Roubiczek, P. 40)

نطشے عیسائیت کی دشمنی میں اس قدر بڑھ گیا کہ اپنے تیز وتند افکار کو اس نے انتہا پسندی کی آخری حد تک پہنچا دیا۔ ورنہ اس کا دل صاف تھا۔ وہ ان اخلاقی اور روحانی قدروں کی تباہی کا ماتم کر رہا تھا جس کو بینتھم والوں نے بیدردی سے پامال کر دیا تھا۔ جب اس نے مندرجہ بالا سطور لکھیں ایک دوسری عالمی جنگ اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ ہو چکی ہے اور اب نیوکلیائی اسلحے اور دیگر لاتعداد تباہکار ہتھیار نوع انسانی کو کرۂ ارض سے مٹا ڈالنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ چاند پر انسان کے قدم جا چکے ہیں اور شاید اب "ستاروں کی جنگ" دور نہیں۔ آج ہمیشہ سے زیادہ قرآن کا یہ صاف حکم دنیا کو سنانے کی ضرورت ہے اور دانشوروں اور فنکاروں کو یہ سنانے کا فرض ادا کرنا ہے۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ط فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ط لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥ (روم ۳۰) "(اے نبی اور نبی کے پیرو) یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت جما دو۔ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی یہی بالکل راست اور درست دین ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"

نفقۂ مطلقہ

سپریم کورٹ کا فیصلہ اور چند وضاحتیں

(ڈاکٹر) محمود حسن الٰہ آبادی

سکریٹری بھیونڈی مسلم پرسنل لا بورڈ۔ بھیونڈی۔

نفقۂ مطلقہ کے سلسلہ میں سپریم کورٹ کے محمد احمد خاں بنام شاہ بانو بیگم (کرمنل اپیل نمبر ۱۰۳/۸۱ جو ۲۳ اپریل ۱۹۸۵ء کو فیصل ہوا ہے اور جو اے۔ آئی۔ آر سپریم کورٹ ۹۴۵ کے عنوان سے اے۔ آئی۔ آر جولائی ۱۹۸۵ء کے صفحات ۹۴۵ تا ۹۵۵ پر رپورٹ ہوا ہے) کے فیصلہ کی حمایت میں جو مضامین اب تک اخبارات میں شائع ہوئے ہیں وہ دراصل قلت علم وفکر اور منشائے قرآن سے افسوسناک بےخبری کا شاہکار ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ زیر بحث سے متعلق چند امور کی وضاحت کر دی جائے۔ ساتھ ہی ساتھ مناسب طریقہ سے سپریم کورٹ کے مندرجہ بالا فیصلہ کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔

۱۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ سپریم کا یہ فیصلہ جو سابق چیف جسٹس آف انڈیا مسٹر وائی۔ وی چندر چوڑ کی سربراہی میں چار مزید ججوں کے مشترک فیصلہ کی صورت میں صادر ہوا ہے کسی نص قرآنی کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ اس خواہش کی بنا پر ہے کہ ہندوستان میں بتدریج یکساں سول کوڈ نافذ کیا جائے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے

(۱) مسلم پرسنل لا بورڈ کی مداخلت intervention پر اظہار ناپسندیگی کیا ہے۔ (پیراگراف ۳۱)

(۲) دانیال لطیفی جیسے مشہور مبلغ نے تبدیلی پرسنل لا کی تحسین کی ہے (پیراگراف ۳۱)

(۳) ڈاکٹر طاہر محمود جو ادارہ ہمدرد کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اینڈ اسلامک ریسرچ سنٹر کے سربراہ کی حیثیت سے عرصہ سے مسلم پرسنل لا کی "مذمت"

فرمارہے ہیں کی تقریروں اور تحریروں کے حوالہ سے "اسلامی اتھارٹی" بھیا فرمائی ہے (پیراگراف ۳۳)

(۴) اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ حکومت دستور کے آرٹیکل ۴۴ کے نفاذ میں مسلمانوں کے چشم و ابرو کی طرف ملتفت کیوں ہے؟ اور زور دیا ہے کہ حکومت فوراً اس سلسلہ میں مثبت اقدام کرے (پیراگراف ۳۲ نیز پیراگراف ۲۸)

(۵) عدالتیں سماجی مصلح کا کردار ادا کرنے پر مجبور ہیں۔ اگرچہ یہ مشترکہ سول کوڈ کا بدل نہیں ہے۔ (پیراگراف ۳۲)

(۶) عدالت نے یہ فیصلہ اس امر کے باوجود دیا ہے کہ شاہ بانو (۶۵ سال) کا ایک جوان برسرکار بیٹا بھی موجود ہے جو فی الوقت اس کی کفالت کر رہا ہے اور واقعتاً وہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ (۱) ا کے تحت نہیں آتی جس میں یہ کہا گیا ہے کہ "اگر بیوی اپنی کفالت نہ کر سکے ———"

(ب) ایک اور فیصلہ (اسپشل لیو پٹیشن نمبر ۲۱۴۷/ ۸۵ جو ۱۰ر مئی ۸۵ء کو فیصل ہوا ہے اور جو سپریم کورٹ ۹۳۵۔ دہلی کے تحت اے۔ آئی۔ آر جولائی ۸۵ء کے صفحات ۹۳۵ تا ۹۴۱ پر رپورٹ ہوا ہے) میں مسٹر جسٹس چنپا ریڈی اور مسٹر جسٹس آر۔ بی مصرا (یہ دونوں جج صاحبان شاہ بانو کیس کی بنچ میں شامل تھے) نے شاہ بانو کیس پر ملک کے مسلمانوں کے ردِ عمل کا ذکر کرتے ہوئے پیراگراف ۷ میں یکساں شہری قانون بنانے کے لیے حکومت پر زور دیا ہے۔

(ج) سابق چیف جسٹس آف انڈیا مسٹر وائی۔ وی۔ چندر چد نے بمبئی میں ایک سوال کے جواب میں واضح طور سے ارشاد فرمایا ہے کہ انھیں ہر قسم کے قوانین کی تعبیر کا حق حاصل ہے۔ یہاں تک کہ انھیں تعبیر قرآن کا بھی حق حاصل ہے۔ ( )
اس قسم کے حق کا موصوف نے شاہ بانو کیس میں کس طرح استعمال فرمایا ہے اس پر تبصرہ

آگے آرہا ہے۔

پس جو لوگ نیک نیتی کے ساتھ اس فیصلہ کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت نہیں سمجھتے انھیں فوراً ہوش کے ناخن لینا چاہیے۔ اور اگر انھیں ہندوستان میں اپنا تشخص (Identity) عزیز ہے تو اس قسم کے فیصلوں پر بغلیں بجانے سے احتراز کرنا چاہیے۔

۲۔ مسلم پرسنل لا بورڈ | مسلم پرسنل لا بورڈ پر یہ اعتراض کرنا کہ سنہ ۱۹۷۳ء میں جب سے کہ نئے ضابطۂ فوجداری کا نفاذ ہوا ہے وہ کیا کر رہا تھا در اصل لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ انھیں ابتدا ہی سے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ میں "بیوی" کی تعریف میں "مطلقہ" کو شامل کرنے پر اعتراض تھا اور دفعہ ۱۲۷ کی ذیلی دفعہ (۳) ب کی شمولیت در اصل انھیں کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اگرچہ یہ ضابطہ فوجداری اپنی موجودہ شکل میں یعنی دفعہ ۱۲۵ اور دفعہ ۱۲۷ (۳) ب کی موجودگی کے باوجود عدالتوں کے چکر سے لوگوں کو محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا پھر بھی اگر شوہر نے مطلقہ کے تمام واجبات ادا کر دیے ہوں تو بالآخر اس کی گلو خلاصی ممکن تھی۔ لیکن سنہ ۱۹۷۹ء میں مسٹر جسٹس کرشنا آئر کے ایک فیصلہ نے (اے۔ آئی۔ آر۔ سپریم کورٹ ۳۶۲۔ کریمنل لا جرنل ۱۵۱/ سنہ ۱۹۷۹ء، صفحات ۳۶۲ تا ۳۶۶) ایک "نکتہ" پیدا کر کے (دفعہ ۱۲۷ (۳) ب کے نفاذ کو عملاً روک دیا تھا۔ تا آنکہ حالیہ فیصلہ نے وہ قانون ہی بالکل ختم کر کے رکھ دیا جو چودہ سو سالوں سے مسلمانوں میں متفق علیہ چلا آرہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کو عوامی تحریک چلانے کی ضرورت اب پیش آئی ہے۔

۳۔ معکوس استدلال | یہ بات کہ جب اسلام کا تعزیراتی قانون (Penal law) ہندوستان میں نافذ نہیں ہے تو پرسنل لا ہی پر اصرار کیوں ہے در اصل معکوس منطق کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا جواب مسٹر بانات والا کی زبان میں یہ ہے کہ "اگر کسی کل کا کوئی جزو فراہم نہیں کیا جا سکتا تو اس کا مطلب یہ کب ہوا کہ اس کا موجود جزو بھی ساقط کر دیا جائے۔

"If a part is not made available is does not

mean that the other should be Surrendered"

(لوک سبھا میں آرٹیکل ۴۴ کو ختم کرنے کے بل پر وزیر قانون مسٹر اشوک سین کی تقریر کا جواب۔
مسلم انڈیا انگریزی بابتہ مئی ۱۹۸۵ء۔ صفحہ ۲۱۹)

۴۔ اسلامی ممالک کی مثال | پاکستان میں دور ایوبی میں جو عائلی قوانین نافذ ہوئے اور جس کا حوالہ سپریم کورٹ نے بھی اپنے پیراگراف نمبر ۳۴ میں دیا ہے ان کے بارے میں عوام کو یہ بات معلوم رہنی چاہیے کہ یہ ایک آرڈیننس تھا جسے نٹری کے ایک صدر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے ملک پر بجبر" نافذ کیا تھا۔ اس کے باوجود اسے علماء اور عوام نے قبول نہیں کیا۔ پاکستان ہو یا کوئی دوسرا مسلم ملک۔ نہ وہاں اسلامی حکومت ہے نہ جمہوریت، اس قسم کی "اصلاحات" خواہ پاکستان میں ہوں یا تیونس میں۔ شام میں یا لیبیا میں۔ سب جبراً نافذ کی جاتی ہیں جو کسی بھی وقت نمائندہ یا عوامی جمہوری حکومت قائم ہوتے ہی کالعدم ہو سکتی ہیں۔ اس کے باوجود اکثر ان اصلاحات میں مسلمانوں کے کسی نہ کسی فقہی مذہب کے تفرد یا خصوص کی پیروی کی جاتی ہے مزید برآں وہاں کا کوئی غلط اقدام ہمارے لیے اس لیے بھی دلیل اور حجت نہیں بن سکتا کہ ان ممالک میں اکثریت کے ووٹوں کی قوت پر اقلیتوں پر بجبر کوئی قانون نافذ نہیں کیا جاتا جبکہ ہمارے یہاں ہندو اکثریت کی مرضی اور خواہش کو مسلم اقلیت پر مسلط کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

۵۔ اجتہاد کہاں ؟ | (۱) جہاں قرآن و سنت کے واضح احکام موجود ہوں وہاں اجتہاد نہیں ہوا کرتا۔ حکم ہے: یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا أَطِیعُوا اللَّهَ وَأَطِیعُوا الرَّسُولَ وَأُولِی الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِی شَیْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَیْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِیلًا (النساء۔۵۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی

طرف پھیر دو۔ اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

(ب) قرآن کے بعد سنتِ رسول کا درجہ ہے۔ اس کا واضح حکم آیت محولہ بالا میں موجود ہے۔ پس رسول کے حکم (یا عمل) کی موجودگی میں بھی اجتہاد نہیں ہو سکتا۔

نفقۂ مطلقہ تا عدّت کا حکم قرآن اور سنت دونوں سے ثابت ہے۔

(ج) جس طرح دستورِ ہند کی آرٹیکل ۱۳۱ (ا) ۱۴۴ (ا) اور ۱۴۷ نے صرف سپریم کورٹ کو قوانین کے جواز اور قوانین و دستور کی تعبیر کا حق دیا ہے۔ قرآن نے بھی فہم قرآن اور اجتہاد کے لیے صرف "اہل الذکر" کو اہل قرار دیا ہے۔ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ فَسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ۔

(النحل۔ ۴۳) اے نبی ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے۔ اہلِ ذکر سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔"

سپریم کورٹ کے ججوں کو یہ منصب اس لیے سونپا گیا ہے کہ ملک کی سب سے بڑی عدالت کے منصف ہونے کی بناء پر ان سے بجا طور سے توقع کی جاتی ہے کہ رائج الوقت قوانین پر ان کی حیثیت "ماہرانہ" ہوگی۔ اسلامی قانون کی تعبیر بھی ایسے اشخاص کے سپرد نہیں کی جاسکتی جو قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کی چودہ سو سالہ تاریخ کا "ماہرانہ" علم نہ رکھتے ہوں۔ پھر دستور کی آرٹیکل نمبر ۱۴۴ (ا) کے تحت جو دستوری بنچ تشکیل دی جاتی ہے اس کی حیثیت قانونِ ملکی کی تعبیر میں "اجماع" کے علاوہ اور کیا ہے؟ اور "اجماع" کا اسلامی ماخذ قانون میں قرآن اور سنت کے بعد تیسرا درجہ ہے۔ لیکن واضح رہے کہ اسلامی قانون کے "اجماع" کی حیثیت سپریم کورٹ کے دستوری بنچ (بحت آرٹیکل ۱۴۴ (ا) سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

(د) اسلامی قانون کے چوتھے ماخذ "قیاس" کے لیے "اجتہاد" شرط ہے لیکن

"مجتہد" کے لیے قرآن وسنت اور اجماع کا مکمل علم ہونا ضروری ہے جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل والی "حدیث اجتہاد" سے ثابت ہوتا ہے۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کی تائید میں جو مضامین آئے ہیں انھیں پڑھ کر عقل حیران ہے کہ کیا واقعی یہ مسئلہ اجتہادی تھا۔ اور بالفرض اگر اجتہادی تھا تو کیا واقعی سپریم کورٹ کے جج صاحبان جنھیں قرآن وسنت کی ہوا بھی نہیں لگی ہے اس کے اہل ہو گئے ہیں کہ ایک یا چند آیات کا انگریزی ترجمہ دیکھ کر "اجتہاد" کرنے بیٹھ جائیں۔

۶۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۴۲ کا مطلب | (۱) اگرچہ شریعت کسی شخص کو اپنی مطلقہ کو یکمشت کوئی بھی رقم (خواہ وہ عورت کے خرچ سے زیادہ ہو) کسی دوسرے کی حق تلفی کیے بغیر دینے سے نہیں روکتی لیکن اس بارے میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۴۱: وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ (اسی طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہے۔ انھیں بھی مناسب طور پر کچھ دے دلا کر رخصت کیا جائے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر) سے استدلال کرنا بالکل غلط ہے، کیونکہ "متاع" کے معنی کسی طور پر بھی اس رقم کے نہیں ہو سکتے جسے ماہ بماہ (یعنی استمراری طور سے Continuous) دینے کا حکم دیا گیا ہو (جیسا کہ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ میں اور اس سے پیشتر بھی اور فیصلوں میں کیا گیا ہے) اس سے یکمشت اتنی بڑی رقم کا دینا بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا جو کسی مطلقہ کی پوری زندگی کی کفالت کی ضامن ہو۔ (جیسا کہ جسٹس کرشنا آئر نے اپنے فیصلہ میں استدلال کے طور پر کیا ہے (ملاحظہ ہو اے۔ آئی۔ آر۔ سپریم کورٹ ۳۶۲/۹-۱۹۷۹ سی۔ ایل۔ جے (۱۵) صفحات ۳۶۲ تا ۳۶۶) کیونکہ متاع کے مفہوم میں استمرار (Continuation) ہے ہی نہیں۔ دراصل آیت کا صحیح مفہوم متعین ہوتا ہے۔ سورہ طلاق کی آیت نمبر ۶ سے ملاحظہ ہو: اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ۚ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ

أُجُورَهُنَّ، وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُم بِمَعْرُوفٍ - فَإِن تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ

(ان کو زمانۂ عدت میں) اسی جگہ رکھو جہاں تم رہتے ہو جیسی کچھ بھی جگہ تمھیں میسر ہو اور انھیں تنگ کرنے کے لیے ان کو نہ ستاؤ۔ اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر اس وقت تک خرچ کرتے رہو جب تک ان کا وضع حمل نہ ہو جائے پھر اگر وہ تمہارے لیے (بچے کو) دودھ پلائیں تو اس کی اُجرت انھیں دو۔ اور بھلے طریقے سے (اجرت کا معاملہ) باہمی گفت وشنید سے طے کر لو لیکن اگر تم نے (اجرت طے کرنے میں) ایک دوسرے کو تنگ کیا تو بچے کو کوئی اور عورت دودھ پلائے گی) اس آیت میں لفظ "متاع" بھی نہیں ہے بلکہ صاف "نفقہ" ہے۔ اب "قرآن فہمی" کا دعویٰ رکھنے والے حضرات (اور محترم جج صاحبان بھی) یہ بتلائیں کہ جب مطلقہ حاملہ کا نفقہ صرف وضع حمل تک ہے (جو کہ اس کی اصل عدت ہے) تو کس قانون عرف یا عقل کی رو سے غیر حاملہ مطلقہ کا نفقہ تا نکاح ثانی یا تا عمر رہ سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے اس قدر خلاف عقل قانون کی کون امید کر سکتا ہے؟

پھر قرآن کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ بات مخفی نہ رہنی چاہیے کہ قرآن نہ تو کسی پہاڑ پر نازل ہوا نہ ہی چودہ سو سالوں تک خلاء میں معلق رہا۔ اس طرح جب ہم مہبط وحی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی اور امت کے تعامل پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ در اصل آیت ۲: ۲۴۱، اُن مطلقہ عورتوں کے لیے ہے جن سے خلوت نہ ہوئی ہو اور اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ اس بے زبان عورت کو کم از کم کپڑوں کا ایک آدھ جوڑا (نصف مہر کے علاوہ) ضرور دے دیا جائے۔ ترتیب کلام ملاحظہ ہو آیات ۲۳۴، ۲۳۵ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو فوت ہو گئے ہوں، اور آیات ۲۳۶، ۲۳۷، اُن لوگوں کے بارے میں ہے جنھوں نے ہاتھ لگانے سے قبل منکوحہ کو طلاق دے دی ہو۔ اسی ترتیب سے آیت ۲۴۰ میں مذکورہ بیوہ کے لیے وصیت کی تلقین ہے۔ (یہ حکم وراثت کی آیات نازل ہونے کے بعد منسوخ ہو گیا) اور آیت ۲۴۱ میں ان مطلقات کے لیے تلقین ہے

جن کے ساتھ خلوت نہ ہوئی ہو۔

لیکن آیت کو اطلاقی معنوں میں مراد لینے کی صورت میں اس کا حصر لازمی طور سے آیت الطلاق۔ ۶ سے ہوگا۔ ورنہ قرآن میں (نعوذ باللہ) تعارض لازم آئے گا۔

(ب) یہ آیت آیتِ وصیت ۲: ۲۴۰ کے فوراً بعد آئی ہے اور محترم جج صاحبان نے پیراگراف ۷ امیں دونوں آیتوں کا ترجمہ نقل کیا ہے کسی قانون داں ذہن سے بجا طور سے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ آیت ۲: ۲۴۱ کو بھی وصیت ہی کے معنوں میں لے لیتا کیونکہ ایسا کرنا زیادہ آسان تھا۔ لیکن محترم جج صاحبان نے یہ قابلِ قدر نکتہ اس لیے اختیار نہیں فرمایا کہ اس سے ان کا مقصد فوت ہو جاتا تھا۔

(ج) "متاع" کے لفظ سے یہ غلط فہمی دراصل عبداللہ یوسف علی کے ترجمہ قرآن سے پیدا ہوئی ہے۔ جنھوں نے "متاع" کا ترجمہ "maintenance" (گذارہ یا نفقہ) کیا ہے۔ لیکن ہم حیران ہیں کہ محمد ظفر اللہ خاں، علامہ خادم رحمانی نوری، محمد مارماڈیوک پکتھال اور بری کے ترجموں، نیز بورڈ آف اسلامک پبلیکیشنز کے ترجمہ میں "نفقہ" کا لفظ مطلق نہیں استعمال کیا گیا۔ (پیراگراف ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ اور ۱۷) سید امین الحسن رضوی صاحب (intervener) کی تحریری بحث میں اسی نکتہ پر سب سے زیادہ زور دیا گیا تھا۔ (ہفت روزہ دعوت کا مسلم پرسنل لا نمبر) ان تمام ترجموں سے صرف نظر کرتے ہوئے (اور خاص طور سے آربری کے ترجمہ کو) صرف عبداللہ یوسف علی کے ترجمہ کو اختیار کرنا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہی ایک ترجمہ محترم عدالت کے لیے مفید مقصد تھا۔

۷۔ <u>مطلقہ کو صرف تا عدت نفقہ دینے کی علت اور مصلحتیں</u> (ا) اسلام میں تین قسم کے رشتوں کو تسلیم کیا گیا ہے۔ (۱) نسب۔ (۲) رضاعت۔ (۳) مصاہرت (ملاحظہ ہو النساء ۲۳)

لیکن ان میں سے صرف دو ہی انسانی خاندان کی بنیاد ہیں۔ نسب اور مصاہرت جیسا کہ سورہ فرقان کی آیت نمبر ۵۴ میں کہا گیا ہے۔ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ

نَسَباً وَ صِہراً (اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ الگ سلسلے چلائے)۔ لیکن رشتہ زوجین کے درمیان اسی وقت تک باقی رہتا ہے جب تک نکاح کا تعلق باقی رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کسی عورت کو طلاق دینے کے بعد اس کی حقیقی بہن، خالہ یا پھوپھی یا بھتیجی یا بھانجی سے نکاح کیا جا سکتا ہے (صرف اس کی ماں مستثنیٰ ہے کیونکہ عورت کے مدخولہ ہوتے ہی وہ ماں کے درجہ میں آجاتی ہے) پھر کیا ہمارے موجودہ مصلحین اور واضعین قانون) چاہتے ہیں کہ اگر ایک بہن کو طلاق دینے کے بعد کوئی شخص دوسری بہن سے نکاح کرے تو اس شخص کی کل آمدنی ایک ہی خاندان کی کفالت کی ذمہ دار ہو کر رہ جائے۔

(ب) دوسرا سبب مطلقہ کو صرف عدت کے زمانہ تک نفقہ دینے میں یہ ہے کہ اسلام ہر شخص کو عزت نفس کی تلقین کرتا ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلیٰ (صحیحین، ترمذی، نسائی) یعنی اوپر کا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے" اس طرح آپ نے دست سوال دراز کرنے کی ہمت شکنی فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ (المنافقون۔ ۸) "عزت تو اللہ کے لیے اس کے رسول کے لیے اور مومنین کے لیے ہے" جب کسی عورت کا اس کے شوہر سے رشتہ منقطع ہو گیا ہو تو آکاس بیل کی طرح اس کے ٹکڑوں پر پلنا عورت کی عزت نفس کے خلاف ہے۔ عدت کا زمانہ اس لیے مستثنیٰ ہے کہ اس عرصہ میں استبراء رحم کی خاطر اپنے سابقہ شوہر کے لیے عورت رکی رہتی ہے، اور دوسرا نکاح نہیں کر سکتی تاکہ اگر اسے حمل ہو تو اس کا نسب خلط ملط نہ ہونے پائے۔ اسی وجہ سے زمانۂ عدت میں واضح الفاظ میں نکاح کا پیغام دینا بھی ممنوع ہے۔

(ج) اللہ تبارک و تعالیٰ کسی بھی مرد یا عورت کا غیر شادی شدہ رہنا پسند نہیں کرتا چنانچہ ارشاد ہے: وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَاِمَآئِکُمْ اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِہِمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (النور۔ ۳۲)

"تم میں سے جو لوگ مجرد ہیں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کر دو۔ اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا۔ اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے"، اسی وجہ سے بیواؤں کے نکاح کی تلقین کی گئی ہے اور چار تک شادیوں کی اجازت دی گئی ہے: وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ (النساء ۳۰) "اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان میں سے دو دو تین تین اور چار چار سے نکاح کر لو"۔ شادی کرنے کی غرض و غایت یہ ہے کہ معاشرہ پاک و صاف رہے۔ کیونکہ زنا اسلام میں قابل تعزیر جرم (Panal ofence) ہے جس کی سزا غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑے (النور۔ ۲) اور شادی شدہ کے لیے رجم (مسلم، ابو داؤد، نسائی) ہے (اس لیے یہ اسلامی مزاج کے خلاف بات ہوتی اگر کسی مطلقہ کے لیے تا نکاح ثانی یا تا عمر نفقہ کا سابق شوہر کی طرف سے انتظام کر کے اسے بے فکر کر دیا جاتا)

(د) جب ہر مرد اور عورت کے لیے شادی کرنا ضروری ہوا تو مرد کے ساتھ یہ کس درجہ ناانصافی ہوگی اگر اسے نکاح ثانی کے بعد اپنی منکوحہ اور مطلقہ دونوں کا خرچ برداشت کرنا پڑے۔ اگر وہ دہرا خرچ نہ برداشت کر سکے تو بجائے نکاح ثانی کے کسی عورت سے ناجائز تعلق پیدا کر کے رجم کا سزاوار ہو جائے۔

(ہ) مذکورہ صورت میں اس مرد کی دوسری بیوی یعنی موجودہ منکوحہ کے حقوق بالراست متاثر ہوتے ہیں۔ کیا یہ دوسری عورت کے ساتھ ناانصافی نہیں۔ واضح رہے کہ طلاق کے اسباب کی اگر چھان بین کی جائے تو مرد ہی ہمیشہ لازماً قصوروار نہیں ٹھہرے گا۔ پھر آخر اسے اور اس کی دوسری بیوی کو کس جرم کی سزا دی جائے گی۔

(و) اگر مطلقہ کو قانوناً بعد عدت نفقہ دلایا جائے تو اس سے ان تمام لوگوں کے حقوق

مجروح ہوں گے جن کی کفالت از روئے شرع مرد کے اوپر واجب ہے۔ جس میں زوجین کی مشترک اولاد کے علاوہ اس مرد کی کوئی عزیزہ مطلقہ بھی ہوسکتی ہے۔ جسے اپنے سابق شوہر سے اسلیے نفقہ نہیں مل رہا ہے کہ وہ سپریم کورٹ تک جانے کی حیثیت نہیں رکھتی ——————

اور اگر مطلقہ کو ترکہ میں سے حصہ دلایا گیا تو اس سے وراثت کے تمام احکام مجروح و متاثر ہوں گے۔

(ز) ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے کہ مزاجی ناموافقت۔ بیوی کی زبان درازی یا کوئی اخلاقی عیب مثلاً نظر بازی وغیرہ کی وجہ سے شادی کے فوراً بعد یا سال دو سال کے بعد اسے طلاق ہو جاتی ہے تو ایسی صورت میں یہ نفقہ مطلقہ "تعزیر طلاق" کے بجائے "تعزیر نکاح" نہیں شمار ہوگی۔ ۹ واضح رہے کہ حرامکاری وہ عیب ہے جس کے سبب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی علیحدگی کی اجازت دی ہے۔

(ح) اللہ تعالیٰ انسانی مزاج کی کمزوریوں سے واقف ہے جس طرح جہیز کی لالچ میں ہندوستان میں معصوم نوشادی شدہ عورتوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ اسی طرح مغربی سوسائٹی میں ان کے بار سے سبکدوش ہونے کے لیے عورتوں کا قتل ایک معمول بن چکا ہے۔ اللہ کا کتنا بڑا فضل ہے کہ اسلامی معاشرہ اس لعنت قتل سے دونوں تعلقات سے پاک ہے۔ کیا ہمارے "مصلحین" چاہتے ہیں کہ اب بجائے طلاق دینے کے ان میں قتل کرنے کی وبا پھیل جائے۔

یا طلاق یافتہ ہونے کے بعد بھی اسے نفقہ دینے کی وجہ سے جن افراد کا مالی نقصان ہو رہا ہے وہ اسے قتل کرنے کے درپے ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابغض المباحات قرار دینے کے باوجود طلاق کی اجازت جو عطا فرمائی ہے تو اس میں بھی یہی مصلحت کارفرما ہے۔

(ط) قانون کی کتابوں میں مسلمانوں کی شادی کو عمرانی معاہدہ (Social contract) کہا گیا ہے (طیب جی مسلم لا صفحہ ۴۸ و ۵۰:- طاہر محمود۔ مسلم لا ان انڈیا۔ صفحہ ۴۷ ملا۔ محمڈن لا، از ایم ہدایت اللہ وارشد ہدایت اللہ صفحہ ۸۲) جو کچھ شرائط کے ساتھ تکمیل پاتا ہے۔ اور طرفین کو اس معاہدہ کو فسخ کرنے کا طلاق یا خلع کی صورت

میں اختیار ہوتا ہے (ہمیں قانون معاہدات (Law of Contract)
فریق ثانی کے کسی دوسرے اور معاہدہ کی تکمیل تک فریق اول کے اوپر "تاوان معاہدہ"
عائد کیا گیا ہو، اگر کوئی قانون داں (ماہرین) ہمیں اس سے مطلع فرمائیں تو
عنایت ہوگی۔

(ی) قانون اور اخلاق کے دائرے ہمیشہ الگ الگ ہوا کرتے ہیں۔) ہمیں بہت سے معاملات میں بعض کمزوروں کے ساتھ ہمدردی ہوتی ہے، لیکن عدالتیں ان کے حق میں فیصلے اس لیے نہیں دیا کرتیں کہ قانون اس کی تائید و حمایت نہیں کرتا کسی اخلاقی فضیلت کو قانون کے ذریعہ موکد نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام میں یتیموں کے حقوق کے بارے میں سخت تاکید ہے (النساء ۳۰) لیکن ان کے ساتھ سلوک کو مؤکد کرنے کے لیے یتیم لڑکیوں (یا ان کی ماؤں کے ساتھ) نکاح کی ترغیب دی گئی ہے جہاں تک کہ اسی سلسلہ میں چار تک شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ پڑوسیوں کا اسلام نے اتنا حق رکھا ہے کہ رسول اللہؐ کو گمان ہوا کہ انھیں ورثہ میں شریک کر دیا جائے گا۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد بن حنبل) لیکن قانوناً ایسا نہیں کیا گیا۔ یتیم پوتے کے لیے وصیت کی شکل میں گنجائش موجود ہے لیکن یتیمی، قرابت اور صلہ رحمی کی سہ گونہ اخلاقی قیود کے باوجود ان کے لیے کوئی قانون نہیں بنایا گیا۔ کیونکہ قانوناً وراثت اولاد کو منتقل ہوتی ہے۔ اگر اس کا دائرہ پوتوں تک وسیع کر دیا جائے تو اس سے بڑی قانونی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔

کیا کوئی قانون داں رائج الوقت قوانین میں کسی ایسی دفعہ کی نشاندہی کر سکتا ہے جو اخلاقی فضیلت کی بنیاد پر وضع کیا گیا ہو۔ جب ایسا نہیں ہے اور ہرگز ایسا نہیں ہے تو صرف مطلقہ ہی کے بارے میں اس کے سابق شوہر کو کیوں پابند کیا جائے؟

واقعہ یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا، یا اپنی شریعت کے ساتھ قلبی لگاؤ میں جس جذباتیت

کا طعنہ مسلم عوام کو دیا جا رہا ہے۔ اس سے زیادہ جذباتیت کا دخل اس غیر معقول استدلال اور قانون سازی میں ہے جو نفقۂ مطلقہ کے نام سے بالجبر مسلم عوام پر مسلط کیا جا رہا ہے۔

ان تمام معلوم اسباب (اور ان نامعلوم اسباب جن تک ہمارے ذہن و فکر کی رسائی نہیں ہو سکی ہے) کے ہوتے ہوئے اور اسلامی معاشرہ کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر کوئی شخص (خیر خواہی کی نیت ہی سے سہی) اسلامی قانون کو تبدیل کرنے کی بات کہتا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اسے اسلام کا نظام شریعت ہی ناپسند ہے تو اگر وہ مسلمان ہے تو اسے اپنے اسلام پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ کیونکہ اسلام کا مطالبہ ہے۔ اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّةً۔ (البقرہ۔ ۲۰۸) یعنی پورے پورے مسلمان بنو۔ یہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتَابِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ (البقرہ۔ ۸۵) کہ کتاب الٰہی کے کچھ حصوں پر ایمان لایا جائے اور کچھ سے انکار کیا جائے "یہودیوں کی خصلت" ہے۔

۸۔ الٹی منطق (الف) ماہرینِ قانون کی خدمت میں عرض ہے کہ کسی اسلامی مسئلہ میں رائے دینے سے قبل اسلامی قانون کا مزاج سمجھ لیا کریں۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک پورا نظامِ قانون ان کی نظر میں نہ ہو۔ اس سلسلہ میں ارتقاء قانون اسلامی کی چودہ سو سالہ تاریخ کو نظر انداز کرنا سب سے بڑی جہالت ہے۔

(ب) غیر مسلم مصلحین سے درخواست ہے کہ قاضی جی پہلے اپنے گھر کو دیکھ لیں شہر کے اندیشے میں دُبلا ہونے کی انھیں فرصت کبھی نہ ملے گی۔ مسلم معاشرہ باوجود اپنی تمام تر کمزوریوں کے الحمد للہ ابھی تک ان بہت سی خرابیوں سے محفوظ ہے جن میں ان کا معاشرہ گلے گلے ڈوبا ہوا ہے۔ یہ جہیز کی اموات، دیو داسیاں، ستی، انسانی قربانی، تانترک رسمیں اور "معاشقہ" کو پروان چڑھانے کے لیے (کثرت ازدواج کی ممانعت اور طلاق کی مشکل کے سبب سے) بیویوں کا قتل ایسے "حقائق" ہیں جنھیں چھوڑ کر اسلامی معاشرہ کے "سراب"

کے پیچھے دوڑنا ان کی سب سے بڑی حماقت اور جہالت ہے۔ دوسروں کی آنکھ کا تنکا چننے سے قبل کم از کم اپنی آنکھ کا شہتیر تو نکال لینا چاہیے۔

(ج) ہم حیران ہیں کہ معدودے چند مطلقہ مسلم عورتوں پر "مبینہ مظالم" کے خلاف تو یہ ارباب دانش، ارباب قلم اور صحافی ایک "رزمگاہ" سجائے ہوئے ہیں۔ لیکن ان ہزاروں بیواؤں اور اُن کے یتیم بچّوں کا کوئی درد اُن کے دل میں آج تک کیوں نہیں پیدا ہوا جو فرقہ وارانہ فسادات میں اکثریت کے ہاتھوں اور پولیس کی گولیوں کی وجہ سے اس حالتِ زار کو پہنچے ہیں۔ اگر اُن کے دل میں واقعتاً انسانیت کا کچھ احترام ہوتا اور مظلوموں کی دادرسی کی انہیں کوئی فکر ہوتی تو سب سے پہلے اُن یتیموں اور بیواؤں کی خبر لینی چاہیے تھی۔ اور حکومت کو مجبور کرنا چاہیے تھا کہ بیواؤں کے لیے تا حین حیات یا نکاحِ ثانی معقول وظیفہ اور یتیم لڑکیوں کی کفالت اور شادی اور یتیم لڑکوں کی کفالت اور روزگار کا انتظام کرے۔ احمد آباد، گجرات اور پورے ہندوستان کو جانے دیجیے۔ شہر بھیونڈی کے صرف انصاری باغ میں جس قدر بیوائیں اور یتیم بچے ہیں ان کی تعداد پورے ہندوستان کی ان نام نہاد "مبینہ اسلامی قانون" کی ستائی ہوئی عورتوں سے کہیں زیادہ ہے۔ آخر ان کے لیے اُن حضرات نے کیا کیا؟ ان کی فکر معکوس کا تو یہ حال ہے کہ جہاں انسانیت چیختی ہے وہاں یہ راگ الاپتے ہیں کہ سب کچھ بہتر ہے۔

(د) یک زوجگی (mono gamy.) کی وکالت کرنے والے اور اسلامی قانون کی کثرت ازدواج (Poly.gamy) پر واویلا کرنے والے ذرا اپنے معاشرے میں تکثیرِ اناث (Surplus women) کا بھی جائزہ لیں۔ اور اس سیلِ دبا کے آگے ابھی سے بند باندھنا شروع کردیں۔ عائلی زندگی میں قوانین کی سختی کی وجہ سے وہ جن امراض میں گرفتار ہوگئے ہیں ان کی بھی تشخیص فرمالیں۔ ان سب کا علاج انھیں اسلامی طریقِ ازدواج میں مل جائے گا۔ انشاء اللہ۔

۹۔ مغربی معاشرہ بنام اسلامی معاشرہ (الف) دراصل مغربی معاشرہ میں جس کی صدقی صد نقالی کی کوششیں ہندوستان میں ہو رہی ہیں۔ اور اسلامی معاشرہ میں، زمین و آسمان کا فرق ہے جس کی وجہ سے اسلامی نظام معاشرت کو نہ سمجھنے والے اس پر اعتراض کیا کرتے ہیں۔ مغرب میں جائداد اور خطابات وغیرہ صرف بڑی اولاد نرینہ کا حق ہیں۔ باقی تمام اولاد اور لڑکیاں کسب کے قابل ہوتے ہی معاشی استقلال کے چکر میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ شادی میں وہاں والدین کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہاں ترکہ کا جامع تصور ہونے کے بجائے وصیت (will) ضروری ہوا کرتی ہے۔ وصیت کی غیر موجودگی ہی میں وہاں عدالتیں الاقرب فالاقرب کی بنا پر فیصلے کیا کرتی ہیں۔ جب کہ اسلام میں بچوں کی پرورش اور ان کی شادی کا پورا بار والدین یا ولی (قریبی رشتہ داروں) پر ہوا کرتا ہے۔

(ب) مسیحی قانون (Christian Ecclesiastical law) میں سوائے زنا کے علیحدگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ (متی۔ باب ۵۔ ۳۱۔ ۳۲۔ باب ۱۹۔ ۳ تا ۹ مرقس باب ۱۰ تا ۱۲۔ یوقا باب ۱۶۔ ۱۸) (اور کیتھولک چرچ اس پر عامل بھی ہے) یہودیوں کے یہاں اگرچہ کتاب استثنا باب ۲۴ ا تا ۴ میں طلاق کی اجازت دی گئی ہے لیکن جیسا کہ H.S.Q. Henriques نے اپنے monograph میں تصریح کی ہے کہ یہودیوں نے بہت سے معاملات میں ملکی قانون سے ہم آہنگ ہونے کے لیے اپنے بہت سے مذہبی قوانین پر عمل ترک کر دیا تھا۔ (انسائیکلوپیڈیا آف ایلیجن اینڈ ایتھکس۔ جلد ۸ صفحہ ۴۶۱ مطبوعہ نیویارک ۱۹۶۰ء) یہ اپنے تمام معاملات زندگی میں (باستثنا چند) ملکی قوانین کی پیروی کرنے لگے تھے۔

اس لیے ذہنی پس منظر میں جب عائلی ضروریات کے تحت انتہائی ناقص قسم کا (اسلامی قانون کے برعکس) قانونی علیحدگی (judicial seperation)

کا قانون نافذ کیا گیا تو مرد کی جائداد سے مطلقہ کو گزارہ بھی دلوا دیا گیا۔

(ج) قرونِ وسطیٰ کی پوری مسیحیت نے عورتوں کو جس قعرِ مذلت میں ڈال رکھا تھا اس کے جواب میں انقلاب فرانس کے بعد ہی سے مساواتِ مرد و زن کی تحریک چل پڑی یہاں تک کہ اس تحریک نے مرد و زن کے حیاتیاتی فرق (Anatomical & physiological differences) تک کو نظر انداز کر دیا۔ جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ جلد بستم صفحہ ۷۶۴ مطبوعہ یو۔ ایس۔ اے ۱۹۶۵ء میں مل جائے گا) اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک مساوات (Equality of sexes) استحصال زن (Exploitation of women) پر منتج ہو گئی۔

(د) ویدک دھرم میں بھی رشتۂ نکاح ناقابل انقطاع تھا (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس جلد ۸ صفحہ ۴۵۳ نیویارک ۱۹۶۷ء) اسی وجہ سے یہاں مرنے کے بعد عورتیں ستی ہو جایا کرتی تھیں۔ انیسویں صدی میں راجہ رام موہن رائے کی کوششوں سے اس رسم کی بیخ کنی کے لیے قانون بنایا گیا تو دوسرے مسائل پیدا ہونے لگے۔ بیسویں صدی کے نصف تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان میں مغربی تہذیب نے گھر کر لیا اور آزادی کے بعد ہر چیز مغربی عینک سے دیکھی جانے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں مغربی تہذیب اپنی تمام تر ہو لناکیوں سمیت مستولی ہو گئی اور اس سے جو مسائل پیدا ہوئے ان کے ازالہ کے لیے وہی ترکیبیں اختیار کی جانے لگیں جو مغرب میں اختیار کی گئیں (تفصیل کا موقع نہیں ہے)

(ہ) مسلمان ایک غالب تہذیب کے امین ہونے کے باوجود انیسویں صدی کے اختتام تک روئے زمین پر ہر جگہ مغلوب ہو چکے تھے اس لیے ان کے اندر بھی افکار و اعمال کی بیماریوں نے جڑ پکڑ لی۔ لیکن مزید ستم ظریفی یہ ہوئی کہ آبِ حیات اپنے پاس موجود ہونے کے باوجود انھوں نے بھی مغربی فسطائیوں سے اپنا علاج کرانا شروع کر دیا جو اپنی غلط اور ناقص تشخیص و تجویز کی وجہ سے ایک عالم کو نہ صرف بیمار بلکہ قریب المرگ کر چکے تھے ہندوستان

میں یہ اور بہت سی رواجی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے، جن میں اکثریت مبتلا تھی لیکن چونکہ ان کے اندر ابھی اپنے مسلمان ہونے کا احساس باقی تھا۔ اس لیے اگرچہ ایک ایک کرکے وہ اپنے عناصر تشخص (Elements of identity) سے محروم ہوتے چلے جا رہے تھے لیکن ان میں اپنے مذہب اور شریعت کی طرف پلٹنے کی تڑپ باقی تھی۔ یہی سبب ہے کہ انھیں جب بھی اللہ کے نام پر بلایا جاتا ہے ان کی زبان سے فوراً لبیک کی صدا آتی ہے۔

۱۰۔ مطلقہ کیا کرے۔؟ مغربی معاشرہ بنام اسلامی معاشرہ کی یہ ہے وہ کشمکش جس کے درمیان یہ سوال پیش کیا گیا ہے کہ اگر مطلقہ کو تا نکاح ثانی نفقہ نہ دلوایا گیا تو وہ کیا کرے گی؟ یہ سوال لوگوں کے ذہنوں کو اس لیے پریشان کیے ہوئے ہے کہ معاشرہ کے عناصر کا مزاج ترکیبی ہی بدل گیا ہے۔ غیر اسلامی سوسائٹی میں اسلامی احکام فٹ کرنا گول خانے میں چوکور چیز کا فٹ کرنا ہے۔ یہ عدم توازن مغربی معاشرہ کی نقالی سے پیدا ہوا ہے جسے حالات ملکی نے اور کچھ ہماری عدالتوں کی "ہمدردانہ دلچسپی" نے اس موڑ تک پہنچا دیا ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ دوسرے معاشروں کے برخلاف اسلامی معاشرہ میں حقوق و واجبات ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ دراصل مطلقہ کا مستقبل صحیح مند اسلامی معاشرہ میں کبھی بھی دائمی فکر کا مستحق نہیں رہا۔ اور غریب خاندانوں میں آج بھی یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اسے "مسئلہ" تو بنایا ہی ان "خوش باش" عورتوں نے ہے جو سپریم کورٹ تک جانے کا "شاہی خرچ" برداشت کر سکتی ہیں۔ یا پھر ان کے اوپر کسی "ایجنسی" کا "دست شفقت" ہے، جو انھیں یہاں تک پہنچا دیتا ہے۔ اور اس کا مقصد "حب علی نہیں بلکہ بغض معاویہ" کے مثل شریعت اسلامیہ کے ساتھ "بغض" کا اظہار ہے۔

اس تمہید کے بعد ان اسباب کی نشاندہی کی جاتی ہے جن کی وجہ سے "نفقہ مطلقہ"

اسلامی شریعت یا اسلامی معاشرہ میں کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا اور آج بھی اس کا حل اسی کی طرف رجوع کرنے میں ہے۔

(الف) دراصل اسلام میں عقد ثانی (خواہ مطلقہ کی ہو یا بیوگان کی) کوئی معیوب بات ہی نہیں۔ اور ہمدردی کے نقطۂ نظر سے خصوصیت کے ساتھ بشرطِ عدل شریعت نے چار تک شادیاں کرنے کی اجازت دے رکھی ہے، جیساکہ سورۂ نور کی آیت نمبر ۳۲ اور سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ میں گذرچکا۔ مطلقہ یا بیوگان کے مسئلہ سے قطع نظر اگر ہم مسلمانوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی شرح پیدائش کے تناسب کا مطالعہ کریں تو یہ خوفناک حقیقت معاشرہ بھی افراطِ زن یا تکثیر اناث (Surplus women) کی شکل اختیار کرنے والا ہے۔ آخر اس مسئلہ کا حل بھی سوائے کثرت ازدواج کے اور کیا ہوگا۔؟

(ب) اسلام نے عورتوں کو جائداد اور مال رکھنے اور کمانے کی آزادی دے رکھی ہے۔ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء۔ ۳۲) جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے لیکن ان کا نفقہ شوہروں پر فرض ہے۔ الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۚ (النساء۔ ۳۳) مرد عورتوں پر قوام ہیں اس بناء پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اور اس بناء پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ اس طرح مسلم عورت مغربی عورت کے مقابلہ میں دہرے فائدے میں ہے۔ پھر اسے مہر کی صورت میں شوہر سے رقم ملتی ہے۔ دوسرے مذاہب کی عورتوں کے برخلاف مسلم عورت کو بحیثیت بیٹی کے باپ اور ماں سے بحیثیت ماں، یا دادی یا نانی کے بیٹے، بیٹی یا پوتے، پوتی یا نواسے، نواسی (حسبِ حالت) بحیثیت بیوی کے شوہر سے اور بحیثیت کلالہ کے بھائی یا بہن سے، بحیثیت خالہ کے بھانجے سے اور بحیثیت پھوپھی کے بھتیجے سے بھی (ذوی الارحام ہونے کی وجہ سے) وراثت ملتی ہے۔ اس کے علاوہ وصیت کی صورت میں بھی

انھیں کچھ نہ کچھ مل سکتا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اسلامی نظامِ وراثت رائج کیا جائے نہ کہ ایک غلطی کے لیے دوسری بہت سی غلطیوں کا ارتکاب کیا جائے۔ (جہیز کی رسم بد نے بھی لڑکیوں کو محروم الارث قرار دینے میں زبردست حصہ لیا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس رسم بد کی مکمل طور سے بیخ کنی کر دی جائے۔)

(ج) جن لوگوں سے عورتوں کو وراثت ملتی ہے۔ وہی اس کے قریب ترین عزیز ہیں، پھوپھا۔ چچا۔ ماموں۔ بھتیجے اور بھانجے بھی اس کے نزدیک رشتہ دار ہیں۔ جن لوگوں کو اس کی ولایت حاصل ہوتی ہے وہ قریب ترین اعزہ شمار ہوتے ہیں۔ یہی سب ایک دوسرے کے حسب قاعدہ میراث وراثت بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے شرعی طور سے یہی اس کے زیادہ مکلف ہیں کہ عورت کی کفالت کریں۔ آخر شادی سے قبل بھی تو یہی اس کے کفیل تھے۔ کیا طلاق کے بعد پرانے رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔؟

(د) کھانے پینے کے بارے میں ایک رہنما ہدایت (guiding Principle)

سورۂ نور کی آیت نمبر ۶۱ میں موجود ہے: لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَن تَأْكُلُوا مِن بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَّاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ خَالَاتِكُمْ أَوْ مَا مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيقِكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا کوئی حرج نہیں اگر کوئی اندھا یا لنگڑا یا مریض (کسی کے گھر کھالے) اور نہ تمہارے اوپر اس میں مضائقہ ہے کہ اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے، یا اپنی ماں نانی کے گھروں سے، یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے، یا اپنی بہنوں کے گھروں سے، یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے، یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے، یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا اُن کے گھروں سے جن کی کنجیاں تمہاری سپردگی میں ہوں، یا اپنے دوستوں کے گھروں سے۔

اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم لوگ مل کر کھاؤ

(د) عَنْ سُرَاقَةَ ابْنِ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی اَفْضَلِ الصَّدَقَةِ اِبْنَتُكَ مَرْدُوْدَةٌ اِلَیْكَ لَیْسَ لَهَا کَاسِبٌ غَیْرُكَ (ابن ماجہ)

سراقہ بن مالک کہتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں نہ بتاؤں تم کو بہترین صدقہ کیا ہے؟ اس بیٹی کی کفالت عظیم ترین صدقہ ہے جو تیرے پاس لوٹا دی گئی ہے اور تیرے سوا کوئی اسکے لئے کمانے والا نہیں ہے۔

یہ حدیث صاف طور سے باپ کو مطلقہ بیٹی کے نفقہ کا ذمہ دار قرار دے رہی ہے لیکن اگر باپ زندہ نہیں ہے یا کمانے کی ذمہ داری اس کے بیٹے کے اوپر آگئی ہے تو یہی حکم بیٹے کیطرف پلٹ آئے گا جیسا کہ ان تجمعوا بین الاختین (النساء۔ ۲۳) (دو بہنوں کا ایک ساتھ نکاح میں جمع کرنا حرام ہے) کے حکم میں خالہ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کو بھی شامل کر لیا گیا ہے

صدقہ کے لفظ سے کسی کو مغالطہ نہ ہو کہ یہ صرف اخلاقی فضیلت حاصل کرنے کے لئے تشویق (رغبت دلانا) ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اِذَا اَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلٰی اَهْلِهٖ یَحْتَسِبُهَا فَهُوَ لَهٗ صَدَقَةٌ (صحیحین) جب آدمی اپنی بیوی (بچوں اور زیر کفالت لوگوں) پر اجر آخرت کی نیت سے خرچ کرتا ہے تو یہ اس کے لئے صدقہ (یعنی اجر و انعام کا کام) بنتا ہے، اور سورۂ نساء کی آیت ۳۴ (جو اوپر نقل ہو چکی ہے) کی رو سے بیوی کی کفالت شوہر کے اوپر فرض ہے، یہاں تک کہ مرد کی قوامیت کے دو اسباب میں سے ایک سبب ہے۔

اس طرح اگر کسی نو عمر لڑکی کی طلاق ہو چکی ہو یا شادی ہی نہ ہوئی ہو یا نہ ہو رہی ہو تو اس کا نفقہ اس کے باپ یا بھائی یا ولی کے اوپر فرض ہوتا ہے۔

(و) اگر مطلقہ ضعیف العمر ہے تو ظاہر کر اس کے جوان بیٹے بھی ہونگے، ایسی صورت میں ان بیٹوں کے اوپر ماں کی کفالت فرض ہے کیونکہ علیحدگی کے بعد مرد سے مصاہرت کا تعلق

باقی نہیں رہا لیکن لڑکے سے نسبی تعلق ناقابل انقطاع ہے۔ اولاد کے اوپر والدین کا جو عظیم حق ہے اسے اللہ نے یوں بیان فرمایا ہے وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۔ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا (بنی اسرائیل ۲۳ تا ۲۵) تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اس کی، والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ "پروردگار ان پر رحم فرما، جس طرح انھوں نے رحمت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے لوگوں کیلئے درگذر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ۭ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۭ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۭ حَتّٰٓي اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ڕ اِنِّىْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (الاحقاف ۱۵) ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے، اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا، اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری طاقت کو پہونچ گیا اور چالیس سال کا ہو گیا تو اس نے کہا

"اے میرے رب مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تونے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابع فرمان (مسلم) بندوں میں سے ہوں۔

غور فرمایئے کہ یہ ساری خدمات (خصوصاً ضعیفی میں خدمت وغیرہ) کیا انھیں خالی پیٹ رکھکر کی جائیں گی، یہ بھی غور فرمایئے کہ آیت نمبر ۲ میں صاف صاف ماں کا حق زیادہ بتایا جارہا ہے، حدیث میں ہے کہ " والدین تمہاری جنت اور جہنم ہیں (ابن ماجہ) جنت ماں کے قدموں تلے ہے (مسند احمد) والدین کے حقوق کی احادیث بے شمار ہیں جن کا احاطہ کرنا یہاں ممکن نہیں ہے۔

(۱۰) اسلامی نظام حکومت میں کسی بھی معذور کی آخری ذمہ داری حکومت کی ہوتی ہے ہندوستان میں جہاں یہ نظام اس وقت نہ قائم ہے نہ مستقبل قریب میں بظاہر اسکے قائم ہونے کی امید ہے تمام مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ کم از کم زکوٰۃ اور بیت المال کا اجتماعی شرعی نظام قائم کریں، معذوروں کی کفالت کے علاوہ یہ بیت المال مسلمانوں کی اور بہت سی اجتماعی ضروریات کا کفیل ہو سکتا ہے۔

۱۱- شاہ بانو شاہ بانو کا کیس بالکل صاف ہے ان کے نفقہ کی ذمہ داری کلی طور پر ان کے جوان اور خود کفیل بیٹے کے اوپر ہے۔ اور انھیں کے ساتھ وہ رہ بھی رہی ہیں انھوں نے مسلم ستیہ شودھک منڈل کے جلسۂ خیر مقدم میں صاف فرمایا ہے کہ یہ کیس وہ صرف اس لئے لڑ رہی ہیں کہ عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہو (یعنی مسلم پرسنل لاختم ہو) ورنہ انھیں نفقہ کے سلسلہ میں کوئی پریشانی نہیں تھی اور ان کے برخوردار سعادت اطوار نے اس پر صاد کیا ہے (ملاحظہ ہو رپورٹ مسلم ستیہ شودھک منڈل پونا انڈین اکسپریس بمبئی ۲۰ر جولائی سنہ ۱۹۸۵ء) بس اب کیا فرماتے ہیں اس بیچاری ضعیفہ مطلقہ " کے بارے میں جسے

سڑک پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہے وہ لوگ جو "ازدیاد ہمدردی" میں دین و شریعت کی ساری حدیں عبور کر گئے تھے ۔

۱۲ ۔ محترم جج صاحبان متوجہ ہوں :- مغالطات کا پردہ چاک کرنے اور شکوک و شبہات کی دیوار ڈھا دینے کے بعد اب وقت آگیا ہے کہ نفس فیصلہ کے بارے میں عدالت کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے معزز جج صاحبان سے براہ راست خطاب کیا جائے ۔

(۱) معزز جج صاحبان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے پہلے ہی سے یہ یقین فرمالیا ہے کہ اسلام نے عورتوں کا درجہ گھٹا دیا ہے پھر اس سے یہ تاثر قبول کیا ہے کہ اسلامی قانون میں عورتوں کو انصاف نہیں مل سکتا، مزید یہ کہ اصلاح حال اور عورتوں کو فائدہ پہونچانے کے خیال سے اگر اسلامی قانون کی کوئی "فائدہ بخش" تعبیر ہو سکتی ہو تو یہ اسلام اور موجودہ حالات کے درمیان مفاہمت ہوگی ۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے رد و قبول کا ایک "ذاتی" معیار پیدا کر کے پورے کیس کو قابلِ اعتراض مواد سے پر کر دیا ہے بقول شاعر ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج　　　تا ثریا می رود دیوار کج

(ا) اس سلسلہ میں معزز جج صاحبان نے "منو" کا ایک مقولہ نقل کرنے کے بعد ایڈورڈ ولیم لین کی یہ رائے نقل کی ہے کہ اسلام کا مہلک ترین پوائنٹ عورت کے درجہ کو گھٹا دینا ہے (پیراگراف اوّل) ہم نے اب تک قرآن و حدیث اور تاریخ کے حوالوں سے جس قدر گفتگو کی ہے وہی یہ ثابت کرنے کے لئے بالکل کافی ہے کہ عورت (یعنی صنف نازک) کو مردوں کے استحصال سے بچانے اور معاشرہ کو اس کی "نسوانی صلاحیتوں" سے مستفید کرنے کے لئے اسلام نے جو قوانین دیئے ہیں نہ اب تک کے ارتقائی قانون کی تاریخ میں اسکی مثال ملتی ہے نہ ہی ابھی تک اس سے بہتر قانون کا تصور کیا جا سکتا ہے مردوں اور عورتوں کے درمیان حیاتیاتی فرق جسکی تفصیل کی طرف پیراگراف ۹ (ج) میں

اشارہ کیا جا چکا ہے، کو ذہن میں رکھتے ہوئے بتلایئے کہ کیا مغربی قانون اور معاشرہ نے عورت کو واقعی انصاف دیا ہے جس کے لئے ہم قدم قدم پر انکی نقالی کریں ہم اسلامی قانون کا ابتدائی یاد ور وحشت (Primitive age) کے قوانین معاشرت سے مقابلہ کرکے اسلام کی VALUE گھٹانا نہیں چاہئے۔ ہمارا تو چیلنج ہے کہ مغربی دنیا ایڈورڈ لین اور ہمارے معزز جج صاحبان ایک سیمینار کے اسٹیج سے موجودہ اور مستقبل میں متوقعہ قوانین معاشرت کی اسلامی قوانین پر برتری ثابت کریں، ابھی تو یہ مصلحین مقننین اور آئین سازان بہت سے نکات تک پہونچ بھی نہیں پائے ہیں جن کے بارے میں اسلام رہنمائی کرتا ہے، ہماری درخواست ہے کہ اور چیزوں کے ساتھ ہمارے محترم جج صاحبان کم ازکم اسلام کے نظام وراثت ہی کا مطالعہ فرمائیں، تو انھیں حیرت ہوگی، قانون وراثت میں اسلام نے قوانین کی کن تر رف نگاہوں کو ملحوظ رکھا ہے ہماری رائے میں کسی اسلامی مسئلہ میں اسلامی نقطہ نظر سے فیصلہ کرتے ہوئے ایک متعصب عیسائی جس کی اسلام دشمنی سے تمام پڑھا لکھا طبقہ واقف ہے کی تحریر پیش کرنے سے قبل محترم جج صاحبان کو یہ ضرور سوچنا چاہیے تھا کہ اس سے قانون اور انصاف کس حد تک مجروح ہو رہا ہے۔

(۲) محترم جج صاحبان نے دوسری زبردست ٹھوکر اسی پیراگراف اول میں کھائی ہے جب وہ غلط طور سے توقع کرتے ہیں کہ شاید پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ بات نہ فرمائی ہوگی کہ عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اگر تم اسے سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو وہ ٹوٹ جائے گی، اس لئے اپنی عورتوں سے نرمی کا سلوک کیا کرو، شاید محترم جج صاحبان عورت کی نفسیاتی کیفیات سے واقف نہیں ہیں جو ہر ماہ اپنے مخصوص ایام میں نیز زمانہ حمل اور ایام رضاعت میں کس قدر ذہنی انتشار کا شکار ہوجایا کرتی ہے مردوں کو یہ بات اسلئے کہی گئی ہے کہ وہ ان حالات میں اس کی ذہنی کیفیت کا لحاظ کرتے ہوئے اسے کوئی سزا نہ

دے بیٹھیں، چنانچہ اسی وجہ سے ان اوقات میں طلاق دینا بھی منع ہے (الطلاق - ۱)

ہم محترم جج صاحبان سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ یہ حدیث بالکل صحیح ہے اور اختلاف الفاظ کے ساتھ بخاری (کتاب النکاح) مسلم (کتاب الرضاع) دارمی (کتاب النکاح) اور مسند کی جلد پانچ میں صفحہ آٹھ پر موجود ہے، ہم حیران ہیں کہ آدمی جب کسی چیز کی مخالفت پر اتر آتا ہے تو اس سے کیسے معکوس استدلال سرزد ہونے لگتے ہیں،

(ب) محترم جج صاحبان نے "مہر کی اصطلاحی حیثیت" (Nomenclature) پر پیراگراف نمبر ۴۲ میں کافی بیش قیمت گفتگو فرمائی ہے یہ بحث قانون کی کتابوں اور تاریخ عمرانیت کی کتب (History of sociology) میں بھی مل جاتی ہے لیکن ہم حیران ہیں کہ یہ "نفقہ مطلقہ" جو ماہ بماہ واجب الادا ہے قانون معاہدات (Law of contract) کی کس "اصطلاح" کے تحت آتا ہے بالفاظ دیگر "مہر" وہ رقم ہے جو بطور (Respect) بیوی کو دی جاتی ہے نفعہ مطلقہ بعد عدت کیا چیز ہے جو مطلقہ کو دینے کا حکم دیا گیا ہے اسے بھی کوئی نام عطا فرما دیا جائے۔

(ج) جب ایسا فرض کر لیا گیا ہے کہ شادی ہوتے ہی عورت اپنے تمام پرانے صلبی رشتے منقطع کر لیتی ہے (بلکہ اسی کی یاد دہانی کرانے پر محترم جج صاحبان نے پیراگراف ۴۳ میں مسلم پرسنل لا بورڈ کو للکارا ہے۔ گویا کہ تعلقات نسب کا ایک لامحدود خلا ہے جس میں عورت "مصاہرت" کی صرف ایک نازک ڈورے سے لٹکی ہوئی ہے کیا حرج تھا اگر شادی سے قبل کا بھی والدین کا خرچ اس سابق شوہر سے دلوا دیا جاتا اور نہ بصورت دیگر ہم یہ دریافت کرنے میں حق بجانب ہونگے کہ یہ خلا کب سے پیدا ہوا؟

(د) اگر طلاق دینے کے فوراً بعد یا دوران تنقیح مقدمہ اگر شوہر کی موت ہوگئی ہوتی تو محترم جج صاحبان کیا فیصلہ دیتے ؟ یہی صورت حال اس وقت پیدا ہو سکتی ہے اگر بیوی (مطلقہ) سے پہلے شوہر (سابق) کا انتقال ہو جائے پھر محترم جج صاحبان اس کیلئے

کونسی صورت تجویز فرمائیں گے؟

کیا ایسی عورت کو ترکہ دلوایا جائے گا، گویا کہ اسلامی قانون وراثت میں بھی ترمیم ہو گی!!

(۵) محترم جج صاحبان نے ضابطہ فوجداری کی ۱۲۵ پر قانونی طور سے پیرگراف ۷ میں گفتگو فرمائی ہے لیکن یہ بات فاضل جج صاحبان کے علاوہ کسی اور قانون کے طالبعلم کی سمجھ میں نہیں آئی پیراگراف ۲۸ میں انھوں نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ شاید دفعہ ۱۲۷۔ (۳) ب کی شمولیت ( ) اسلئے عمل میں آئی کہ طلاق کے وقت مہر کا ادا کرنا بھی ضروری تھا یعنی (دفعہ ۱۲۷ (۳) ب کسی پرسنل لا کے تحت جن واجبات کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد مہر ہے، یہ بات نہ صرف واقعہ کے خلاف ہے کیونکہ مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے بیان تحریری میں دفعہ ۱۲۷ (۳) ب کی شمولیت کی پوری تاریخ اور اسمیں اپنے رول کا ذکر کیا ہے بلکہ اس ذیلی دفعہ کے الفاظ کے بھی خلاف ہے، محترم جج صاحبان نے مسٹر رام لو اس مردھا کی تقریر کا اقتباس (راجیہ سبھا ۱۸ دسمبر ۱۹۷۳ء) پیراگراف ۲۷ میں نقل فرمایا ہے اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ حکومت اور وزراء تمام کے تمام یکساں شہری قانون بنانے کی خواہش رکھتے ہیں لیکن مسٹر مردھا نے صاف کہا ہے کہ دفعہ ۱۲۵ کی موجودگی میں (دفعہ ۱۲۷ (۳) ب سے ایک استثنیٰ پیدا کرنا دراصل قدیم اور جدید کے درمیان ایک مفاہمت ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ حکومت چونکہ یکساں سول کوڈ بنانا ہی چاہتی ہے، اس لئے دفعہ ۱۲۷ (۳) ب سے مراد مہر لے لیا جائیگا بالکل غلط ہے یہ مفاہمت قدیم اور جدید کے درمیان نہ ہو گی بلکہ قانون اور محترم جج صاحبان کے درمیان ہو گی کیونکہ "مہر" ہر حال میں واجب الادا ہے اور عدم ادائیگی کی صورت میں عورت اسکے لئے دفعہ ۱۲۷ (۳) ب کی موجودگی کے بغیر بھی استغاثہ دائر کر سکتی ہے۔

(۶) یہ بات کہ دفعہ ۱۲۷ (۳) ب مسلم پرسنل لا کے تحت مسلمانوں کے لئے ایک

استفسار کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے قبل بعد عدت نفقہ کے جتنے کیسز فیصل ہوئے ہیں ان سے مسلم پرسنل لا میں صریحی مداخلت ہوتی ہے خود اسی کیس کی کاروائی سے ظاہر ہوتی ہے جس کا ذکر پیراگراف ۳ میں کیا گیا ہے۔ مسٹر جسٹس مرتضیٰ فضل علی اور مسٹر جسٹس اے وردراجن نے اس کیس کو ایک بڑی دستوری بنچ کے حوالہ کئے جانے کے دو اسباب بتائے ہیں

(۱) ۲ ایس سی، آر ۵۰۷/۱۹۷۹ اور ۳ ایس سی، آر ۱۲۷۰/۱۹۸۰ کیسز کا فیصلہ دو اسباب سے نظرِ ثانی کا محتاج ہے ایک تو یہ کہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۷ (۳) (ب) غیر مبہم الفاظ میں ان شوہروں پر سے دفعہ ۱۲۵ کے الفاظ کو ساقط کر دیتی ہیں جنہوں نے اپنی مطلقہ کو مہر اور عدت کا خرچ ادا کر دیا ہو۔

(۲) یہ فیصلے طلاق کے بنیادی تصور کے بھی خلاف ہیں اور ان سے مسلم پرسنل لا (شریعت) اپلیکشن ایکٹ کے سکشن ۲ کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

یہ امر واقعتاً محلِ تعجب ہے کہ مذکورہ دونوں ججوں کو جن کی رائے یقیناً اس کیس کے موجودہ فیصلے کے برخلاف ہوتی اس بنچ ہی میں شامل نہیں کیا گیا کیا واقعی ہمارے ان پانچوں ججوں کا جو اس بنچ میں شریک تھے یہ گمان ہے کہ سپریم کورٹ کے باقی تمام ججوں کی بھی اس کیس میں یہی رائے ہوتی؟ اگر ایسا نہیں ہے جیسا کہ مذکورہ دونوں ججوں کے اختلاف رائے سے ظاہر ہے تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس کیس کو قانون سے زیادہ ،،خواہش،، کی بنیاد پر فیصلہ کیا گیا ہے۔

یہ ہیں وہ سوالات جو شاہ بانو کیس کا فیصلہ پڑھ کر ذہن میں گذرتے ہیں اور ہم متمنی ہیں کہ جج صاحبان ان کے جوابات ضرور ارشاد فرمائیں۔

۱۳- شریعت کہاں ہے؟ اب ہم مسلم عوام کی خدمت میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ آج ہم تحفظ شریعت کا نعرہ لگا رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ شریعت ہے کہاں؟ شریعت کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: شرع لکم من الدین ما وصّیٰ

بہ نوحًا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ - کبر علی المشرکین ما تدعوھم الیہ - اللہ یجتبی الیہ من یشاء ویھدی الیہ من ینیب (الشوریٰ - ۱۳) اس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ (شریعت) مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمد) اب ہم نے تمہاری طرف وحی کے ذریعہ بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں، اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو یہی بات ان مشرکوں کو سخت ناگوار گزری ہے جس کی طرف (اے نبی) تم انھیں دعوت دے رہے ہو، اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اسکی طرف رجوع کرے - اس آیت میں لفظ «شرع» استعمال ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ «اقامتِ دین» ہی شریعت ہے اور تمام انبیاء کو یہی ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ دین کو قائم کریں - دین بھی کامل ہو چکا ہے جیسا کہ ارشاد ہے الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینًا (المائدہ - ۳) آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

معلوم ہوا کہ پوری امت مسلمہ اس کی مکلف ہے کہ پورا دین قائم کرے اور یہی شریعت ہے، شریعت ایکٹ کے نام سے جب تک ہم ایک نہایت محدود اور مختصر اسلامی زندگی پر قانع رہنے کی کوشش کریں گے تو قدم قدم پر طاغوتی قوتوں سے ٹکراؤ ہوگا اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ پورے دین کو قائم کرنے کی جد و جہد کی جائے۔

۱۴- علماء کرام کی خدمت میں

آج ہم افلاس علم و عمل کے جس درجہ تک پہونچ گئے ہیں اس کی ذمہ داری سے علماء بری نہیں ہو سکتے جو صرف علوم انبیاء کے امین ہیں بنی اسرائیل کے نبیوں سے مشابہ ہیں ہم نے اگر دین اور دنیا کی تفریق کردار کبھی ہوگا

شریعت کو دین سے الگ نہ کر دیا ہوتا تو آج اس حال کو نہ پہونچتے ہم جاہلیت سے مصالحت کی خاطر شرائع اسلامی کے ہر گرتے ہوئے ستون کو خاموشی سے دیکھتے رہے اور اس پر قانع ہوتے رہے ہمارے سامنے سورہ مائدہ کا ساتواں رکوع پورا کا پورا موجود رہا، لیکن ہم اپنے نفس کو مطمئن کرتے کہ یہ آیت بنی اسرائیل کے بارے میں ہے، اللہ تعالیٰ نے تہدید فرمائی: افحکم الجاھلیۃ یبغون (المائدہ - ۵۰) تو پھر کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، لیکن ہم نے اس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون - الظالمون - الفاسقون (المائدہ - ۴۴ - ۴۵ - ۴۷) جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں - ظالم ہیں - فاسق ہیں - ہم نے یہاں فیصلہ کا مفہوم سمجھنے اور سمجھانے میں "مصلحتِ وقت" سے کام لیا - ہندوستان میں قوانین اسلامی کا تیا پانچہ ہوتا رہا اور ہم "ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم" کے مصداق وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون (الذاریات ۵۶) کی یہی تفسیر کرتے رہے کہ انسان کی تخلیق کا مقصد (اطاعت نہیں) صرف عبادت ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید احمد شہیدؒ سے لیکر علمائے صادقپور تک کی ساری قربانیاں ہمارے لئے "اخلاف" کی ایک شاندار تاریخ بن کر رہ گئیں - اور ہم بھی تاریخ اپنی الماریوں میں سجا کر آج "اسلاف پرستی" کی یاد تازہ کر رہے ہیں - اگر ہم نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مشن کو زندہ رکھا ہوتا پچھلی ایک صدی میں جو تغیرات ہوئے ان پر قانع نہ ہو گئے ہوتے تو شاید آج اس کی نوبت نہ آتی کہ ہم اسلامی شریعت کی اس آخری کڑی (پرسنل لاء) کو دانتوں سے پکڑنے کی انتہا تک پہونچا دیئے جاتے، آج بھی جبکہ یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ اسلام میں سیاست بھی داخل ہے ہم لوگوں کو خبردار کیا کرتے ہیں کہ دین کی سیاسی تعبیروں سے ہوشیار رہیں اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو صاف علم اور ہر صاحب علم کو ذی فہم و ذی شعور بنائے آمین۔

۱۵- مسلم پرسنل لا بورڈ کے کرنے کا کام اس بات سے درست ہونے میں کوئی
شبہ نہیں کہ معاشرہ کا جو فساد ہے اور جس کی وجہ سے حکومت یا عدلیہ کو مسلم پرسنل لا میں
دخل اندازی کا موقع ملتا ہے اس کا سب سے بڑا سبب مسلم معاشرہ میں پھیلی ہوئی جہالت ہے
اس لئے مسلم پرسنل لا بورڈ کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کی آہ
وزاری سے حکومت کو باخبر رکھے، (یہ کام حکومت کی سی آئی ڈی بہت اچھی طرح کرتی ہے)
یا اس سے کچھ مطالبات کرتا رہے بلکہ اسے چند اور اقدامات بھی کرنے چاہئیں۔

(ا) لوگوں کو نکاح و طلاق، نفقہ، سکنی اور تحکیم وغیرہ کے مسائل سے روشناس
کرایا جائے۔ تحکیم اگرچہ طلاق واقع ہونے کے لئے شرط نہیں ہے۔ لیکن کے اختلافات
کا یہ وہ علاج ہے جو اللہ نے جو تجویز کیا ہے۔ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا
حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ
بَيْنَهُمَا (النساء - ۳۵) اور اگر کہیں تم لوگوں کو میاں بیوی کے تعلقات بگڑنے
کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں
میں سے مقرر کر دو۔ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت
کی صورت نکال دے گا، ہم نے اللہ کا بتایا ہوا یہ نسخۂ شفا اپنے معمولات میں سے
خارج کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سے تفریق بین الزوجین کا تناسب بڑھ گیا ہے جب
لوگوں کو عائلی قوانین کے مسائل سے کما حقہ، واقفیت ہو جائیگی، تو انشاء اللہ معاشرہ
کے مسائل بھی کم ہو جائیں گے،

(ب) اجتہادی اور اختلافی مسائل میں مختلف الفکر علماء کے درمیان مذاکرات
منعقد کر کے "تیسیر" (آسانی) کی راہ اختیار کی جائے۔ تین طلاقوں کے بارے میں
اہلحدیث اور اصحاب ظاہر کا ائمہ اربعہ سے اختلاف مشہور ہے۔ چند سال پہلے مفتی
عتیق الرحمٰن مرحوم کی صدارت میں اس مسئلہ پر احمد آباد میں ایک سیمینار منعقد ہوا تھا۔

جس کی وجہ سے علماء کے درمیان اختلاف فکر کم ہوا تھا۔

طلاق مکرہ (جبری طلاق) کے بارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ بہت معروف ہے۔ اسی طرح طلاق غضبان اور طلاق سکران (غصہ یا نشہ کی حالت میں دی گئی طلاق) امام تیمیہ علیہ الرحمہ جیسے اجل علماء کے نزدیک واقع نہیں ہوتی۔ "متشددین فی الفقہ" سے درخواست ہے کہ وہ کم از کم مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جیسی فکر اور جرأت پیدا کریں، جنھوں نے زوجہ مفقود الخبر کی مدت انتظار کے بارے میں عورتوں کو ارتداد سے بچانے کے لئے فقہ حنفی کو چھوڑ کر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر فتویٰ صادر فرمایا تھا، (ملاحظہ ہو ان کی کتاب الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ) اسی پر مجنون اور عنین (نامرد) کو قیاس کیا جا سکتا ہے، اجتہاد پر ایک ثواب اور صحیح اجتہاد پر دوہرے ثواب کا اجر ہمیں یہ نصیحت دیتا ہے کہ اختلافی مسائل میں سہل ترین راہ عموماً (اور فتنہ کے احتمال کی صورت میں خصوصاً) اختیار کی جانی چاہئے اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے "یُرِیدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیدُ بِکُمُ الْعُسْرَ" (البقرہ - ۱۸۵) اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے سختی کرنا نہیں چاہتا پس اگر اختلافی مسائل میں تیسیر کی راہ اختیار کی جائے تو یہ منشائے قرآنی کے عین مطابق ہوگا،

(ج) جگہ جگہ شرعی پنچائتیں قائم کرے جہاں ہر مرد و عورت کی جائز شکایات کا تدارک ہو، کیونکہ عدالتیں انھیں مقدمات کو فیصل کیا کرتی ہیں جو داد رسی کے لئے ان کے یہاں داخل کی جاتی ہیں اگر مسلمان ان عدالتوں میں جانا چھوڑ دیں تو وہ ہوا میں فیصلے صادر نہیں کر سکتیں۔ یہ تو دراصل ہم ہیں جو انھیں مداخلت فی الدین کی دعوت دیتے ہیں۔

(د) ایک مرکزی قانونی بورڈ تشکیل دے جس میں ایسے قانون دانوں کی خدمات حاصل کی جائیں جو دین کا بھی علم، فہم اور شعور رکھتے ہوں تاکہ وہ ہوا کے رخ کو دیکھتے رہیں

اور ہندوستان کے تمام قانون ساز اداروں میں جو بھی حل پیش ہوں ان کا مطالعہ پیش کرکے شریعت اسلامیہ کے نقطہ نظر سے ان کے انتقامات کی نشاندھی کریں گذشتہ سالوں میں پاس کیے گئے قوانین کا مطالعہ کرکے ان کے اسلامی شریعت سے متصادم دفعات کی بھی نشاندھی ضروری ہے۔

(د) ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ (۱) و قانونی طور سے بذات خود قابل اعتراض ہے جس پر آج تک مقننہ نے غور کیا نہ عدلیہ نے یہ دفعہ صرف ان عورتوں کو تحفظ دیتی ہے جن کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے آخر اس ”نفع“ سے وہ عورتیں کیوں فائدہ نہیں اٹھا سکتیں جو کسی طرح محنت و ملازمت کرکے اپنا خرچ چلاتی ہیں۔ یہ قانون کی عدم مساوات ( ) ہے جس کے تحت ہر مطلقہ کو برابر کے حقوق نہیں مل رہے ہیں دیکھئے اسلام نے عورتوں کو مال رکھنے اور کمانے کی آزادی دی ہے لیکن اس کا نفقہ شوہر کے اوپر فرض ہے۔ اس بارے میں کمانے والی یا نہ کمانے والی کے درمیان کوئی تفریق نہیں دراصل دنیا کو اس الہٰی قانون (قرآنی قانون) سے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے، ہماری رائے ہے کہ حکومت ہند اگر ہندوستان کی تمام عورتوں کے ساتھ انصاف کرنے میں واقعی مخلص ہے تو اسے سب سے پہلے یعنی مرحلہ اول میں اسلام کا پورا عائلی نظام اختیار کرلیا جائے اس کے بعد ہی اسے اس نظام کی برکتوں کا اندازہ ہوگا۔ لیکن یہ نظام ان تمام غیر اسلامی اسقامات سے صرف نظر کرتے ہوئے اختیار کرنا چاہیے جو موجودہ شریعت ایکٹ میں پائے جاتے ہیں۔ ورنہ

۱۶۔ مقننہ اور عدلیہ سے　(ب) مقننہ (　　) دستور کی آرٹیکلز ۲۵ تا ۳۰ متعلقہ بنیادی حقوق کی پابندی ہے گولک ناتھ کیس (سپریم کورٹ اے آئی آر سنہ ۱۹۶۷ء) نے بنیادی حقوق (　　) کو رہنما اصولوں (　　) پر فوقیت دی ہے دستور کی آرٹیکل نمبر ۴۴ مسلمانوں کے

تعلق سے ہمیشہ غلط فہمیاں پیدا کرتی رہی اس لئے اسے خارج از دستور ہی کر دینا مناسب ہوگا، لیکن اگر کچھ مصلحتیں اس میں مانع ہوں تو جس طرح آرٹیکل ۲۵ (۲) (ا) سے سکھوں کا کرپان رکھنا مستثنیٰ کر دیا گیا ہے اسی طرح آرٹیکل ۴۴ کے اثرات سے مسلمانوں کو مستثنیٰ کر دینا چاہئے۔ پرسنل لا میں اگر زوجین کے تعلق سے کوئی دشواری پیش آرہی ہو تو جو فریق اسلامی قانون کی بے حرمتی کا مرتکب ہو اس پر جرمانہ کرنے کا قانون بنایا جا سکتا ہے۔ جس کی رقم لازماً فریق ثانی کو دی جانی چاہئے جیسے کوئی مرد اگر اپنی بیوی کو غیر مشروع طلاق دے تو طلاق تو واقع ہو جائے گی لیکن اس طریقہ غیر مشروع کو سزا کے طور پر شوہر سے جو رقم وصول ہو اسے عدالتی خرچ میں محسوب کرنے کے بجائے مطلقہ کو دیا جائے۔ مزید یہ کہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۲۷ (۳) ب کو دفعہ ۱۲۵ کے ساتھ ختم کر دیا جائے یا دفعہ ۱۲۵ (ب) کی تشریح میں بیوی کی تعریف سے مطلقہ کو خارج کر دیا جائے۔

(ج) عدالتوں کا کام یہ ہے کہ جذبات سے مبرا ہو کر قانون کا انطباق کیا کریں اور یہ پندار چھوڑ دیں کہ وہ تمام قوانین بشمول قرآنی قوانین کی بھی تعبیر کا حق رکھتی ہیں سماجی مصلح بننا بھی ان کے فرائض میں داخل نہیں ہے بلکہ وہ رائج الوقت قوانین کو نافذ کرنے کا اختیار ہی رکھتی ہیں، مسلم مسائل کے تعلق سے ان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی شرعی پنچایت نے اگر کوئی فیصلہ کر دیا ہو اور قوت نافذہ نہ ہونے کی وجہ سے اسے نافذ کرنے سے وہ معذور ہو تو اس فیصلہ کو قانونی حیثیت دیں تاکہ اس کا نفاذ ہو جائے جیسا کہ عام پنچایتی فیصلوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ نیز کسی نافذ شدہ فیصلہ میں دخل اندازی نہ کریں جیسا کہ امارت شرعیہ بہار کے فیصلوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ان عدالتوں پر مسلمانوں کا اعتقاد پھر بحال ہو سکتا ہے۔ وکلمۃ اللہ ھی العلیا۰

عربی علوم و فنون

اور جدید یورپی ادب

شمیم الحسن امانت اللہ

علم و ادب کا سرمایہ رکھنے والی قومیں جہاں جاتی ہیں وہاں اپنے علمی اثرات، ثقافت کے نقوش اور تہذیب و تمدن کے ایسے روشن منارے چھوڑ جاتی ہیں جن سے دنیا ہمیشہ رہنمائی حاصل کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح عرب قوم اگر ایک طرف جرأت و شجاعت، ہمت و استقلال اور عزم و ثبات کی پیکر تھی تو دوسری طرف علوم و فنون، حکمت و معرفت اور تہذیب و تمدن کی عظیم دولت سے مالا مال بھی تھی، اس قوم نے جن جن مقامات پر فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑے وہاں علوم و فنون کے دریا بھی بہا دیئے۔ چنانچہ اپنی فتوحات کے دائرہ کو وسیع کرتے ہوئے عربوں نے جب اندلس کو فتح کیا تو اسے عربی ثقافت اور علوم و فنون کا مرکز بنا دیا۔ اور پھر یورپ نے دل کھول کر اس گہوارۂ علم سے استفادہ کیا۔ یورپ قرونِ وسطیٰ میں نہ صرف فلسفہ و ادب بلکہ دیگر تمام علوم و فنون میں عربوں سے بہت پیچھے تھا۔ لیکن عربوں کے انھیں ذخیروں سے استفادہ کرکے آج وہ اپنا سر فلسفہ اور ادب کے میدان میں بھی بلند کر رہا ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر اب اسے علم و فضل کے میدان میں دنیا کی قیادت کا دعویٰ بھی ہو گیا ہے۔ حالانکہ عمیق مطالعہ کرنے والوں اور اصحاب علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ انکے بیشتر علوم عربوں ہی کے مرہون منت ہیں، طب ہو یا حکمت، فلسفہ ہو یا منطق، کیمیاوی علوم ہوں یا ریاضیات کے لاینحل مسائل، موسیقی ہو یا فن تعمیر، صنعت ہو یا تجارت، الغرض تمام علوم و فنون عربوں ہی کے اثرات سے متاثر ہیں۔

اہلِ یورپ کو قدیم یونانی فلسفہ سے روشناس کرانے میں عربوں ہی کے علم و فضل کو دخل ہے۔

عربی کتب فلسفہ کے لاطینی زبان میں منتقل ہونے سے پہلے یورپ یونانی فلسفہ سے بالکل ناآشنا تھا، اسی طرح یورپ کو مدنی علوم سے متعارف کرانے میں اندلس اور صقلیہ کے علماء کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے، صقلیہ نے جو عربوں کے ۱۳۰ سالہ دورِ حکومت میں علم وفضل کا گہوارہ رہا ہے اپنے علوم وفنون کی بارش سے پورے یورپ کو خوب خوب سیراب کیا اور یہ اسی گلشنِ علم وادب کی خوشبو ہے جس نے آج تک یورپ کی فضا کو معطر کر رکھا ہے۔

خود نورمانڈی بادشاہوں نے عرب علماء اور دوسرے مترجمین کی مدد سے بہت سی عربی کتابوں کا لاطینی زبانوں میں ترجمہ کروایا، چنانچہ روجر ثانی نے ۱۱۰۱ء میں مشہور عرب جغرافی ابو عبداللہ محمد بن الادریسی کو پورے آباد علاقوں کا عربی زبان میں جغرافیہ تیار کرنے کا کام سپرد کیا تھا،

اندلس اور صقلیہ کے علاوہ صلیبی جنگوں کے زمانے میں یورپ کو مصر، سوریا اور فلسطین نے بھی تہذیب وتمدن کے بہت سے خزانے دیئے ہیں۔

یورپ عربی حضارت اور ثقافت سے جسقدر متاثر ہوا ہے اس کا موجودہ دور میں پوری طرح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس کے کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ یورپ کی تاریخ میں قرون وسطیٰ کا زمانہ ابہام وغموض کی تاریکی میں اس طرح گھرا ہوا ہے کہ اصل حقیقت کا پتہ لگانا ہی مشکل ہوگیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اندلس میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک طویل جنگ کے بعد جب اسلامی حکومت کا خاتمہ ہوا تو وہاں کی فضا عربوں کے خلاف نفرت وتعصب اور بغض وحسد کے زہر سے پوری طرح مسموم ہو چکی تھی، اور جس نے عربی اثرات کو نیست ونابود کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

اور تیسری وجہ جو نہایت اہم اور ناقابل تردید ہے وہ یہ کہ یورپ نے ہمیشہ دوسروں سے استفادہ کے بعد انھیں فراموش کردیا ہے یورپ کے تمام مورخین پر آج بھی یہ تنگ نظری غالب ہے

فلسفہ اور دیگر علوم کے علاوہ عربی شاعری اور نثر نگاری نے بھی یورپ کے ادب پر گہرا اثر

چھوڑا ہے۔ جسے ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل یا برہان کی ضرورت نہیں۔ خود عربی ادب اور لٹریچر کا لاطینی زبانوں میں منتقل کیا جانا اس کا ایک بیّن ثبوت ہے اسی لئے ابوالعلاء المعرّی کی بعض مؤلفات اور ڈانٹے کے بہت سے اشعار میں کافی حد تک مشابہت پائی جاتی ہے۔ اور اسی طرح معرّی کی کتاب رسالۃ الغفران اور کومیڈیا مقدسہ میں بھی بہت سی جگہوں پر ہم خیالی پائی جاتی ہے مثال کے طور پر اطالوی شاعر ڈانٹے، جہنم میں اپنے گشت کے دوران چند لاطینی شعراء سے ملاقات کرتا ہے۔ جو حضرت مسیح کی ولادت سے پہلے ہی مر چکے تھے، ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ ابوالعلاء المعرّی امرؤ القیس، نابغہ اور دیگر جاہلی شعراء سے جہنم میں ملاقات کرتا ہے

اسی طرح یورپ کی شاعری میں اگر کہیں قافیہ کا استعمال نظر آتا ہے تو یہ بھی عربی ہی شاعری کی نقل ہے کیونکہ قدیم یورپی شاعری اور خصوصاً یونانی اور لاطینی زبانوں کی شاعری میں قافیہ بندی اور وزن کا برقرار رکھنا سرے سے ہی مفقود ہے، عربی شاعری کی اصناف میں نظموں، قومی ترانوں، قصوں اور گانوں نے اپنے اثرات اور بھی زیادہ چھوڑے ہیں کیونکہ اندلس کے اہلِ طرب یورپ کے شہروں میں جاتے اور موسیقی کے آلات ان کے ساتھ ہوتے جہاں جاتے محفلیں جم جاتیں اور ہر طرف ان کے گانوں کا چرچا ہو جاتا۔ ان کی موسیقی کی دھوم مچ جاتی، زبان کی شیرینی، چنگ و رباب کا دھن لوگوں کو اپنا سر دھننے پر مجبور کر دیتے اسکے نتیجے میں گیارہویں اور بارہویں صدی میں یورپ میں پیدا ہونے والے شعراء میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اشعار کو گا کر پڑھا کرتا تھا، اور ان کے پڑھنے کا طریقہ عربوں کے لہجے سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ ان شعراء کو یورپ میں شعراء طروبادور کہا جاتا تھا لفظ طروبادور کے بارے میں مستشرق ریبرا کا خیال ہے کہ یہ لفظ عربی کے لفظ طرب سے مشتق ہے یہ شعراء زیادہ تر ایسے اشعار کہتے تھے جو معنیٰ کے لحاظ سے نسیب سے متعلق ہوتے ہیں جو عربی شاعری کی اہم صنف ہے شعراء طروبادور کے اشعار اور اوزان و قوافی اندلس کے قومی ترانوں سے بہت حد تک مشابہ ہوتے تھے جو ایک عرصہ تک اسپین میں معروف رہے۔

قرون وسطیٰ میں یورپ میں بہت سے ایسے قصے بھی لکھے گئے، جو بلاشبہ عربی قصوں سے ماخوذ تھے چنانچہ عشق و محبت کی داستانوں میں اہل یورپ نے عروہ بن حزام، عفراء، قیس بن ذریح اور لبنیٰ وغیرہ کا انتخاب کر کے عربی ناول نگاری سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

عربی ناول نگاری نے فرانسیسی ادب کو خاص طور سے متاثر کیا ہے۔ اس لئے کہ اس زمانے میں فرانسیسی زبان میں بہت سے ایسے قصے لکھے گئے جن میں عربی قصہ نگاری کا رنگ پوری طرح غالب تھا۔ مثال کے طور پر قصہ اوقاسین اور نیکولیت کو لیجئے جہاں عربی رنگ پوری طرح واضح ہے۔ نیز اس میں ہیرو کا نام محض تھوڑی سی تحریف کے بعد قاسم کے بجائے اوقاسین رکھدیا گیا ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں عربی زبان کے جن قصوں کا ترجمہ لاطینی زبانوں میں ہوا ان میں کلیلہ ودمنہ خاص طور سے قابل ذکر ہے، جس کی وجہ سے یہ قصے سارے یورپ میں مشہور ہو گئے اور اور حقیقت تو یہ ہے کہ کتاب کلیلہ ودمنہ ہی نے پورے یورپ میں حیوانوں اور چڑیوں سے متعلق ادب کی بنیاد ڈالی۔

اسی طرح ۱۷۰۴ء میں جب پہلی بار الف لیلہ ولیلہ کا ترجمہ لاطینی زبانوں میں شائع ہوا تو نہایت سرعت سے سارے یورپ میں پھیل گیا اور قارئین کے حلقے میں اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے بعد متعدد مشرقی زبانوں سے بہت سے قصوں کے ترجمے یورپی زبانوں میں کئے گئے حتی کہ یورپ کے بہت سے ادباء نے مشرقی اور عربی اسلوب کو اپنی ناولوں میں جگہ دینا شروع کر دیا، چنانچہ مستشرق (جب) نے اپنی کتاب "تراث الاسلام" میں لکھا ہے کہ "میں یہ کہنے میں قطعی عار محسوس نہیں کرتا کہ اگر الف لیلہ ولیلہ نہ ہوتی تو ڈانیل ڈیفو اپنا شہرہ آفاق ناول رو بنسن کروسو، ہرگز وجود میں نہیں لاسکتا تھا، اور نہ ہی سویفت کا سفرنامہ گلیور ہی اس قدر مقبول ہوتا"۔۔۔۔

قسط ۲

جسٹس بشیر احمد صاحب سعید رح

حیات، شخصیت اور سیرت

از: محمد یوسف کوکن، پرنسپل، جمالیہ عربی کالج مدراس ۱۲

آپ نے ۱۹۴۷ء میں سیلون کا سفر کیا، اور وہاں سے ملایا گئے پھر ۱۹۴۸ء میں برما کا سفر کیا اور آٹھ لاکھ روپیہ نیو کالج کے لئے جمع کیا پھر ۱۹۵۶ء میں مشرقی آفریقہ گئے اور مختلف جگہوں کا دورہ کیا اور سدرن انڈیا ایجوکیشن ٹرسٹ اور اس کے تحت بنائے ہوئے عورتوں کے کالج کے لئے بہت سارو پیہ جمع کیا، پھر ۱۹۵۹ء میں قاہرہ تشریف لے گئے اور وہاں کے وزیرِ تعلیم اور وزیرِ اوقاف اور مفتی امیر الحسینی سے ملاقات کی پھر انور السادات سے بھی ملے، اور شیخ الازہر سے بھی ملاقات کی، سفیر ہند آر۔ کے نہرو نے وزیر داخلہ ہند کو تار بھیجا کہ یہاں بھی روپیہ وصول کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر وہ قاہرہ سے یروشلم، بیروت دمشق، بغداد، بصرہ گئے، یروشلم میں بہت سے مقدس مقدمات دیکھے، عراق میں کربلا کی زیارت کی اور شیخ عبد القادر جیلانی کے مزار پر بھی حاضر ہوئے، بصرہ سے کویت بحرین اور قطر کے مختلف شیوخ سے ملاقات کی اور ہر جگہ عورتوں کی کالج کے لئے روپیہ وصول کیا، قطر میں شاہی مہمان رہے شاہ قطر نے ایک لاکھ روپیہ عنایت کیا، بیروت سے کراچی ہوتے ہوئے ۲ر فروری ۱۹۵۶ء کو مدراس پہونچے، مئی جون ۱۹۵۹ء میں فریضۂ حج ادا کیا، شاہ فیصل سے ملاقات کی اور انھیں توجہ دلائی کہ ہندوستانی عربی طلبہ کو سعودی مملکت کی یونیورسٹیوں میں مزید عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی گنجائش پیدا کی جائے شاہ فیصل نے کہا ہم خود اس کا انتظام کریں گے۔

اس سال کے اواخر میں انھوں نے ملیشیا کا دورہ کیا اور بہت سا روپیہ جمع کیا ۱۹۶۰ء میں وہ امریکہ گئے اور مختلف جگہوں کا دورہ کیا اور مختلف حضرات سے ملے، مونٹریال میں مشہور مستشرق پروفیسر کانٹ ویل اسمتھ سے ملے، اور اس کے منعقد کئے ہوئے مشاعرے میں شرکت کی، انھوں نے وہ نظمیں سنائیں جو انھیں یاد تھیں، انھوں نے بفلو یونیورسٹی دیکھی اور نیاگرا آبشار بھی دیکھا کارنل یونیورسٹی میں ہوم سائنس ڈپارٹمنٹ دیکھا نیویارک میں یو، این، او اسمبلی کے ایک اجلاس میں حاضر ہوئے، مسٹر شیرمان کوپر سابق سفیر امریکہ دہلی سے بھی ملاقات کی، واشنگٹن میں سابق سفیر امریکہ دہلی مسٹر چسٹر بوس سے ملاقات کی،

امریکہ سے وہ لندن آئے اور ووکنگ مسجد دیکھی اور نماز پڑھی لندن یونیورسٹی کے رجسٹرار سے تعلیمی معاملات پر گفتگو کی، لندن سے پیارس اور برلن ہوئے ہوئے جنیوا آئے، فادر جیرم ڈی سوزا سابق پرنسپل لیولا کالج مدراس کے توسط سے پوپ سے ملاقات کی، وہاں سے بیروت پہونچے اور وہاں سے فروری ۱۹۶۱ء میں کراچی آئے پھر ۱۵ فروری کو بمبئی پہونچے، پھر مدراس آئے۔

مارچ اپریل ۱۹۷۱ء کو ماریشیس گئے، اور مختلف لوگوں سے ملے، انھوں نے وزیر اعظم مسٹر رام غلام سے بھی ملاقات کی،

نومبر ۱۹۷۲ء میں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کی دعوت پر مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ کی آٹھویں کانفرنس میں شریک ہوئے، انوار السادات سے بھی ملے وزیر اوقاف شیخ متولی شعراوی سے بھی ملاقات کی اور جدہ، مکہ، ریاض، قطر، کویت، بمبئی ہوتے ہوئے دسمبر ۱۹۷۷ء میں مدراس پہونچے۔

ستمبر ۱۹۷۸ء میں وہ کناڈا گئے اور مختلف شہروں کا دورہ کیا اور پھر لندن ہوتے ہوئے دبائی پہونچے اور وہاں کے شیوخ سے ملاقات کی، شیخ سیف احمد الغریر کو کالج

کے اندر دس منزلہ عمارت کے افتتاح کی درخواست کی، مگر وہ مدراس نہیں آسکے انھوں نے پھر دو مرتبہ کناڈا کا سفر کیا، دوسری مرتبہ ان کے واپسی پہونچنے سے پہلے ہی کالج میں اسٹرائک شروع ہوگئی، جسکی وجہ سے ان کا دل ٹوٹ گیا، اس کالج کو عورتوں کی یونیورسٹی بنانے کا عزم بھی ختم ہوگیا گذشتہ سات آٹھ سال سے وہ حکومت تامل ناڈو سے کالج کے لئے کوئی مالی امداد قبول نہیں کر رہے تھے، اساتذہ اور طلبہ کی اسٹرائک کی وجہ سے حکومت وقت کے بعض قوانین ماننے پڑے اس وقت سے استانیاں حکومت سے تنخواہ حاصل کر رہی ہیں۔

وہ عمر بھر قانونی مسائل پر اداریات اور تبصرے لکھتے رہے اور مختلف تعلیمی و ثقافتی کانفرنسوں کی صدارت کی، ان کے خطبے قانونی اور تعلیمی معلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں، اگر ان کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو آئندہ نسل کی ترقی میں بہت ممد و معاون ثابت ہوں گے، انھوں نے مسلمانوں کی علمی و تعلیمی ترقی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں چھوڑا ہے جس پر انھوں نے وضاحت کے ساتھ گفت گو نہ کی ہو۔ جب حکومت تامل ناڈو نے پرائیوٹ کالجوں کے اختیارات میں مداخلت کرنی شروع کی تو ان کے کرتا دھرتا جن میں سے اکثر ہندو اور مسیحی تھے، جسٹس صاحب مرحوم سے مشورہ کیا اور پھر ایک جمعیت ۱۹۵۸ - ۱۹۵۹ء میں اسوسیشن آف منیجمنٹس آف پرائیوٹ کالجس کے نام سے بنائی جس کے پہلے صدر مدراس ہائی کورٹ کے مشہور بیرسٹر وی، ایل، ایتھراج مقرر ہوئے ان کی وفات کے بعد جسٹس صاحب اسکے صدر ہوتے تو انھوں نے حکومت وقت اور مدراس یونیورسٹی کی بے جا دخل اندازی پر سخت تنقید کی، اسکی وجہ سے مدراس یونیورسٹی اور حکومت وقت آگے نہیں بڑھ سکیں، اور مداخلت کرنی چھوڑ دی مگر اب بھی رہ رہ کر یہ مسائل اٹھ رہے ہیں، حکومت تامل ناڈو چاہتی ہے کہ ایس، آئی، ای، ٹی، ویمنس کالج کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے، جسٹس صاحب نے دھمکی دی کہ اس کے خلاف سپریم کورٹ دہلی میں رٹ پٹیشن داخل کی جائیگی اب ان کی وفات کے بعد کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ کیا ہوگا۔

مسلم پرسنل لا

اور حضرت مفکر ملت کی یاد

از جناب محمد اظہر صدیقی (انڈو عرب پریس فیچر سروس)

قوموں اور ملکوں کی تاریخ کے سینہ میں ایسے بہت سے واقعات محفوظ ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کسی قوم کسی ملت اور کسی ملک کے افراد کو اس وقت تک کسی اہم بلند اور عظیم مقصد میں کامیابی نصیب نہیں ہو سکی جب تک ان کے اندر اتحاد و اتفاق یگانگت اور اجتماعیت کے وہ جذبات پیدا نہیں ہو گئے جو کامیابی کی منزل سربلندی کے درجہ اور خوشحالی کے مقام بلند تک پہونچنے کے لئے ضروری ہے، تاریخ صاف صاف اعلان کرتی ہے کہ ہر عروج کی بنیاد اتحاد و اتفاق کی طاقت و برکت رہی ہے اور ہر زوال کے پیچھے آپس کے انتشار و اختلاف کے سیاہ تاریک اور مہیب ظلمتیں موجود رہی ہیں جب جب کسی قوم اور کسی ملت کے افراد نے اپنے آپ کو اتحاد و اتفاق کی لڑی میں پرو کر اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لیا اور باہمی تفریق سے اپنے آپ کو بچا لیا تو وہ آہن و فولاد کی دیواروں کو شکست دینے پہاڑوں کو مسخر کرنے طوفانوں کا مقابلہ کرنے اور سیلاب و تلاطم کا رخ پھیرنے کے قابل ہو گئے گویا قرآن عزیز کے ارشاد مقدس "واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا" کا عملی نمونہ جس قوم نے اپنے آپ کو بنا لیا اور اللہ پر ایمان کامل کے ساتھ میدان عمل میں قدم رکھا تو یہ دنیا و زمین و آسمان یہ در و دیوار یہ فضائیں ان کی کامیابی پر فخر کرنے اور دوست اور دشمن ان کی شاندار فتوحات کے لئے خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گئے عزت و سربلندی، طاقت و سرخروئی عظمت و شوکت ان کے قدم چومنے پر مجبور ہوئی

وقت کے مغرور بیرحم فرعونوں کی اکڑی ہوئی گردنیں خم ہوئیں یا ٹوٹ گئیں اور جب جب افتراق وانتشار کی تباہ کن ہوائیں چلیں اور یہ آپس میں ایک دوسرے سے دست وگریباں ہوئے اختلافات بغض وعناد کے زہریلے جراثیم ان میں پیدا ہوئے تو عزت وسربلندی عروج اقتدار حکومت وشوکت کی فیل تن دیواریں اور سر بفلک محل زمین بوس ہوگئے۔ افلاس، ناکامیابی ذلت ورسوائی اور پستی وتنزلی کی نحوست سامانیاں کچھ اس طرح ان پر مسلط ہوگئیں کہ تاریخ میں عبرت ونصیحت کے دردانگیز باب کا اضافہ ہوگیا اور دنیا کی کمزور سے کمزور پست سے پست قوم ان پر غالب آگئی۔

یہ وہ صاف وشفاف اور نکھری ہوئی سچائی ہے جس سے انکار کرنا کسی بھی انصاف پسند انسان کے لئے ممکن نہیں ہے گزشتہ دنوں مسلم مطلقہ خواتین کے حقوق کے بل کی ترتیب اس کی تکمیل اور پھر پارلیمنٹ کے ایوانوں میں حشر خیز طوفان آمیز ماحول اور پرشور تضادوں کے اندر اس کی عظیم الشان طریقہ پر کامیابی ومنظوری نے اس جیتی جاگتی حقیقت کو اور بھی نمایاں کردیا ہے کہ اتحاد میں کامیابی وبرکت ہے۔ اور اختلاف وافتراق میں ناکامی وہلاکت ہے۔

اس بل کی منظوری نے یہ بھی ثابت کردیا کہ اگر حقائق کو دلائل کے ساتھ پیش کیا جائے اور معقولیت وحقیقت پسندی کو جذبات پر غالب رکھا جائے تو مسائل کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں اور لیل ونہار کی گردشیں ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ (جاری)

برہان

مدیر مسئول: عمید الرحمٰن عثمانی

جلد نمبر ۹۸	ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ مطابق اگست ۱۹۸۶ء	شمارہ نمبر ۲

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

۱۰ راگست کو ہندوستان کے سابق کمانڈر انچیف ارون کمار شریدت ویدیہ کو پونے چھاونی کے علاقے میں چار نامعلوم بندوقچیوں نے اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا جبکہ وہ قیاس کیا جاتا ہے کہ دوپہر کا کھانا کھانے کیلئے گھر واپس لوٹ رہے تھے جنرل ویدیہ کا شمار فوج کے قابل ترین جنرلوں میں ہوتا تھا اور وہ محاذ جنگ پر بھی پہلے ۶۵ء اور پھر ۷۱ء کی جنگ میں شاندار خدمات انجام دے رہے تھے، اور دونوں بار انھیں فوجی اعزاز سے سرفراز کیا گیا تھا، پہلی بار وہ اس بکتر بند بٹالین کے کمانڈر تھے جس نے امریکن پٹین ٹینکوں سے مسلح پاکستانی فوج کو شکست دینے کا کارنامہ انجام دیا تھا دوسری بار انھوں نے ۔ بتایا جاتا ہے کہ ۔ سائی چن برف زار پر قبضہ کرنے میں غیر معمولی اہلیت کا مظاہرہ کیا تھا جسے واپس لینے کیلئے پاکستانی فوج آج تک ناکام کوشش کر رہی ہے، جنرل ویدیہ اپنی مدت ملازمت کے آخری ڈھائی برسوں میں ہندوستان کی بری فوج کے کمانڈر انچیف مقرر کئے گئے اور کسی بھی فوجی کے لئے یہ سب سے بڑا اعزاز مانا جاتا ہے اس سب سے بڑے عہدہ سے وہ گذشتہ ۶ ماہ پہلے ریٹائر ہوئے تھے اور اس وقت ریٹائرمنٹ کی پرسکون زندگی بسر کر رہے تھے ان کی فوجی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم واقعہ ۔ محاذ جنگ سے بھی زیادہ نازک اور فیصلہ کن واقعہ ۔ امرتسر کے سنہری گردوارہ پر وہ فوجی کاروائی تھی جسے بعد میں آپریشن بلیو اسٹار کے نام سے موسوم کیا گیا، خود جنرل ویدیہ نے اس فوجی کاروائی کے بعد جس میں سکھ انتہا پسند لیڈر سنت بھنڈراں والے اور سابق فوجی کانڈر رلم شبھیگ سنگھ

فوجی کارروائی کے دوران فوج کے ہاتھوں ہلاک ہوئے اور سنہری گردوارہ کا ایک بڑا حصہ منہدم ہوگیا تھا، اپنی فوجی زندگی کا مشکل ترین مرحلہ قرار دیا تھا، اور کہا تھا کہ اس فوجی کارروائی کا فیصلہ انکی فوجی زندگی کا مشکل ترین مرحلہ ثابت ہوا۔"

سنہری گردوارہ پر آپریشن بلیو اسٹار پر اگرچہ جنرل ویدیہ کی فوجی سربراہی کی مدت میں عمل کیا گیا لیکن موقع پر اس کارروائی کی کمان لیفٹننٹ جنرل سندرجی کے ہاتھ میں تھی جو آج کل ہندوستان کی بری فوج کے کمانڈر انچیف ہیں۔ اس اعتبار سے آپریشن بلیو اسٹار کے سلسلے میں جنرل ویدیہ کی ذمہ داری رسمی تھی، اور انھیں براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ ہی اس کارروائی کا ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے لیکن انکی اصل شہرت اور سکھ انتہا پسندوں میں ان کے خلاف ناگواری اور غم وغصہ کا سبب ان کا وہ طرز عمل بنا جو انھوں نے آپریشن بلیو اسٹار کے بعد سنہری گردوارہ پر حملے سے جوش میں آئے ہوئے ان سکھ فوجیوں کے خلاف اختیار کیا جو بغاوت کر کے فوج سے نکل گئے، اور جنھوں نے مختلف چھاؤنیوں سے بھاگ کر امرتسر کی طرف فوجی مارچ شروع کر دیا۔

جنرل ویدیہ کے حکم پر ان بھگوڑے سکھ نوجوانوں کے خلاف جن میں زیادہ تر تعداد زیر تربیت فوجیوں یعنی رنگروٹوں کی تھی، فوجی کارروائی کی گئی، اور انھیں مختلف ریاستوں سے گرفتار کر کے کورٹ مارشل کے سپرد کیا گیا، اس فوجی بغاوت کی ناکامی اور بھگوڑوں کی گرفتاری کے بعد جب سیاسی دباؤ کے تحت ان کے ساتھ نرم سلوک کرنے کا سوال سامنے آیا تو جنرل ویدیہ نے نہ صرف اس تجویز کی مخالفت کی، بلکہ فوجی معاملات میں سیاستدانوں کی مداخلت کے امکان کو پوری طرح مسترد کر دیا انھوں نے ایک فوجی سربراہ کی حیثیت سے فوجی نظم وضبط کو سختی کے ساتھ برقرار رکھنے کا موقف اپنایا، اور صاف طور پر فوجی نظم وضبط کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف کارروائی کو کورٹ مارشل کے دائرہ

اختیار کا مسئلہ بتاتے ہوئے فوجی عدالتوں کے اختیار میں کسی بھی قسم کی مداخلت کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

جنرل ویدیہ کا یہی سخت موقف اور یہی بے لچک طرز عمل انتہا پسند سکھ حلقوں میں ان کے خلاف غم و غصہ بلکہ نفرت و انتقام کے جذبات پیدا کرنے کا سبب بنا اور اسکے بعد انھیں گمنام دھمکی آمیز خطوط ملنے کا سلسلہ شروع ہوا، یہ سلسلہ ان کے ریٹائر ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سلسلہ کا آخری گمنام خط جو خالصتان حامیوں کی طرف سے تھا انھیں قاتلانہ حملے سے صرف دو دن پہلے موصول ہوا تھا جس کے بعد ان کے حفاظتی اقدامات اور زیادہ سخت کر دیے گئے تھے۔

جنرل ویدیہ کے قاتلوں کا یقینی طور پر ان سطروں کی تحریر تک تشخص نہیں کیا جا سکا ہے، اسلئے حتمی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی ہلاکت ضرور ہی سکھ انتہا پسندوں کے ہاتھوں عمل میں آئی ہے، لیکن جہاں تک ظاہری علامات کا سوال ہے اس سلسلے میں دہشت پسند سکھ تحریکوں کے ملوث ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ظاہری علائم اور قیاسات بھی اسی کے حق میں اشارہ کرتے نظر آتے ہیں، ان کے علاوہ انکی ہلاکت کے بعد ایک خفیہ دہشت پسند تنظیم خالصتانی کمانڈو فورس — نے انکی ہلاکت کی ذمہ داری قبول کی ہے اور خفیہ پولیس کے حلقے اس مفروضے پر زبردست چھان بین میں لگے ہوئے ہیں کہ جنرل ویدیہ کے قتل میں اس خالصتان دہشت پسند جندا، کا ہاتھ ہو سکتا ہے یہ خطرناک دہشت پسند پنجاب سے اس وقت سے غائب بتایا جاتا ہے جبکہ اس نے چھ پولیس والوں کو بیک وقت قتل کر کے انکی تحویل سے تین خطرناک دہشت پسندوں کو چھڑا لیا ہے۔ خفیہ پولیس کا خیال ہے کہ پنجاب میں دہشت پسندوں کے خلاف زبردست مہم کے نتیجہ میں پونا۔ اس طرح کے خوفناک دہشت پسندوں کے لئے جائے امن ہو سکتی تھی

اسلئے عین ممکن ہے کہ انھوں نے پونا میں قیام کرکے جنرل ویدیہ کے قتل کا منصوبہ تیار کرلیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان تین خوفناک دہشت پسندوں نے سکھ دیو سنگھ عرف سپاہی سمیت اس منصوبہ میں حصّہ لیا ہو، جنھیں جندانے ۵ راپریل کو جالندھر کے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت کے احاطہ میں ۶ ر پولیس والوں کو گولی مار کر چھڑا لیا تھا،

اگرچہ ابتدائی خبروں میں صراحت کے ساتھ اس بات کو ظاہر کردیا گیا تھا کہ عینی شاہدین کی شہادت کے مطابق جن چار حملہ آوروں نے جنرل ویدیہ کی کار پر گولیاں چلاکر انھیں ہلاک کیا ان میں سے کسی کے ڈاڑھی نہیں تھی لیکن یہ کوئی ایسا یقینی ثبوت نہیں جو اس بات کا فیصلہ کرسکے کہ ان کے قاتل سکھ نہیں تھے بلکہ اس قیاس کو تقویت پہونچانے والی ایک بات ہوسکتی ہے، کہ انھوں نے پولیس اور عام لوگوں کے شبہات سے محفوظ رہنے کے لئے ڈاڑھیاں منڈوی ہوں، لیکن اسی کے ساتھ اور بہت سے امکانات کو نظر انداز کرنا بھی صحیح نہیں ہوگا، جو شورش اور ہنگاموں کے زمانہ میں معاملات ومسائل میں قدرتی طور پر شامل ہوجاتے ہیں، اس صورت میں کہ شکوک وشبہات کے لئے ایک خاص گروہ یا شخص موجود ہو کتنے ہی اندرونی اور بیرونی عناصر کے لئے آسان ہوجاتا ہے کہ وہ حالات کو مزید خراب اور پیچیدہ بنانے کیلئے ایک ایسے کام میں ملوث ہوجائیں جس میں انکی طرف خیال تک جانے کی گنجائش کم سے کم رہ جائے۔

بہرحال اب یہ بات تو مستقبل بعید کی ہے کم ازکم فوری طور پر اس بات کی کوئی امید نہیں ہے کہ جنرل ویدیہ کی ہلاکت کا عقدہ اس طور پر حل کرلیا جائے کہ کسی کو اصل قاتلوں کے تشخص اور شناخت کے بارے میں کوئی شک باقی نہ رہ جائے فی الحال تو یہی کہا جاسکتا ہے، جنرل ویدیہ کا قتل ۔۔ سابق وزیراعظم اندرا گاندھی کے بعد دوسرے درجہ پر ایک بہت بڑا ۔ بہت اہم واقعہ ہے اور اس اعتبار سے اس کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

کہ وہ ایک ایسے فوجی جنرل کے قتل سے تعلق رکھتا ہے جو اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہو کر پرامن اور خاموش زندگی بسر کر رہا تھا، اور جس کا کوئی تعلق سیاست انتظامیہ یا فوج کی کسی سرگرمی سے باقی نہ رہا تھا، اسی کے ساتھ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ جنرل ویدیہ کے قتل سے فوج کی مستعدی، اہلیت اور حفاظتی انتظامات کی شہرت کو زبردست اور ناقابل تلافی صدمہ پہونچا ہے۔ جو جنرل ویدیہ کی سلامتی کی پورے طور پر ذمہ دار تھی، اور جس پر اسکے سابق سربراہ کے تحفظ کی ذمہ داری کا فرض بلا شرکت غیرے عائد ہوتا تھا۔

جنرل ویدیہ کے قتل کا واقعہ اس لحاظ سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ فوجی چھاونی کی حدود میں ہی پیش آیا ظاہر ہے کہ اس بارے میں فوج کے پاس اس طرح کی کوئی معذرت موجود نہیں ہے کہ اسے اپنے سابق سربراہ کی زندگی کو لاحق خطرہ کی خبر نہیں تھی یا وہ اسکے وقت اور امکانات سے ناواقف تھی، انکی ہلاکت کے بعد اب تک جو تفصیلات سامنے آسکی ہیں ان سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوجاتی ہے کہ جنرل ویدیہ کے تحفظ اور سلامتی کے انتظامات ہر ممکن خطرے کو پیش نظر رکھ کر کیے گئے تھے، بلکہ وقتاً فوقتاً ان کا جائزہ بھی لیا جاتا تھا۔ پونے کے فوجی مرکز کے اعلیٰ افسروں کا اعتراف ہے کہ جنرل ویدیہ کے حفاظتی انتظامات کا آخری بار جائزہ ۸ راگست کو لیا گیا تھا اور مقامی کمانڈر نے ان کے ساتھ ملاقات کر کے ان انتظامات پر ان سے تبادلۂ خیال بھی کیا تھا ان ہی فوجی حلقوں کی اطلاع کے مطابق جنرل ویدیہ کیلئے دن میں ایک مسلح محافظ اور رات کے لیے دو محافظوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن جب وقت موعود آیا تو کسی محافظ کی ایک نہ چلی ان پر حملہ کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ حملے کے وقت جنرل ویدیہ خود کار چلا رہے تھے، اور انکی بیوی ان کے برابر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھیں، اور محافظ پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا تھا یہی وجہ ہے کہ گولی لگنے کے بعد جنرل ویدیہ کے ہاتھ اسٹیرنگ پر کمزور پڑے اور ان کی

ماروتی کار بے قابو ہو کر ڈگمگاتی ہوئی سڑک کے دوسری طرف چلی گئی اور اس اچانک اور غیر متوقع صورت حال سے محافظ کو نہ صرف فائر کرنے کا موقع نہیں مل سکا بلکہ حملہ آوروں کو بھی فرار ہونے کا پورا موقع مل گیا۔

جنرل ویدیہ کی ہلاکت کے اس واقعہ نے جو کئی لحاظ سے غیر معمولی تھا ہندوستان کی بین الاقوامی ساکھ کو بھی بڑا صدمہ پہونچایا ہے کیونکہ اس واقعہ کی بدولت انتظامیہ اور خفیہ پولیس کے ساتھ فوج کے ناقص انتظام کا بھی ثبوت پہلی بار دنیا کے سامنے آیا جنرل ویدیہ گاندھی جی اور سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کے بعد ہندوستان کی تیسری ممتاز ترین شخصیت ہیں، جو تشدد اور دہشت انگیزی کی بھینٹ چڑھ گئی، اور اندرا گاندھی کے بعد دوسری بڑی شخصیت ہیں جو بظاہر پنجاب کے اندر پیدا ہونے والے اس تشدد انگیز ماحول کے سبب اپنی قیمتی زندگی سے محروم ہو گئے، جو جون ۱۹۸۴ء کے سنہری گردوارے پر فوجی کاروائی کے بعد پیدا ہوا تھا، اور جس کے ختم کرنے کی کوئی کوشش ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جنرل ویدیہ کے قتل کے اثرات بھی غیر معمولی انداز میں مرتب ہوئے مثال کے طور پر آزادی کے بعد پہلی بار، پارلیمنٹ کا اجلاس کسی ایسی شخصیت کی تعزیت کے بعد ملتوی ہوا جو کسی ایوان کی ممبر نہیں تھی۔

ان کی ہلاکت کے واقعہ سے دہشت پسندوں کی عام گرفتاری کی مہم کے ذریعہ دہشت پسندوں کی اٹھائی ہوئی شورش کے خاتمہ کی توقع کو بھی نہ صرف صدمہ پہونچا ہے بلکہ اس کے پنجاب سے باہر دوسری ریاستوں تک وسیع ہو جانے کا بھی خطرہ پیدا ہو گیا ہے جو بجائے خود اس تشویش ناک صورت حال کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دہشت پسندی اور تشدد کا خاتمہ صرف انتظامی کاروائیوں کے ذریعہ ممکن نہیں ہے پنجاب کے

ڈائرکٹر جنرل پولیس مسٹر سیر یو نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ انتظامی سطح پر جو کچھ بھی ممکن ہے وہ تو ہم کر ہی رہے ہیں لیکن اس سلسلے میں سیاست دانوں کو بھی کچھ کرنا چاہئے تیسرا اور آخری نتیجہ جو اس قیمتی زندگی کے ضائع ہونے کی صورت میں نکلا ہے وہ یہ ہے کہ سیاست دانوں کے غلط اقدامات قوموں اور ملکوں کو ایسی بحرانی صورت میں مبتلا کرتے ہیں کہ ان پر قابو پانے میں برسوں اور قرنوں کی مدت لگ جاتی ہے اور یہ کہ کوئی قوم مکمل مایوسی کی حالت میں عاقبت اندیشی کے ہر تقاضے کو نظر انداز کرنے پر تیار ہو جائے تو پھر کوئی بڑی سے بڑی تادیب اور ردعمل کا خوف بھی اسے من مانے کام کرنے سے نہیں روک سکتا۔

قسط ۲

مسلم پرسنل لار

اور حضرت مفکر ملت کی یاد

از جناب محمد اظہر صدیقی انڈو عرب پریس فیچرس۔

اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے کہ اس بل کی منظوری سے فرقہ پرستوں، تنگ نظر سیاسی طالع آزماؤں اور مسلمانوں سے للّہی بیر رکھنے والوں نیز ہندوستان کی جمہوری قدروں، سیکولرزم کی عظمتوں اور ان اعلیٰ اقدار و روایات کے دشمنوں کو زبردست، ذلت ناک اور عبرتناک شکست ہوئی ہے۔ جو ہمارے ملک کی شان کو ساری دنیا میں سربلند کرنے والی ہیں۔

ہم پورے خلوص کے ساتھ وزیر اعظم راجیو گاندھی ان کے رفیق کار شری اشوک سین (وزیر قانون حکومت ہند) اور ان تمام حضرات کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و تبریک پیش کرتے ہیں، جن کے منصفانہ اور عدل پرور ذہن و فکر اس بل کی منظوری میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں، اسی طرح ہندوستانی مسلمان، نوجوان سماجی و دینی کارکن اور مسلم جماعتوں کے ذمہ دار بھی قابل مبارکباد ہیں جن کے دل کی دھڑکنیں ایک طرف ان کو اپنے اتحاد کا پر جوش مگر بہ ہوش مظاہرہ کرنے اور دوسری طرف بارگاہ رب قدیر و کارساز میں دست دعا بلند کرنے پر مجبور کیے ہوئے تھیں اور جن کے طرز عمل نے یہ ثابت کر کے دکھا دیا کہ وہ اپنے عمل کے اعتبار سے چاہے دین و مذہب کی تعلیمات کے پورا پورا نمونہ معلوم نہ ہوتے ہوں مگر ان کے دل و دماغ روح اور فکر و شعور اور جذبات اسلامی پوری طرح زندہ و تابندہ ہیں اور دین و شریعت کی حفاظت کے لئے وہ ہر قربانی دینے کیلئے تیار ہیں۔

ہم مسلمانوں کو یہ بات بھی ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ ایک مخصوص طبقہ نے ملک میں

ایک ایسی فضا پیدا کردی تھی جس میں حکومت ہند کے لئے مسلمانوں کے جذبات واحساسات کو سامنے رکھکر کوئی بل منظور کرانا اور کوئی اٹل فیصلہ کرنا بچوں کا کھیل یا معمولی کام نہیں رہ گیا تھا۔ بلکہ یہ ایک طرح سے ایک خوفناک بلاخیز پرشور طلاطم خیز موجوں کا سینہ چیر کر اس کشتی کو ساحل تک پہونچانا تھا جس سے ملک کا وقار بھی وابستہ تھا اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی توپوری کائنات ہی جس میں سمٹ آئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ایک واقعہ نے بہت سی مہلک ومایوس کن غلط فہمیوں کے تانے بانے بکھیر کے رکھدیئے ہیں۔ اور ملک کی جمہوری وسیکولر قدروں کا چہرہ نکھر گیا ہے۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم کو یہ بات بھی پوری طرح یاد رکھنی ضروری ہے کہ اس کامیابی میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ حقیقت بھی شامل ہے کہ مسلم رہنماؤں بالخصوص مفکر ملت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی (صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) نے جہاں ایک طرف مادی کوششوں ظاہری دوڑ دھوپ، بھاگ دوڑ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ملک میں ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک مسلمانوں میں بیداری کی ایک ایسی لہر دوڑا دی جسکی مثال گذشتہ اڑتیس سال میں ملنی مشکل ہے وہیں یہ حقیقت ہے اور شاید بہت کم لوگ اس سے واقف ہوں گے کہ حضرت علی میاں دامت برکاتہم نے اس سلسلہ میں دعاؤں کا بھی ایسا خاص اہتمام فرمایا جو اللہ کے مخصوص بندوں اور اولیائے کرام کا ہی حصہ ہوتا ہے سفر وحضر میں ذکر وشغل کے حلقوں اور دعاؤں کی مجلسوں کے انعقاد خاص میں کسی قسم کی ادنیٰ سی کوتاہی نہ آنے دینا اور خود اپنے طور پر ایک بزرگ ہر نیک بندے اور مخلص فرد ملت سے دعاؤں کی خاص درخواست کرنا ایک مبارک ومسعود اور قابل تقلید معاملہ ہے اور حق یہ ہے کہ کامیابی کے لئے یہ بھی ہے لازمی اور ضروری ہے۔

اس طرح مسلمانوں نے بھی جگہ جگہ دعاؤں کا خاص اہتمام کیا مساجد میں نمازوں کے بعد اور بعض جگہ خصوصی طور پر آیت کریمہ کے ختم پڑھکر دعائیں مانگیں تحدیث نعمت

کے طور پر یہ عرض کرنا شاید نامناسب نہ ہو کہ اکابر و بزرگوں کی برکت سے اس سیہ کار ماقم الحروف کو بھی حق تعالیٰ نے دیوبند کی کئی ایک مساجد میں ختم آیت کریمہ کرانے اور ختم خواجگان کی پابندی کرنے کی توفیق اپنے کرم خاص سے عطا فرمائی جن لوگوں نے اس پروگرام میں شرکت کی اور دلسوزی کے ساتھ حصہ لیا اللہ تعالیٰ ان کو بھی اجر عظیم عطا فرمائے آمین۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی ہماری ملی قیادت کے آسمان پر اس آفتاب درخشاں کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے گھٹا ٹوپ اندھیارے میں روشنی اور اجالا نظر آتا تھا،

ان کی فکر و بصیرت کے سامنے اکثر و بیشتر رہنماؤں کی بصیرت ماند پڑ جاتی تھی، مگر ان کے اخلاق کریمانہ، وسعت ظرف، اور ان کے قلب و ذہن کی کشادگی بھی کسی کو یہ محسوس ہی نہ ہونے دیتی تھی کہ حضرت مفتی صاحب کی نظر میں ان کا مقام و مرتبہ کسی طرح فروتر ہے یہ وہ خصوصیت تھی کہ جس نے ملت کی صفوں میں پھیلے ہوئے انتشار و افتراق کو ختم کر کے تمام مسلم جماعتوں اور ان کے ذمہ داروں کے درمیان باہمی یگانگت و اخوت اور ایک دوسرے کی پاسداری و برداشت کا وہ جوہر تاباں پیدا کرنے کی کوشش کی جس نے اختلاف، انشقاق کی ظلمتوں کو آپس کی رواداری و مروت کی روشنی میں بدل دیا، اور ملت اسلامیہ کا ایک متحدہ و مشترکہ پلیٹ فارم وجود میں آگیا جو ہر طرح آندھیوں اور طوفانوں کے مقابلہ پر قائم رہا۔

آج جبکہ ملت اسلامیہ ہند کو اللہ رب العالمین نے کامیابی و کامرانی سے ہمکنار فرمایا ہے تو بجا طور پر ملت کا ہر بہی خواہ مسرور و شاداں ہے مگر یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ حضرت مفکر ملت نے اتفاق و اتحاد کی جو اسپرٹ پیدا کی اور اس کے لئے جو سخت اور مخلصانہ جد و جہد فرمائی وہ ہماری ملی تاریخ کا ایک جلی عنوان ہے جو ماضی کی روشنی

سے حال کو سنوارنے اور مستقبل کو تابناک بنانے کا ایسا ذریعہ بھی ہے جسکی بنیاد حضرت مفکر ملت جیسے سراپا اخلاص ملی رہنما اور اسلامی مفکر اور دردمند صاحب بصیرت بزرگ کے خون دل و جگر پر قائم ہے۔

آج فتح و کامرانی کے ہنگامہ مسرت خیز کی گونج میں حضرت مفکر ملت قدس سرہٗ کی عظیم الشان پر خلوص تاریخ ساز خدمات کے نقوش تاباں ذہن و فکر افق پر جگمگ کر رہے ہیں۔

حضرت مفکر ملت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی قدس سرہٗ کو ہم سے رخصت ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔ ۱۲ مئی ۱۹۸۴ء کو علم و شریعت، اخلاق و شرافت، فکر و بصیرت، دانش مندی و بصیرت، تدبر و تفکر کا ایک آفتاب ضوفشاں، ملک و ملت کی قیادت کے آسمان کا ماہتاب درخشاں غروب ہو گیا تھا جسکی پر نور کرنوں سے گذشتہ سال تک ملت اسلامیہ ہند کی بے لوث خدمات کی دنیا جگمگاتی رہی اور جسکی مخلصانہ رہنمائی، علم و حکمت، دین و شریعت، تصنیف و تالیف اور اسلام کی ترویج و اشاعت کی کھیتیوں کو سیراب کرتی رہی اور ہر ہر قدم پر ملت کی صفوں میں اتحاد و اتفاق کی فضا قائم کرتی رہی۔

بلاشک و شبہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ نے ملت اسلامیہ ہند کے لڑتے بگڑتے آپس میں الجھتے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے فرقوں اور باہمی چپقلش اور اختلافات کی دلدل میں پھنسی ہوئی جماعتوں کو اتحاد و اتفاق کی ایک لڑی میں پرونے کے لئے مسلسل لگاتار اور انتھک جد و جہد کی مجلس مشاورت اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی کشتی کو ساحل مراد تک پہونچایا۔

قدرتی طور پر اس موقع پر حضرت مفکر ملت اور دوسرے دردمند اکابر امت کی یاد دل کے دروازے پر دستک دیتی سنائی دیتی ہے جنھوں نے مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں سب سے پہلے دوٹوک، بے لاگ اور دانشمندانہ انداز میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ

مسلمانوں کے پرسنل لا میں کسی قسم کی تبدیلی ہرگز برداشت نہیں کی جا سکتی۔

اب سے پندرہ سولہ سال پہلے مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی قدس سرہٗ سے ہندوستان ٹائمز کے ایک نمائندہ نے مختلف ملی مسائل پر ایک انٹرویو لیا تھا اس انٹرویو کے دوران پہلی مرتبہ یہ سوال سامنے آیا تھا کہ بوہرہ برادری کے مذہبی معاملات و رسوم کے سلسلہ میں حکومت ـــ تارکنڈے کمیشن ـــ قائم کر رہی ہے۔

جو اس طبقہ کے مذہبی معاملات پر تحقیق و تفتیش کر کے کوئی رائے دے گا، اور فیصلہ کرے گا،

حضرت مفتی صاحب سے انٹرویو لینے والے اس نمائندہ نے سوال کیا کہ اس کمیشن کے سلسلے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ حضرت مفتی صاحب نے برجستہ اور صاف و بے لاگ الفاظ میں فرمایا کہ مسلک و مشرب کا اختلاف چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو مگر یہ بات کسی صورت پسند و برداشت نہیں کی جائے گی کہ مسلم پرسنل لا میں کسی بھی طریقہ اور کسی بھی عنوان سے مداخلت کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی جائے، بعض لوگ اس وقت اس مسئلہ کی نزاکت کو سمجھنے سے قاصر رہے لیکن جلد ہی ان کو اندازہ ہو گیا کہ حضرت مفتی صاحب کی فہم و فراست دوراندیشی اور اصابت رائے نے کتنی گہرائی سے مسئلہ کی اہمیت و نزاکت کو بھانپ لیا تھا، اور اس پر سخت احتجاج کیا تھا،

اسی طرح جنوری ۱۹۷۲ء میں حضرت مفتی صاحبؒ نے آل انڈیا ریڈیو پر مسلم پرسنل لا کے موضوع سے دو تقریریں فرمائیں جن میں اس اہم مسئلہ کی تمام تفصیلات کو نہایت دانشمندانہ طریقہ پر ـــ ایک پختہ کار صاحب طرز اور فن خطابت کے ماہر کی حیثیت سے چند سطروں میں سمیٹ کر بیان کرتے ہوئے صاف صاف اعلان فرما دیا تھا کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

ملت کے سوادِ اعظم اور علمائے کرام کے بڑے طبقہ، جدید تعلیم یافتہ اصحاب فکر و

دانش اور عوام کی رائے اور پختہ عقیدہ وخیال کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ مسلم پرسنل شریعت اسلامی کا اہم جزو بلکہ اس کی روح ہے اور وہ اللہ اور اسکے رسول کے احکام پر مبنی ہے یہ احکام قطعی ہیں اور لیل ونہار کی کوئی گردش اور کسی انقلاب کیوجہ سے ان میں کسی قسم کی تبدیلی اور ترمیم نہیں ہوسکتی ایسا اقدام کیا جائیگا تو وہ دین ومذہب میں مداخلت بیجا کے ہم معنی ہوگا۔

پھر فرماتے ہیں کہ ــــ "صاف بات یہ ہے کہ جہاں تک مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کا تعلق ہے اس میں کوئی ایسی راہ (تبدیلی کی) تلاش کرنا ایک جستجوئے ناکام کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ مسلم پرسنل لا کی وسعتوں کو اس سمندر سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس کا کنارہ نظر نہ آتا ہو، اس بحر ناپیدا کنار سے چند قطروں یعنی چند گنے چنے مسائل کو لیکر پرسنل لا میں تبدیلی یا ترمیم کا عنوان دینا مضحکہ خیز تو ہوسکتا ہے حقیقت پر مبنی نہیں ہوسکتا۔

ان چند جملوں میں مسئلہ کی جو روح سمٹ آئی ہے اور تاریخ نے جس طرح ان جملوں کی صداقت کی گواہی دی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

اسی طرح مارچ ۱۹۷۲ء میں ہی یہ حضرت مفتی صاحبؒ کا ہی دم، خم فکر وتدبر اور جذبہ تھا کہ جس نے دار العلوم دیوبند

ایک نمائندہ اجتماع مسلم قائدین، علماء دانشوروں ماہرین قانون کا منعقد ہوا خوب یاد ہے کہ اس اجتماع میں حضرت مفتی صاحبؒ نے علمائے کرام کو انکی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے یاد دلایا تھا کہ مسلم پرسنل لا میں حکومت کی طرف سے کسی ترمیم کو تو ہم برداشت نہ کریں گے لیکن مسلم معاشرہ میں جہل وناواقفیت کی بنا پر جو مسائل پیش آنے لگے ہیں ان کی اصلاح بھی تو صرف ہماری ہی ذمہ داری ہے۔

وہی اجتماع ــــ تاریخ ساز عہد آفریں اور مسلمانان ہند کی پوری حیات ملی کی

نشاۃ ثانیہ ثابت ہوا تھا۔ کہ اس کے اندر ان ہی بزرگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں مسلم پرسنل لاء کے مسئلہ پر مسلمانوں کے مختلف مسلکوں اور نقاط نظر رکھنے والے لوگوں، جماعتوں کے ذمہ داروں، دینی و علمی اداروں مفکروں، ماہرین قانون اور سیکولر اہل فکر اصحاب کا ایک ایسا نمائندہ عظیم کنونشن بمبئی میں منعقد کیا جائے جس میں سب ہی مسلم طبقوں اور جماعتوں کو دعوت دی جائے،

چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی طرف سے یہ اجتماع بمبئی میں منعقد ہوا، حضرت مفتی صاحبؒ اور حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رح، مولانا سید منت اللہ رحمانی مدظلہ، نے اپنی سوجھ بوجھ وسعت فکر و قلب شبانہ روز محنت اور ناقابل فراموش جذبات اخلاص کے ساتھ اس کنونشن کو کامیاب اور مؤثر ترین بنایا۔ اس کو مسلمانوں کا ایک ایسا مضبوط پائیدار اور مستحکم اتحاد کی حیثیت دینے میں اپنا خون دل و جگر صرف کر دیا۔ اور پوری ملت کو جسد واحد کی شکل میں پیش کر کے وہ عظیم کارنامہ انجام دیا جسکو تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی،

اس زمانہ میں اس کنونشن پر ایک معروف اخباری نمائندہ نے یہ تاریخی تبصرہ کیا تھا۔ کہ ان تین دنوں کی (جب یہ کنونشن بمبئی میں منعقد ہو رہا ہے۔) خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان کا ہر سرکردہ مسلمان ان دنوں میں بمبئی میں موجود ہے — بہر حال چوپاٹی کے میدان میں پچاس لاکھ انسانوں کا جم غفیر یہ معلوم کرنے کیلئے بے چین تھا کہ اس کے اکابر اور رہنما کیا فیصلہ کرتے ہیں — اس تاریخ ساز موقع پر حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانی نے اس اجتماع میں جو تقریر کی وہ بھی تاریخ کا ایک شاہکار سمجھی گئی تھی — حضرت مفتی صاحب نے فرمایا تھا کہ:

در یہ لاکھوں مسلمانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ مسلمان دین و شریعت اور مسلم پرسنل لاء میں کسی قسم کی تبدیلی کو

ہرگز ہرگز برداشت نہ کرے گا، حکومت کے ذمہ دار یہاں آئیں اور آکر دیکھیں کہ اس عظیم و بے مثال اجتماع کے دل کی دھڑکنیں کیا کہہ رہی ہیں۔

جہاں تک ہمارے پریس ـــــ نام و نہاد قومی پریس کا تعلق ہے تو وہ کل صبح آپ دیکھیں گے۔ کہ اس کی کوئی خبر نہیں آئے گی۔ بلکہ اس اجتماع سے الگ ایک بند کمرے میں جو چند آدمی۔ چند نام نہاد مسلمان۔ حمید دلوائی کی ٹولی جو تننگ کر رہی ہے اس کی خبر شائع ہوگی۔

حضرت مفتی صاحب نے پورے جوش ایمانی کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ حالات چاہے کچھ ہوں اور ہمیں چاہے کتنی ہی قربانیاں دینی پڑیں لیکن کسی طرح کی کوئی تبدیلی دین و شریعت میں برداشت نہیں کی جائیگی۔

اس موقع پہ کی گئی تقریر میں حضرت مفتی صاحبؒ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ کس طرح حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ اسی طرح قومی پریس کا وہ رویّہ جس کی طرف حضرت مفتی صاحب نے ایک پیش گوئی کے طور پر اشارہ کر دیا تھا آج اس کا کردار اسی پرسنل لا کے بارے میں جیسا کچھ رہا ہے وہ اس ملک کی جمہوریت، نیک نامی اور سیکولرزم کے دامن پر ایک سیاہ بدنما اور رسواکن داغ ہے،

اس تاریخ ساز اجتماع میں حضرت مفتی صاحب نے اپنے دیگر رفقائے گرامی سے ملکر اتحاد ملی کا جو ایک عظیم الشان مرکز قائم کرایا تھا اتحاد کی جو اسپرٹ قائم کر دی تھی اور زندگی کے آخری سانس تک وہ جس طرح مسلمانوں میں، مسلم جماعتوں میں جس طرح اتحاد فکر و عمل کا جذبہ پیدا کرنیکی کوشش کرتے رہے حق یہ ہے کہ ان کے انتقال کے دو سال بعد مسلمانوں نے جس ملی اتحاد کا ثبوت دیا اور اس مسلم پرسنل لا لیڈر نے جس طرح دانشمندی، بصیرت اور ہوشمندی کے ساتھ پرسنل لا کی مہم کو کامیابی کی منزل

تک پہونچایا اس سے یقیناً حضرت مفکر ملت اور حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب جیسے بزرگوں کی روحیں جنت میں خوشی سے پھولے نہ سمارہی ہوں گی۔

اپنے اسلاف واکابر کی یاد اور ان کے نقوش قدم اور ان کے افکار وتجربات کی تجلیوں اور ضیا باریوں سے اپنے فکر وشعور اور اعمال وکردار کو منور کرنا اور سینوں کو ان سے معمور کرنا اگر کوئی اہمیت رکھتا ہے اور اگر اس ناقابل انکار سچائی سے بخوبی واقف ہیں کہ جو قوم اپنے بزرگوں، اسلاف کرام اور قومی ہیروؤں کو انکی عظیم الشان خدمات کو بھلا دینے کا جرم عظیم کرتی ہے وہ اس دنیا میں عزت وسرخروئی اور عظمت وسربلندی کے ساتھ زندہ رہنے کے حق سے محروم کردی جاتی ہے، تو ہم آپ سے پوری دلسوزی ودردمندی کے ساتھ گذارش کریں گے کہ حضرت مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہم اللہ کے لئے ایصال ثواب کا خصوصی اہتمام فرمائیں۔ اور ان کے چھوڑے ہوئے مشن اور تحریکوں کو بڑی سے بڑی قربانی دیکر زندہ وتابندہ رکھنے کی کوشش فرمائیں۔

امید کہ یہ گذارش صدا بصحرا ثابت نہ ہوگی۔

مولانا اکبرآبادی مرحوم
اور برہان

مسعود انور علوی کاکوروی

بعض چیزیں اللہ تعالیٰ نے لازم و ملزوم پیدا کی ہیں۔ برہان کا نام آتا تھا تو ساتھ ہی مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم کا تصور ابھرتا تھا گویا وہ اور ماہنامہ برہان ایک جزو لاینفک تھے ایسا لگتا تھا کہ وہ برہان سے اور برہان ان سے الگ ہی نہیں ہوسکتے۔

برہان کا سب سے پہلا پرچہ جولائی ۱۹۳۸ء ۶ جمادی الاول ۱۳۵۷ھ میں ندوۃ المصنفین دہلی سے جس کی تشکیل "اعیان ثلاثہ" کے ہاتھوں ہوئی جاری ہوا۔ اعیان ثلاثہ میں پہلا نام مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی، دوسرا نام مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور تیسرا نام مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمہم اللہ کا تھا۔

ماہنامہ برہان نے جولائی ۱۹۳۸ء سے آج تک جس قدر تاریخی، تہذیبی اور علمی و ادبی موضوعات پر متنوع مضامین شائع کیے وہ آپ اپنی نظیر ہیں، مولانا اکبرآبادی مرحوم کو برہان سے جیسا کچھ ربط وضبط بلکہ قلبی لگاؤ اور عشق تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ مرحوم باوجود اپنی گوناگوں مصروفیتوں، شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی کی صدارت، علمی اسفار، مدرسہ عالیہ کلکتہ کی انتظامی ذمہ داریاں اور دوسرے دنیاوی امور میں انہماک کے، برہان کے لیے گراں قدر مقالات اور نظرات لکھتے رہے۔ سوائے اسکے کہ فروری سنہ ۴۳ء سے دسمبر سنہ ۴۵ء تک کے رسائل کی ادارت و نظرات نویسی مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی کے ہاتھوں ہوتی رہی، اس کے علاوہ بھی دو ایک شماروں

کی ادارت بعض اہم مجبوریوں اور بیرون ملک قیام کے باعث نہ کرسکے، مجھے خوب یاد ہے کہ علی گڑھ کے دوران قیام اکثر و بیشتر دماغی الجھنیں، پریشانیاں اور بیماریاں حائل ہونے کے باوجود برہان کے نظرات اور اسکی ادارت کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیتے رہے۔

مولانا نے برہان کے ذریعہ ملک و ملت کی جس طرح بے لوث خدمت کی وہ ناقابل انکار ہے۔ یہ ان کا گراں مایہ احسان ہے کہ انھوں نے وقت کی نبض پہچان کر سیاسی معاشی، اقتصادی، اسلامی، ملکی وملی مسائل، فرقہ پرستی، واقلیت، مسلمانوں میں ملی شعور کے فقدان، مسئلہ تعلیم، وقتی امور اور مستقل معاملات پر بڑے دلنشیں اور سلجھے ہوئے انداز میں قلم اٹھایا۔ نہ صرف نظرات بلکہ شئون علمیہ اور نقد و تبصرہ کے عنوانات سے بھی اپنی علمی بصیرت اور وسعتِ معلومات کے بے شمار نمونے پیش کیے۔ تاریخی گتھیوں کو سلجھایا، سیاسی ادبی ولسانی مسائل پر خود بحث و تمحیص کی اور دوسروں کو دعوت دی، اکثر یہ ہوا کہ نظرات میں کچھ لکھا اور بعد میں حقائق اس سے مختلف نکلے تو بڑی فراخ دلی سے اپنے سابقہ خیالات کی تردید کی اور رجوع کیا، یہ معمولی چیز نہیں بلکہ ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ انھوں نے تنہا ہی برہان کی تن من دھن سے خدمت نہ کی، بلکہ دوسروں خصوصاً نوآموز اور مبتدیوں کو بھی دعوت دی۔ ان کی ہمت افزائی کی بلکہ بعض اوقات انھیں انگلی پکڑ کر چلایا اور ان میں خود اعتمادی پیدا کی۔

مولانا نے اپنے سیکڑوں ملنے والوں، جاننے والوں، ارباب حل و عقد، سیاست داں

مولانا مرحوم کے حالات زندگی اور علمی کارناموں سے متعلق راقم احقر کا مقالہ "مولانا اکبرآبادی مرحوم۔ من مگر شمع چو رفتم بزم برہم ساختم" انشاء اللہ کسی قریبی شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

علما و مشاہیر کی وفات پر جس طرح اپنے رشحات قلم سے اپنے قلبی واردات، جذبات و احساسات کا اظہار کیا وہ بھی آپ اپنی نظیر ہے۔ بعض مقامات پر تو ان کے قلم کی جولانی ذہن رسا کی جدت طرازی، اسلوب کی ندرت بیانی قابل صد تحسین ہے۔

برہان کا پہلا شمارہ بہتر (۷۲) صفحات پر مشتمل تھا صرف ستمبر، اکتوبر، نومبر سنہ ۳۸ء کے شماروں کی ضخامت گھٹ کر بائیس (۲۲) صفحات ہو گئی تھی، ورنہ عموماً چونسٹھ (۶۴) اور بہتر (۷۲) صفحات ہی رہے۔ قارئین برہان بخوبی جانتے ہیں کہ مولانا مرحوم نے آخیر وقت تک برہان کے معیار کو حتی الوسع گرنے نہ دیا۔

راقم احقر نے اس مقالہ میں اس بات کی ادنیٰ کوشش کی ہے کہ برہان میں شائع شدہ ان کی تحریریں، خواہ وہ اہم مسائل پر نظرات ہوں یا مقالات سبھی کی حتی الوسع ایک فہرست مرتب ہو جائے یہ ادعا تو نہیں ہے کہ رطب و یابس سبھی جمع ہو گئے ہیں مگر سوا چند شماروں کے جو دستیاب نہ ہو سکے تقریباً تمام تحریروں کی فہرست پیش ہے۔ وفیات بھی سوا ایک دو کے سبھی ان ہی کے قلم کی ہیں۔ بعض نظرات اپنی دانست میں کچھ زیادہ اہم نہ ہونے کی بنا پر نظر انداز کر دیے ہیں۔ نقد و تبصرہ کے عموماً صرف وہی عنوانات لیے ہیں جن پر مستقل مقالہ ہے۔

۱: مسلمانوں کے تعلقات غیر قوموں کے ساتھ ــــ برہان کا پہلا مضمون ۱/۲، ۳ اگست ستمبر ۴۸ء
قرون اولیٰ میں۔

۲: فہم قرآن (ن) نظرات ۱/۳، ۴، ۲/۲، ۵، ۶

۳: عدم التشدد یا صبر (ن) ۶/۲

۴: وردھا اسکیم اور ودّھیا مندر اسکیم ن ۱/۲

۵: عربی زبان کی ترویج و اشاعت ۶/۴

۶: اسباب عروج و زوال امت ۶، ۱/۸

۲۷: خاکسار تحریک پر ایک نظر (ن)	۴/۵
۲۸: علمائے ہند کا سیاسی موقف	۲/۲۱ - ۵
۲۹: ایک کلچر، ایک زبان کا نعرہ (ن)	۳/۲۱
۳۰: ۴۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمان (ن)	۱/۲۱
۳۱: فرقہ پرستی اور اقلیت "	۵/۲۱
۳۲: علی گڑھ "	۲،۱/۲۷
۳۳: علمائے حق "	۳/۲
۳۴: ٹنڈن جی کانگریس کے صدر "	۳/۲۵
۳۵: ہمارا مسئلہ تعلیم	۵/۳۱ - ۶
۳۶: مدرسہ عالیہ کلکتہ کی تاریخ	۲/۳۰
۳۷: ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس علی گڑھ (ن)	۳/۲۸
۳۸: بچوں کی تعلیم و تربیت	۶/۱۷، ۱/۱۸، ۲، ۴
۳۹: اردو کا مسئلہ (ن)	۱/۲۸
۴۰: ہندی اردو، انجمن ترقی اردو	۶/۲۷
۴۱: اردو کہاں بولی جاتی ہے؟	۳/۳۶
۴۲: مذہب کی توہین کرنے والی کتابیں (ن)	۴/۲۸
۴۳: جامع المجددین، عبدالباری ندوی پر تبصرہ	۱/۲۸ - ۶
۴۴: مکاتیب شیخ الاسلام، حسین احمد مدنی (اوّل)	۵/۲۹
۴۵: مختصر سیرت قرآنیہ سیدنا محمدؐ پر تبصرہ	۶/۳۰، ۱/۳۱ - ۶
۴۶: ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل تبصرہ	۵/۳۶
۴۷: مجذوب سندھی کی چند الہامی باتیں۔	۴/۲۴

وفیات

۲۱- مولانا الیاس کاندھلوی ۵/۱۸
۲۲- محمد علی جناح ۴/۲۱
۲۳- مولانا شبیر احمد عثمانی ۱/۲۴
۲۴- تاجور نجیب آبادی ۲/۲۶
۲۵- ڈاکٹر ابرار حسین والد مولانا اکبر آبادی
نوشتہ مفتی عتیق الرحمن ۲/۲۹
۲۶- مولانا حسرت موہانی ۶/۲۶
۲۷- سیماب اکبر آبادی ۲/۲۶
۲۸- مولانا سید سلیمان ندوی ۶/۳۱
۲۹- مولانا حبیب الرحمن شروانی ۳/۲۵
۳۰- حبیب الرحمن لدھیانوی ۳/۲۷
۳۱- مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی ۲/۲۹
۳۲- آصف علی ۵/۳۰
۳۳ سید ابوالنظر رضوی ۵/۳۶
۳۴- ابن سعود ۶/۳۱
۳۵، مولانا اسلم جیراجپوری ۱/۳۶
۳۶- بشیر الدین اٹاوی ۱/۳۷
۳۷- شانتی سروپ بھٹناگر ۲/۳۴
۳۸- شفیق الرحمن قدوائی ۶/۳۰
۳۹- رفیع احمد قدوائی ۵/۳۳
۴۰- خواجہ حسن نظامی ۳/۳۵

۴۱- مولانا حسین احمد مدنی ۶/۳۹
۴۲ اقبال سہیل ۱/۳۵
۴۳ مولانا اعزاز علی ۴/۳۴
۴۴ مولانا آزاد سبحانی ۲/۳۹
۴۵ ابوالکلام آزاد ۳/۴۰
۴۶ اے کیمرن بنگال چیمبرس آف کامرس ۴/۲۴
۴۷ مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری ۱/۲۸
۴۸- یعقوب الرحمن عثمانی ۳/۲۸
۴۹- نہال سیوہاروی ۱/۲۸
۵۰- حرامت مولانا مناظر احسن گیلانی ۱/۳۷
۵۱- عبدالسلام ندوی
۵۲- عطاء اللہ شاہ بخاری
(۵۱-۵۲) ۱۱/۱ ۳/۳۴
۵۳ عبداللہ یوسف علی ۱/۳۲
۵۴ مفتی عبداللطیف سہارنپوری ۳/۳۳
۵۵ لیاقت علی خاں ۵/۲۷
۵۶ کشن پرشاد کول ۲/۳۴
۵۷- قاضی عبدالغفار ۲/۳۶
۵۸- شاہ حلیم عطا، ۵/۳۵
۵۹ عبدالرحمن ۳/۳۳
۶۰- عبدالحق مدنی ۲/۳۵
۶۱، ضیاء الدین احمد ۵/۲۸

۶۲- ظفر علی خان ۶/۳۷
۶۳- اسد ملتانی ۶/۴۳
۶۴- امجد حیدرآبادی ۵/۴۵
۶۵- جگر مرادآبادی ۴/۴۵
۶۶- احمد سعید دہلوی ۴/۴۳
۶۷- ڈپٹی حبیب اللہ ۴/۴۶
۶۸- نواب حمید اللہ خاں ۳/۴۴
۶۹- دل شاہ جہانپوری ۳/۴۴
۷۰ رام بابو سکسینہ ۱/۴۰
۷۱- عبدالمجید سالک ۴/۴۳
۷۲- شعیب قریشی ۴/۴۸
۷۳- خلیفہ عبدالحکیم ۲/۴۲
۷۴- افضل العلماء عبدالحق ۴/۴۰
۷۵- مولوی عبدالحق ۳/۴۷
۷۶- عبدالرحمن خاں ۴/۴۹
۷۷- ڈاکٹر عبدالعلی ۶/۴۶
۷۸- شاہ عبدالقادر رائے پوری ۳/۴۹
۷۹ مفتی عبداللطیف علی گڑھی ۱/۴۴
۸۰ مفتی کفایت اللہ ۱/۴۰
۸۱- پنڈت کیفی ۵/۳۵
۸۲- محمد علی ردولوی ۴/۴۳

۸۳- سید محمد احمد کاظمی ۶/۴۳
۸۴- مطلوب الرحمٰن عثمانی ۲/۴۵
۸۵- ظہورالحسن ناظم سیوہاروی ۳/۴۴
۸۶- ہادی حسن ۶/۵۰
۸۷- مولانا محمد یوسف امیر جماعت ۴/۵۴
۸۸- عبدالمجید خواجہ ۱/۵۰
۸۹- خواجہ عبدالحی فاروقی ۳/۵۴
۹۰- طاہر سیف الدین ۶/۵۵
۹۱- سید صدیق آئی سی ایس ۴/۵۱
۹۲- مولانا صبغت اللہ شہید فرنگی محلی ۱/۵۴
۹۳- مولانا بدر عالم میرٹھی ۵/۵۵
۹۴- ترجون ناتھ زار زتشی ۵/۵۵
۹۵ محی الدین زور ۶/۵۰
۹۶- محمد شفیع ۶/۵۰
۹۷- فخر مشرق شفیق جونپوری ۶/۵۰
۹۸- لال بہادر شاستری، ۹۹- تلوک چند محروم ۲/۵۶
۱۰۰- مسعود علی ندوی ۴/۵۹
۱۰۱- محمد ابراہیم بلیاوی ۱/۶۰
۱۰۲- حافظ محمد ابراہیم ۲/۶۰
۱۰۳- عبدالباقی مدیر کاروان وطن ۳/۶۰

نام	تاریخ	نام	تاریخ
۱۰۴- پرویز شاہدی	۱/۶۱	۱۰۶- پروفیسر نجیب اشرف ندوی / ۱۰۷- مفتی انتظام اللہ شہابی	۵/۶۱
۱۰۵- مظفر خاں یوسفی	۲/۶۱		
۱۰۸- ثناء اللہ عثمانی	۳/۶۳		
۱۰۹- مفتی محمود احمد نانوتوی / ۱۱۱- قاری حفظ الرحمٰن	۲/۶۳	۱۱۰- اسرار احمد / ۱۱۲- قاری محمد یوسف / ۱۱۴ رئیس صدیقی	۲/۶۶
۱۱۳- ڈاکٹر ذاکر حسین	۵/۶۳		
۱۱۵ مولانا رسول خاں (استاد)	۵/۶۷	۱۱۶- ڈاکٹر سید محمود / ۱۱۸ اسد اللہ کاظمی	۴/۶۷
۱۱۷ ڈاکٹر سید عبداللطیف / ۱۱۹ غلام رسول مہر	۶/۶۷	۱۲۰- شاہ فیصل	۵/۷۴
۱۲۱- خواجہ غلام السیدین / ۱۲۳- احتشام الحسن کاندھلوی / ۱۲۵- مولانا عبدالباری ندوی	۱/۶۸	۱۲۲ ڈاکٹر عبدالعلیم وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی	۳/۷۶
		۱۲۴- ڈاکٹر زبیر صدیقی	۴/۷۶
		۱۲۶ سید مہدی حسن شاہجہاں پوری	۵/۷۶
۱۲۷- الحاج مولانا محمد اسماعیل / ۱۲۹ مولانا سید فخرالدین احمد	۵/۶۸	۱۲۸- شیخ علال الفاسی المراکشی	۶/۷۴
		۱۳۰- سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین	۲/۷۴
۱۳۱ عبدالستار صدیقی	۲/۶۹	۱۳۲- مولانا شاہد فاخری	۴/۷۵
۱۳۳ پروفیسر سید احتشام حسین	۴/۶۹	۱۳۴- مولانا سید محمد میاں / ۱۳۶- آغا شورش کشمیری	۵/۷۵
۱۳۵- سید عبدالرحمٰن صاحب / ۱۳۷- عبداللطیف نعمانی / ۱۳۹ عبدالقیوم انصاری / ۱۴۱- غلام احمد فرقت کاکوروی	۲/۷۰	۱۳۸- ڈاکٹر میر ولی الدین / ۱۴۰- مولانا اسمٰعیل سنبھلی	۶/۷۵
۱۴۳- مولانا عبدالصمد رحمانی	۶/۷۰	۱۴۲- شاہ معین الدین ندوی / ۱۴۴- نورالدین بیرسٹر	۱/۷۴

۱۴۵- مولانا عبدالسلام فاروقی ۳/۷۱
۱۴۶- مولانا عثمان فارقلیط ۱/۷۷
۱۴۷- پروفیسر عبدالمعید خاں ۴/۷۱
۱۴۸ رشید احمد صدیقی ۲/۷۸
۱۴۹- ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی ۶/۷۲
۱۵۰ عبدالماجد دریاآبادی ۱/۷۸
۱۵۱- مولانا شریف الحسن شیخ الحدیث دیوبند ۶/۷۸
۱۵۲ شیخ محمد جان ⎫
۱۵۳- مولانا یوسف بنوری ۶/۷۸
۱۵۴ مصطفیٰ احسن علوی کاکوروی ⎭ ۱/۸۶
۱۵۵ سید اختر حسین استاد دیوبند ۶/۷۹
۱۵۶- پروفیسر اشتیاق حسین قریشی ۲/۸۶
۱۵۷- قاری محمد یعقوب ۶/۷۹
۱۵۸- امتیاز علی خاں عرشی ۲/۸۶
۱۵۹ مولانا فخرالحسن حسنی عمری ⎫ ۴/۸۵
۱۶۰- نواب احمد سعید خاں چھتاری ۲/۸۸
۱۶۱- جمیل مظہری ⎭
۱۶۲- پیر حسام الدین راشدی ۲/۸۸
۱۶۳- محمد ثانی الحسنی ⎫
۱۶۴- شیخ عبدالعفو ۴/۸۹
۱۶۵ جوش ملیح آبادی ⎬ ۴/۸۸
۱۶۶- عبدالحمید نعمانی ۲/۹۰
۱۶۷ فراق گورکھپوری
۱۶۸- خواجہ عبدالرشید ۴/۹۰
۱۶۹ احسان دانش ⎭
۱۷۰- ایل کے گاما ⎫
۱۷۱- قاری محمد طیب ۲/۹۱
۱۷۲- پروفیسر اصغر علی فیضی ⎭ ۵/۸۶
۱۷۳- مفتی عتیق الرحمن عثمانی ۵/۹۲
۱۷۴- ڈاکٹر پی کے عبدالغفور ۱/۹۳
۱۷۵- جسٹس بشیر احمد سعید ۱/۹۳
۱۷۶- محمد عثمان (مالیگاؤں) ۱/۹۳

مولانا اکبر آبادی مرحوم نہ صرف ایک بلند پایہ عالم اور نکتہ سنج ادیب تھے بلکہ شاعر بھی تھے مگر بقول خود کے کہ ایک مرتبہ اپنے ابتدائی دور میں جب کہ میرے اس قسم کے مضامین و مقالات پنجاب کے بعض ادبی رسالوں میں شائع ہوتے تھے، ایک نظم کی نسبت خیال ہوا کہ معارف جیسے معیاری رسالہ کے معیار کے لائق ہے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی خدمت میں ارسال کردی، مولانا نے یہ نظم واپس کرتے ہوئے بڑی

محبت اور شفقت کے ساتھ تحریر فرمایا "آپ اس نظم نویسی کے چکر میں کہاں پڑ گئے۔ یہ آپ کے مرتبہ سے گری ہوئی چیز ہے کچھ محنت کیجیے، اور مقالہ نویسی پر توجہ کیجیے۔ قوم کو آپ سے اسی کی توقع ہوسکتی ہے۔ اور یہی ہونی چاہیے۔"

مولانا موصوف پر اس خط کا یہ ردعمل ہوا کہ بقول ان کے میں نے مولانا کے گرامی نامے کے جواب میں یہ شعر لکھ دیا۔

کون ہوں، کیا ہوں، کہاں ہوں، سب حقیقت کھل گئی
تونے وہ ٹھوکر لگائی چشم علت کھل گئی

راقم احقر کی نظر سے مذکورہ بالا شماروں میں مولانا مرحوم کی چار غزلیں جولائی سنہ ۱۹۳۹ء، نومبر سنہ ۴۲ء، دسمبر سنہ ۵۲، اگست ۵۷ء گذریں۔

مندرجہ بالا فہرست چونکہ مختلف اوقات میں نقل کی گئی اسلیے تسلسل قائم نہ رہ سکا یہی صورت وفیات کی بھی رہی۔

ڈاکٹر نورالبنی مرحوم

(حمید نسیم رفیع آبادی، ایم، اے، علی گڑھ)

ڈاکٹر نورالبنی صاحب ۷، جنوری ۱۹۸۳ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے، مرحوم ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو بہار میں پیدا ہوئے، انھوں نے ۱۹۵۲ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی، اے آنرس (فلسفہ) میں کیا، اور ۱۹۵۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم، اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا، ۱۹۵۸ء میں موصوف نے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ہی سے ڈاکٹر عمرالدین مرحوم کی نگرانی میں P.H.D کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۵۷ء میں لکچرر مقرر ہو گئے۔ اور ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر صاحب یہاں ہی ریڈر ہو گئے۔ م۔م ڈاکٹر صاحب نے Visiting professor کی حیثیت سے اولڈ ڈومینین old Dominion، نارفاک (Norfolk) شکاگو ڈیاب (Deals) اور مسلم کمیونٹی سینٹر شکاگو (امریکہ) میں لکچر دیے مرحوم نے فلسفہ اور مذہب سے متعلق کم و بیش ۲۲ کانفرنسوں میں شمولیت فرمائی جو ہندوستان اور بیرونی ممالک مختلف جگہوں پر منعقد ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب کے چالیس سے زیادہ مقالات مختلف فلسفیانہ مذہبی، دینیاتی اور صوفیانہ موضوعات پر ہندوستان اور دنیا کے مشہور علمی رسالوں میں چھپے آپ کی تین باقاعدہ کتابیں ہیں انکی کتاب ——— علمی حلقوں میں خاصی مقبول ہوئی۔ مرحوم حال ہی میں امریکہ میں کئی کانفرنسوں میں شمولیت کی غرض سے تشریف لے گئے تھے وہاں ہی ان کے بائیں پاؤں میں زخم ہو گیا، اور ذیابیطس

کے مرض میں پہلے ہی سے مبتلا ہونے کی وجہ سے اس زخم نے خطرناک صورت اختیار کرلی اور آخر کار یہی ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا آخری زخم ثابت ہوا۔

نورالنبی صاحب کا منصوبہ تھا کہ وہ مسلم فلسفہ اور اسلامی تصوف کے اصلی ماخذ تک رسائی کے ذریعے سے مسلمانوں کے عظیم علمی کاموں اور کارناموں کی از سرِ نو تفتیش کا گرانبار کام انجام دیں اس سلسلے میں آپ نے مختلف موضوعات جیسے ارسطو اور ابن رشد، شاہ ولی اللہ دہلوی، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ہمدان میر سید علی ہمدانیؒ، گیسو دراز، بابا فرید صاحبؒ، محمد جائسی وغیرہ جیسی اہم اور عہد ساز شخصیتوں اور ان کے فلسفوں اور تعلیمات کو اپنی صحیح اور اصل صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے کام کا آغاز بھی کرایا تھا۔ اس کے علاوہ مرحوم کے پیش نظر غزالی کی "تہافۃ الفلاسفہ" کے تنقیدی جائزے اور ابن عربی کے فلسفہ "وحدۃ الوجود" پر کام کے بھی منصوبے تھے کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ لوگوں نے ابن عربی کو غلط انداز سے سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ کہتے تھے کہ اگر ان کے فلسفہ کے اصل ماخذ سے مدد لے کر جائزہ لیا جائے تو ان کے متعلق شکوک و شبہات دور ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ابن رشد کی کتاب "فصل المقال" کا اردو میں ترجمہ کرایا، اس پروجیکٹ کے لئے U.G.C. نے گرانٹ بھی منظور کرلی تھی۔ مگر نہ معلوم قدرت کو کیا منظور تھا کہ ڈاکٹر نورالنبی صاحب صرف ۵۲ سال کی عمر میں ان تمام اہم منصوبوں کو ادھورا چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہوگئے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم بہت سارے محاسن حسنہ کا مجسمہ تھے، سب سے بڑی خوبی جو ان میں تھی وہ یہ تھی کہ ان کو اپنے مذہب اپنی تہذیب اور اپنے شاندار علمی ورثے کی عظمت کا احساس اور اسکے احیاء کا جذبہ تھا وہ مغرب کے فلسفہ اور علوم جدید میں اسکی ترقی سے مرعوب نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ فلسفہ پڑھنے اور پڑھانے کے باوجود انھوں نے کبھی بھی مذہب اور تصوف کے موضوع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ ہر موقع پر فلسفہ کی مدد سے مذہب کو جاندار انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

وہ مغرب کے اندھے مقلد نہ تھے، بلکہ اسکے برعکس ان کو اپنے مذہب اپنی تہذیب اور اپنے اسلاف کے کارناموں کے ساتھ ایک والہانہ لگاؤ تھا، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حکمت اور فلسفہ کے ان سرچشموں کا کھوج لگانا شروع کیا تھا جو ہمارے مسلمان حکماء اور فلاسفہ نے بڑی کاوش اور محنت سے فراہم کیے ہیں۔ نور النبی صاحب مرحوم ان لوگوں کی طرح نہیں تھے جو احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اپنے ماضی اور مذہب سے کنارہ کش ہو کر مغرب سے بلند ہونے والی ہر آواز پر فریفتہ ہوتے اور بقول سارتر (Sartre) ان مرعوب دانشوروں کی طرح نہ تھے جو اپنے لوگوں کو پیرس، لندن اور امسٹرڈم (Amsterdam) سے بلند ہونے والی آواز (PARA "THERHWD" اور "THE NIN" پر "PARATHE" "Mood-THERHWD" کی صدائے بازگشت دیتے اسکے برعکس انکو یقین تھا کہ مسلمان فلسفیوں حکماء اطباء اور صوفیاء کے کارنامے بذات خود اتنے دقیع اور قابل قدر ہیں کہ یہ ہم کو مغرب کے تمام ملحدانہ اور مادہ پرستانہ فلسفوں سے نہ صرف بے نیاز کر سکتے ہیں بلکہ ہماری ہمہ جہت ترقی اور کامیابی کے محرک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر مرحوم کا یہ بھی ادعان تھا کہ موجودہ علوم و فنون اور فلسفہ میں مغرب نے جو ترقی کی ہے اسکی بنیاد سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی رکھی تھی اور مغرب نے اسی بنیاد پر اپنے علمی کارناموں کو مرتب کیا۔ مگر اپنے اولین معلمین مسلمانوں کے بجائے ساری علمی ترقی کا سہرا اپنے سر باندھنا چاہا، یہی وجہ تھی کہ نور النبی صاحب چاہتے تھے کہ مسلم فلسفہ اور دوسرے علوم کو اپنے بنیادی ماخذ (ORIGINLS OURLES) سے حاصل کرکے تحقیق و تفتیش کے بعد دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ مسلمان مرعوبیت اور احساس کمتری سے نکل کر اپنے تہذیبی اور مذہبی ورثے کو نہ صرف محفوظ رکھ سکیں بلکہ اس کو ادو ترقی بھی دے سکیں۔

مرحوم ڈاکٹر صاحب دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں پر ٹوٹنے والی مصیبتوں اور مظالم کی خبریں سنکر بے چین ہو جاتے تھے، اور وہ باقاعدہ دنیا کے حالات اور خصوصًا مسلمانوں کے حالات سے مکمل آگہی رکھتے تھے، اور جب کبھی ان کو موقع ملتا کہ وہ ان حالات پر تبصرہ کریں تو ان کے دلسوزی اور ہمدردی میں ڈوبے ہوئے الفاظ سامعین کے دلوں کو چھو جاتے تھے، اور ان میں خود بخود کچھ کرنے کا جذبہ بیدار ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مرحوم غریبوں، مسکینوں اور فورتھ گریڈ ملازمین طبقہ کے ساتھ بہت ہمدردی رکھتے تھے، اور ان کے دکھ درد میں برابر کے شریک حال رہا کرتے تھے نہ صرف خود انکی مدد کرتے بلکہ اپنے سے وابستہ گوناگوں قسم کے لوگوں اور شاگردوں کو بھی ان کی مدد کرنے پر ابھارتے تھے، اپنے شاگردوں کی مدد کرنا ان کی پڑھائی اور دیگر کاموں کے متعلق ان کو مشورے دینا اور رہنمائی کرنا، اور ان کے ساتھ انکی اخلاقی و دینی لحاظ سے تربیت کرنا اور انکی صلاحیتوں کو نشوونما دینا ڈاکٹر صاحب کی بہت ساری خوبیوں میں سے چند نمایاں خوبیاں تھیں مرحوم اس شعر کے حرف بہ حرف مصداق تھے؛

؎ درغم دیگر بسوز و دیگراں راہم بسوز،

محنت اور عمل مرحوم کی زندگی کے دو مستقل اصول تھے، وہ نہ صرف اس پر خود کاربند رہتے تھے بلکہ اپنے ساتھ کام کرنے والے تمام لوگوں کو بھی انہی زیورات سے آراستہ کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے،

اسلام کے ساتھ نور النبی صاحب کو والہانہ عقیدت تھی، چنانچہ اسلام پر مختلف حلقوں اور مغرب زدہ اور مارکسسٹ "مسلمانوں" کی طرف سے ہونے والے حملوں کا مرحوم مسکت جواب دیتے تھے، اپنے شاگردوں کو ہر وقت ڈاکٹر صاحب اسلام کے ساتھ چمٹے رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے، اور اسلامی احکام پر عمل آوری کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے ساتھ مرحوم کو بے پناہ

محبت اور عشق تھا عشق رسولؐ نے آپ کو اتنا گرویدہ بنا دیا تھا کہ جب بھی کسی کی طرف سے رسول اللہؐ یا صحابۂ رسولؐ کے بارے میں کسی معمولی قسم کا اعتراض یا انکی شان میں سوئے ادبی کا ادنیٰ سا مظاہرہ دیکھتے تو بے چین ہو جاتے تھے اور گرجتی ہوئی آواز میں معترض پر برستے تھے چنانچہ اپنے مرض الموت میں ڈاکٹر صاحب مرحوم راقم اور حیات عالم کو بار بار زیارۂ قبر النبیؐ سے متعلق احادیث تلاش کرنے کے لئے کہتے اور جب ہم نے ان کو "من زار قبری وجبت له شفاعتی" والی حدیث سنائی تب جا کے ان کو اطمینان ہوا۔

آخر میں ڈاکٹر نور النبی مرحوم کے متعلق صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی ایک یادگار تھے، ان کے علمی اور تعلیمی منصوبے اتنے عظیم اور اہم تھے کہ جیسے وہ اسلامی فلسفہ اور تصوف کی از سر نو تدوین و تجدید کرنا چاہتے ہوں، اگرچہ مرحوم اب ہم میں موجود نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود ۵۲ سال کی مصروف ترین زندگی گزار کر انھوں نے کام کرنے والوں کے لئے نمونہ اور مثال چھوڑی، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازدے اور ان کے ادھورے چھوڑے ہوئے مفید علمی کاموں کو آگے بڑھانے کا جذبہ ہمارے دلوں میں پیدا کرے ؎

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ تیری نگہبانی کرے

ایڈز "AIDS"

(عارضہ نقصان مناعت "شبق وغلمہ") کا

قدیم یونانی تصور

قرآن حکیم اور میڈیکل سائنس کی روشنی میں

اقبال احمد قاسمی، ایم، ڈی (علم الادویہ)[1]

تعارف مرض ایڈز "AIDS" ایک نہایت ہی بھیانک صورت حال کا نام ہے جو لوگ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب فرد تصور کرتے ہیں آج وہی لوگ اس مہلک بیماری کا شکار اور عتاب خداوندی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ انہیں امریکہ اور یورپ کے علاوہ وہ اقوام بھی شامل ہیں جو ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

قدیم یونانی حکماء اور عرب اطباء نے اس طرح کی بیماریوں کے خطرات سے انسانیت کو بہت پہلے ہی خبردار کر دیا تھا ان کی کتابوں اور طبی تصانیف میں جگہ جگہ اس کا

---

[1] اقبال احمد قاسمی، سی ۲۸، میڈیکل کالونی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

PIN 202001 (یوپی)

ذکر ہے اس کو اطبار نے "شبق وغلمہ" کا نام دیا تھا، قرآن پاک میں بھی اس طرح کی متعدد آیات ملتی ہیں جن میں انسانیت کو اس مہلک مرض سے بچنے اور بچانے کی بار بار تلقین کی گئی ہے۔

قرآن حکیم میں اس کا ذکر

ولما جاءت رسلنا لوطا سیئ بھم وضاق بھم ذرعا وقال ھذا یوم عصیب۔ وجاءہ قومہ یھرعون الیہ ومن قبل کانوا یعملون السیات قال یا قوم ھؤلاء بناتی ھن اطھر لکم فاتقوا اللہ ولا تخزون فی ضیفی الیس منکم رجل رشید۔ (سورۃ ھود۔ آیات ۷۷-۷۸-

— ونجیناہ ولوطا الی الارض التی بارکنا فیھا للعلمین۔

(سورۃ انبیاء ایت ۷۱)

— ولوطا اتیناہ حکما وعلما ونجینہ من القریۃ التی کانت تعمل الخبئث انھم کانوا قوم سوء فاسقین۔ وادخلناہ فی رحمتنا انہ من الصلحین۔ (سورۃ انبیاء ایت ۷۴-۷۵-

اذ نجینہ واھلہ اجمعین۔ الا عجوزا فی الغابرین۔

(سورۃ صفت ایت ۱۳۴ - ۱۳۵)

قال ان ھؤلاء ضیفی فلا تفضحون۔ واتقوا اللہ ولا تخزون۔ قال ھؤلاء بنتی ان کنتم فاعلین۔

(سورۃ الحجر آیت ۶۸، ۶۹، ۷۱-

— اذ قال لھم اخوھم لوط الا تتقون۔ انی لکم رسول امین۔ اتاتون الذکران من العالمین۔ وتذرون ما خلق لکم ربکم من ازواجکم بل انتم قوم عدون۔

(سورۃ الشعراء آیت ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۵، ۱۶۶)

— رب نجنی واہلی مما یعملون۔ فنجینٰہ واہلہٗ اجمعین۔ الا عجوزًا فی الغابرین، ثم دمرنا الآخرین۔

(سورۃ الشعراء، آیات ۱۶۹-۱۷۰-۱۷۱-۱۷۲)

— ولوطًا اذ قال لقومہ انکم لتاتون الفاحشۃ الآیۃ ائنکم لتاتون الرجال وتقطعون السبیل الآیۃ۔ انا مہلکوا اہل ھذہ القریۃ ان اہلہا کانوا ظالمین۔

(سورۃ العنکبوت، آیات ۲۸، ۲۹-۳۱-)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ملتی ہیں جن میں اس طرح کی جنسی بے راہ روی اور فطرت کے اصولوں کی خلاف ورزی کی ممانعت کی گئی ہے اور بنی نوع انسان کو ہلاکت سے بچنے کے لئے ہدایت کے راستے دکھائے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن پاک زندگی کے تمام شعبوں کے لئے ایک مکمل لائحہ عمل اور نظام حیات ہے۔ ہم جنسی جیسے شنیع کام سے اگر انسانوں کو روکا گیا ہے تو اسکے پیچھے یقینًا کوئی بہت بڑا سربستہ راز تھا جس میں انسانیت کی فلاح اور بنی نوع انسان کی بھلائی پوشیدہ تھی، نوم ویقظہ، اکل وشرب اور طہارت ونجاست کے جہاں تمامتر اصول اس دائرۃ المعارف میں بیان کیے گئے ہیں وہیں پر جملہ طرح کی بیماریوں اور ہمہ نوعی مضرتوں سے انسان کو محفوظ رہنے کے لئے ایک مکمل ضابطہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

جدید تحقیقات اور سائنسی ترقیات نے رفتہ رفتہ ان تمام قرآنی تعلیمات کو محقق ثابت کر دیا ہے جنھیں اب سے کم وبیش ڈیڑھ ہزار سال پہلے خدا نے اپنے برگزیدہ نبی کے توسط سے انسانوں کے سامنے صرف پیش ہی نہیں کیا تھا بلکہ "لعلکم تتفکرون" اور "فاعتبروا یا اولی الابصار" جیسے واضح الفاظ میں دعوت فکر بھی دی تھی،

عورتوں کو چھوڑ کر کسی سے جنسی ملاپ کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے اس

خرابی کے باعث انسان کسی بھی مرض کا شکار ہو سکتا ہے کیونکہ ایڈز میں انسانوں کی قوت مدافعت و مناعت ختم ہو جاتی ہے جسکی وجہ سے کینسر اور دیگر جلدی امراض بھی ہو سکتے ہیں۔

اطبائے قدیم کے نظریات

یہ بیماری آج کی کوئی نئی دریافت نہیں بلکہ ابوبکر محمد بن زکریا رازی کے استاذ اور طبی دنیا میں اپنے دور کے ایک اہم ستون، ابوالحسن علی بن زین الطبری نے اپنی مایہ ناز کتاب فردوس الحکمۃ میں پانچویں مقالہ کے چھٹے اور ساتویں باب میں صفحہ ۱۱۱ و ۱۱۲ پر ایڈز کے سلسلے میں بڑے واضح الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے ایڈز کے مریض کا علاج، احتیاطی تدابیر پرہیز اور دوسرے پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ طبری لکھتے ہیں :

عربی	اردو
من تاذی بالشبق والغلمة	جس کو شبق وغلمہ (ایڈز) کی شکایت ہو اس کو
فلیتشاغل عنه بالنظر فی الآداب	بدفعلی سے باز رہنا چاہئے۔ اور کم از کم اخلاقی
وغیرها ویغتذی بکل شی بارد	اصولوں کے پیش نظر اس سے احتراز کرنا چاہئے
ویتباعد من النساء او یشد	ایسے مریض کو بارد یابس غذاؤں کا استعمال
علی ظهره صفیحة من رصاص	کرنا چاہئے، اور عورتوں سے مجامعت نہ کرے یا اپنی کمر پر رانگ کی پلیٹ باندھے۔

چنانچہ جدید تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ جنسی ملاپ کرنے والوں میں اسّی فیصدی ۸۰٪ کو ایڈز کی شکایت ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح کے مردوں کے رابطہ میں آنے والی عورتوں میں بھی تعدیہ کے نتیجہ میں یہ بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔

داؤد دالا نطاکی کی مایہ ناز تالیف "النزهة المبهجة فی تشحیذ الاذهان وتعدیل الامزجة" میں بھی بڑی تفصیل کے ساتھ اس مہلک مرض کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اس سے حاصل شدہ معلومات ہمارے لئے اور بھی دلچسپی کا سبب اس لئے ہیں کہ مصنف نے شیخ الرئیس ابن سینا کا قول نقل کرتے ہوئے "جماع غلمان" کا نقص اور اس کی مضرتیں بیان کی ہیں۔ کتاب الباب الثالث فی

کیفیۃ الغایۃ وھو الجماع "میں تحریر ہے۔

قال الشیخ ویستنبط مما ذکر اعدم الجماع بالحائض والآئسۃ والطفلۃ وغیر ذلک) فساد الجماع فی الادبار، فانھا لم تخلق بشھوۃ بل تحتاج الی عنف الحرکۃ ولم تستفرغ الماء فتسقط بالوجہ الاول القوۃ وتوجب بالثانی فساد البدن بما بقی من الماء ولھذا یسقط قبل من انھا موفرۃ للقوی مفوۃ استفراغھا المنی۔

شیخ کا قول ہے کہ مذکورہ بالا باتوں (حائضہ آئسہ اور بچی سے جماع نہ کرنا) کی روشنی میں جماع غلمان کی خرابی مستنبط ہو جاتی ہے کیونکہ انسان کی دبر شہوت کی تکمیل کے لئے نہیں بنائی گئی ہے بلکہ اس میں تو زبردستی کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جسکی وجہ سے منی کا مکمل طور پر اخراج بھی نہیں ہو پاتا، لہٰذا زبردستی کرنے کے نتیجہ میں (انسان کی) قوت زائل — و ساقط ہو جاتی ہے اور استفراغ کلی نہ ہونے کی وجہ سے فساد بدن لاحق ہوگا کیونکہ مادہ منویہ خارج نہیں ہو سکا لہٰذا اس سے وہ تصور باطل ہو جائیگا جس میں اس کو صرف منی خارج ہونیکی وجہ سے مزید قوی خیال کیا گیا ہے۔

چونکہ یہ ایک غیر طبعی فعل ہے اور اکمال شہوت کے باوجود منی کا اخراج نہیں ہوتا اسی لئے قوت (مناعت) ساقط و باطل ہو جاتی ہے اور بدن میں فساد و امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ ایک انوکھی بات یہ بھی ہے کہ قدیم اطباء میں کچھ لوگ ہم جنسی کو انسان کی قوت و طاقت میں اضافہ کا باعث تصور کرتے تھے، کیونکہ اس میں ان کے نزدیک استفراغ منی ہوتا تھا۔ لیکن شیخ الرئیس ابن سینا نے اسکی پُر زور مخالفت کرتے ہوئے مزید لکھا ہے کہ مذکورہ وجوہات کی روشنی میں وہ تصور اور نظریہ باطل ہو جاتا ہے جس میں تصور کیا گیا ہے کہ ہم جنسی

مزید و موفر قوت ہے۔

حکیم حیدر علی خان اپنی فارسی تصنیف "تسہیل العلاج" میں شعبۂ دوم در جماع کے ذیل میں رقمطراز ہیں:

وجماع غلمان از بسکہ استفراغ غیر طبعی است اگرچہ اخراج منی قلیل بود ولیکن ضعف آرد، مضر باشد۔

لڑکوں سے جماع کرنا چونکہ ایک غیر طبعی استفراغ ہے باوجود کہ اس میں اخراج منی کم ہوتا ہے لیکن یہ ضعف پیدا کرتا ہے اور اس طرح کا فعل مضر صحت ہے۔

لڑکوں کے ساتھ جماع کرنے سے ضعف لاحق ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک غیر فطری عمل ہے اور قدرت نے غیر طبعی افعال کے ارتکاب سے منع کیا ہے ورنہ اس کے برے نتائج سامنے آئیں گے، جس سے انسان کو اپنی صحت اور اپنی جان بچانی مشکل ہو جائیگی۔

علی بن زین الطبری نے اس موضوع کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اور اپنی کتاب "الایضاح عن السمن والھزال"[1] میں "جماع فی الادبار" سے ایک باب بھی قائم کیا ہے۔

جدید تحقیقات اور قدیم نظریات سے ان کا تطابق

ابتک کی تحقیقات کے مطابق صرف امریکہ میں تقریبا ۵۱۰۷ افراد اس مرض کا شکار ہو چکے ہیں[2]۔ ابھی یہ چیز تحقیق طلب ہے کہ اس میں

---

[1] ہمارے محدود وسائل اور ذرائع کے مطابق ہندوستان کے مشہور کتابخانوں میں (بھی) اس کے نسخے نہیں ملتے۔ (اقبال احمد قاسمی)

[2] دنیا بھر میں ایڈس کے مریضوں کی تعداد ۲۰ ہزار ۸۸ ہو گئی ہے عالمی صحت تنظیم کے مطابق ۵۷ میں سے ۴۲ ممالک نے رپورٹ دی ہے کہ انکے یہاں ایڈس کا کوئی مریض نہیں ہے (اقبال احمد قاسمی)

کون سے جراثیم اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان ملکوں میں جہاں ہم جنسی عام ہو یا صفائی کا خیال نہ رکھا جاتا ہو وہاں اس مرض کے بہت تیزی سے پھیلنے کے امکانات ہوتے ہیں اس کا پہلا شکار مفعول ہوتا ہے اس سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم جنسی کی وبا کو ختم کیا جائے جسکی تائید علی بن زین الطبری کے قول " فلیتشاغل عنہ بالنظر فی الآداب وغیرھا " سے ہوتی ہے۔

ایڈز کی دریافت سب سے پہلے امریکہ میں اس وقت ہوئی جب ایک امریکی سائنسداں نے ـــــ HUMAN. T. CELL. LEUKAEMIA. VIRUS ـــــ دریافت کیا، اس فیروس VIRUS کو LAV بھی کہتے ہیں۔ جو رقیق مادوں کے ذریعہ جسم انسانی میں داخل ہو جاتا ہے، مادۂ منویہ اس طرح کے فیروس کے جسم میں پھیلنے کا سب سے اہم سبب بنتا ہے، یہ فیروس۔ آنسو، خون، مادۂ منویہ، اور لعاب دہن میں پایا جاتا ہے۔

چونکہ اس میں انسان کی قوت مناعت جو ایک قدرتی عطیہ ہے کمزور یا ختم ہو جاتی ہے اور طبیعت کا مدافعانہ عمل ضعیف پڑ جاتا ہے اسلئے جسم انسانی میں تعدیہ کو قبول کرنے کی استعداد بڑھ جاتی ہے اور انسان میں ضعف، بطلان عمل اور تعطل آجاتا ہے نیز اس میں تھکاوٹ اور فعلی نقص بھی ہو سکتا ہے چنانچہ جس نظریہ کو حکیم حیدر علی خاں نے پیش کیا ہے اور جس ضعف کی طرف ان کا اشارہ ہے یا جس کو ابن سینا نے سقوط قوت کا نام دیا ہے اس کو ہم دوسرے الفاظ میں نقصان اور ضعف مناعت سے تعبیر کریں تو بات اور بھی واضح ہو جائے گی۔

اس مرض کے فیروس کٹی ہوئی جلد اور غشاء مخاطی وغیرہ کے راستے بہت جلد اپنا تعدیہ پھیلاتا ہے۔ اگر مائیں اس مرض میں مبتلا ہوں تو ان کے نوزائیدہ (بچوں) میں بھی اس کا تعدیہ پایا جائے گا، جو خون کے ذریعہ ان بچوں میں آجاتا ہے، مادۂ منویہ اور خون کے

ذریعہ اس فیروس کا نقل وحمل زیادہ عام ہے فرانس میں بعض سائنسداں جسم انسانی میں لازمی قوت مناعت کو قائم رکھنے اور اس کو مستحکم بنانے کے لئے تحقیقات کر رہے ہیں نیز مغربی دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی اسی طرح کی احتیاطی تدابیر اور تدارک کے راستے تلاش کیے جا رہے ہیں۔

ایک ضروری تشریح اس موقع پر دو قرآنی الفاظ کی تشریح کرنا چاہوں گا، ایک لفظ "خبیث"، اور دوسرا لفظ "طاہر"۔ "جماع غلمان" کو قرآن حکیم میں لفظ "خبیث" کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور جدید تحقیقات سے یہ بات واضح ہے کہ اس فعل کے نتیجہ میں کینسر (سرطان) ہو جاتا ہے۔ اور کینسر کی انتہائی ردی قسم "سرطان خبیث" سے تعبیر کی جاتی ہے جبکہ دوسری طرف جماع بالنساء کیلئے "ھن اطہر لکم" کا لفظ قرآن میں آیا ہے" اور طہر طہارت یا التطہیر کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ عورتوں کے ساتھ مباشرت بے خطر اور بے ضرر ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے تعدیہ (INFECTIONS) سے محفوظ رہنے کی ضمانت بھی ہے۔

علاج تنبیق وعلمہ میں سرد وخشک تدابیر کو اختیار کرنے کی سفارش کی گئی ہے نیز دافع تعفن کی بھی ہدایت ملتی ہے چنانچہ ان حالات میں اطباء نے جن دواؤں کے استعمال کی طرف رہنمائی کی ہے ان میں اکثر ادویہ محلل اورام، مقوی ومحرک اعصاب دافع تعفن ہیں۔ ابن الطبری نے تخم سنبھالو (فنجنکشت) اور تخم سداب کا سفوف پھانکنے کی ہدایت کی ہے۔ نیز تخم کاہو اور تخم شہدانہ ۴، ۴ گرام کا استعمال مفید بتایا گیا ہے۔

احتیاطی تدابیر:- اس فعل کریہہ سے باز رہا جائے، اس بیماری کی دریافت کو ابھی چند ہی سال گذرے ہیں چنانچہ اس سے تحفظ کے لئے امریکی ممالک میں اب مریضوں کو خون چڑھانے سے پہلے وائرس H.T.L.V.3 کی جانچ کرائی جاتی ہے اس کا خیال رکھا جائے کہ مریض کے استعمال میں آنے والی تمام اشیاء علیحدہ رکھی

جائیں۔ استعمال میں آنے والی تمام چیزوں کو ممکن حد تک گرم پانی میں اُبال کر لیا جائے تاکہ بیماری کے تعدیہ کا اندیشہ نہ رہے مریض کی جسمانی صفائی و پاکیزگی کا پورا خیال رکھا جائے۔

غذا :۔ مریض کو محرک اعصاب، مسمن بدن اور مقوی اعصاب غذائیں دیں۔

مآخذ

(۱) القرآن الحکیم :۔

پارہ ۱۲، سورہ ہود، آیت ۷۷، ۸۰،

پارہ ۱۴، سورۃ الحجر آیت ۶۸، ۶۹، ۷۱،

پارہ ۱۷، سورۃ الانبیار آیت ۷۱، ۷۴، ۷۵

پارہ ۱۹ سورۃ الشعرار آیت ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۹

۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲،

پارہ ۲۰ سورۃ العنکبوت آیت ۲۸، ۲۹، ۳۱، ۳۴،

پارہ ۲۳، سورۃ صٰفّٰت آیت ۱۳۴، ۱۳۵،

(۲) فردوس الحکمۃ :۔

علی بن سہل ربن الطبری، المقالۃ الخامسۃ الباب السادس والسابع

صفحہ ۱۱۱-۱۱۳، مطبع آفتاب برلن۔ سن اشاعت، ۱۹۲۸ء

(۳) النزھۃ المبتہجۃ فی تشحیذ الاذہان وتعدیل الامزجۃ (عربی مخطوط)

داؤد بن عمر الانطاکی، الطبیب الضریر باب فی کیفیۃ الغایۃ وھو الجماع

ورق ۷۱۔

(۴) تسہیل العلاج :۔ حکیم حیدر علی خاں، شعبہ دوم در جماع، صفحہ ۲۲، ۲۳،

مطبع مصطفائی ۱۳۰۹ھ ...

ابوعثمان عمرو بن بحر الجاحظ ـ ایک صاحب طرز انشا پرداز

محمد علاء الدین، استاذ، مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ

جاحظ کی خلقت، ہیئت اور حالات زندگی

جاحظ کا پورا نام ابوعثمان عمرو بن بحر بن محبوب ہے ۱۵۵ھ میں بصرہ میں عدم سے عالم فانی میں چشم کشا ہوا، اور وہیں نشو و نما پائی۔ ان دنوں بصرہ گہوارۂ علم اور گلزار ادب بنا ہوا تھا۔ اس عالمانہ فضا میں جاحظ نے اصمعی اور ابوعبیدہ جیسے علامۂ وقت کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا جو آسمان لغت و روایت اور تنقید و تبصرہ کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ ابواسحاق معتزلی سے علم کلام حاصل کیا۔ ان کے علاوہ عرب کے بہت سے انشا پردازوں اور مترجموں سے استفادہ علمی کیا۔ مطالعۂ کتب کا شوق اس کو جنون کی حد تک تھا۔ اپنی اس علمی تشنگی کو بجھانے کے لئے وہ محرروں اور کاغذ فروشوں کی دکانیں کرایہ پر لے لیتا اور غرق مطالعہ رہتا۔ جو کتاب اس کے ہاتھ لگ جاتی اس کا رس چوس لیتا۔ اسی وجہ سے وہ مختلف علوم و فنون کا رازداں اور انشاء میں طرز جدید کا موجد اور قابل تقلید بن گیا۔

جاحظ کی صورت ایسی تھی کہ شریر بچوں کو خاموش کرنے کے لئے اس کی تصویر پیش کی جا سکتی ہے۔ بدشکل چہرہ، بے ڈول جسم اور ابھری ہوئی بدنما آنکھیں اس کی

صورت و ہیئت کا نمونہ ہیں۔ بدوضع ابھری ہوئی آنکھوں نے ہی اس کو ابو عثمان عمرو سے جاحظ (ابھری ہوئی آنکھوں والا) بنا دیا تھا۔ اور یہ جاحظیت اس کی عثمانیت پر اس طرح چھا گئی کہ خواص کو بھی اس کے اسم اصلی کی واقفیت کے لئے بڑی دیدہ ریزی کرنی پڑتی ہے ـــــ عبدالرحمٰن طاہر سورتی نے استاذ احمد حسن زیات کی کتاب تاریخ ادب عرب کے ترجمہ میں صفحہ ۳۶۱ پر ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ جس سے جاحظ کی ہیئت کذائی پہ کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اور اس کی بدشکلی کے مکروہ خدوخال واضح ہو جاتے ہیں۔

"کہتے ہیں خلیفہ متوکل نے جب اس کے علم و فہم کی تعریفیں سنیں تو اسے اپنے لڑکے کا اتالیق بنانے کے لئے سرمن رائی (بغداد کے قریب ایک شہر ہے) میں اپنے پاس بلوایا۔ مگر جب اس کی مکروہ شکل دیکھی تو اسے دس ہزار درہم دے کر واپس کر دیا۔"

جاحظ کی زندگی کا اکثر حصہ فارغ البالی اور عیش و عشرت میں گذرا۔ چونکہ وہ اپنے فاضلانہ مضامین اور رسائل و خطوط کی وجہ سے مقبول خواص تھا۔ مگر مامون، معتصم واثق اور متوکل کے عہد میں معاشی مجبوری اسے بار بار بغداد لے گئی۔ زندگی کے آخری حصہ میں وہ فالج کا شکار ہو گیا۔ جو دن بدن بڑھتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ ۲۵۵ھ میں وہ اسی مرض کی وجہ سے اپنی حیات کے سویں سال میں داعیٔ اجل کو لبیک کہنے پر مجبور ہو گیا۔

جاحظ کا مسلک

ابو اسحاق نظام معتزلی سے تدرس کی وجہ سے وہ اعتزال کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔ وہ مسلک معتزلہ کی حمایت میں تقاریر کرتا اور مضامین لکھتا۔ اور رفتہ رفتہ وہ اس معاملہ میں شدت پسند بنتا چلا گیا۔ وہ مسلکاً اور اعتقاداً صرف عصمت انبیاء کا قائل تھا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ صحابہؓ و تابعین وغیرہم کو عام انسانوں کی طرح سمجھتا تھا، اور ان

کے فضل وکمال کے ساتھ ان میں نقائص وشہوات ونفسانیت کا وجود بھی اس کے مسلک میں شامل تھا۔

جاحظ کا ادبی نظریہ

کتاب علم الادب، مقالات لمشاہیر العرب علی الجزء الاولی من علم الادب، جمع الاب لولیس شیخو الیسوعی، بیروت ۱۸۸۶ء کے صفحہ ۲۱۵ پر "البحث الرابع فی خواص الکلام الحجٌ عن ابن المعتز والزمانی" کے عنوان کے تحت منقول جاحظ کا درج ذیل قول اس کے ادبی نظریہ کی مکمل وضاحت کرتا ہے۔

"قال الجاحظ ان المعنی اذا کان شریفاً وکان اللفظ بلیغاً وکان صحیح الطبع بعید اًمن الاستکراہ منزھاً عن الاختلال مصوناً عن التکلف صنع فی القلب صنیع الغیث فی التربۃ الکریمۃ ومتی فصلت الکلمۃ عن ھذہ الشریطۃ ونفذت من قائلھا علی ھذہ الصفۃ کساھا اللہ من التوفیق ومنحھا من التایید مالا یمتنع من تعظیمھا بہ صدور الجبابرۃ ولا یذھل عن فھمھا معہ عقول الجھلۃ"

جاحظ کے مندرجہ بالا قول سے اس نظریہ کی وضاحت ہوتی ہے۔ کہ وہ ناقص ادب کو کوڑا دان کی خوراک سمجھتا تھا۔ اور وہ صرف ادب برائے ادب کا قائل نہیں تھا بلکہ ادب برائے زندگی کا حامی تھا۔ چونکہ ادب برائے ادب اپنے تمام اوصاف کے ساتھ صرف ذہنی اور دماغی فرحت وبشاشت اور سکون واطمینان کا باعث بن سکتا ہے، دل کو متاثر نہیں کرسکتا۔ یہ خصوصیت صرف ادب برائے زندگی میں پائی جاتی ہے۔ جاحظ ادیب کو ادیب بننے کے لئے نہ صرف قارئین کے قلوب میں اترنے کا قائل ہے بلکہ اپنے ادبی اثرات سے وہ ادیب کو ایسی شمع افروزی کی دعوت دیتا ہے جو قارئین میں انقلاب صالح برپا کردے۔ صنع فی القلب

صنیع الغیث فی التربۃ الکریمۃ"۔

اس کے حاسدین

جاحظ اپنی ادبی بلاغت و فصاحت، زورِ قلم، سلاست و روانی اور مضامین مختلف النوع کے اختراع کے باعث معززین و سلاطینِ وقت کی نگاہوں میں محبوب و مقبول بن گیا تھا۔ اس کی یہ قدر و وقعت اور عزت و عظمت معاصرین کی نظروں میں کھٹکنے لگی۔ اور وہ جاحظ کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے طرح طرح کے مکر و فریب کرنے لگے۔ جاحظ کو اس کا احساس تھا۔ چنانچہ "المحاسن والاضداد" کے صفحۂ اولیٰ پر اپنے حاسدین کے حرکات قبیحہ اور حسد و ڈاہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"انی ربما الفت الکتاب المحکم المتقن فی الدین والفقہ والرسائل والسیرۃ والخطب والخراج والاحکام وسائر فنون الحکمۃ والنسبۃ الی نفسی، فیتواطأ علی الطعن فیہ جماعۃ من اھل العلم بالحسد المرکب فیھم وھم یعرفون براعتہ وفصاحتہ"۔

اس نے آگے چل کر بڑے مزے کی بات یہ کہی ہے کہ امرائے وقت کی نظروں میں میری کتابوں کے سقوط کی صرف کوشش ہی نہیں کی جاتی ہے بلکہ حاسدین میری تالیف و تصنیف کو میرے متقدمین جیسے ابن مقفع اور خلیل وغیرہ کے نام موسوم کر کے میری مساعی کو رائیگاں اور مجھے ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش سے سے بھی باز نہیں آتے ہیں۔

"البیان والتبیین" کے محقق و شارح حسن سندوبی نے اسی کتاب کے صفحہ ۲۵ پر اس قسم کی باتیں تحریر کی ہیں جس سے معاصرین کے بغض و عداوت کا پتہ چلتا ہے۔

"وقد یلمزہ بعضھم بانہ کان کثیر الاستطرادات کبیر

التهافت على الاستشهادات، يحشد بها كتبه ويفخم بها اسفاره ولولا هذا لكانت اقل مما هي عليه"

لیکن انہوں نے لامزین کے الزامات کو بے جا اور لغو قرار دیا ہے اور سے ان کی کج فہمی پر محمول کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"وليس الحال كذالك، ولا الامر على ما ذهب اليه ذالك اللامز، ولكن هذا الحال ان دل على شئ فانما يدل على سعة اطلاع الجاحظ وعلى تبحره في معارفه وعلى حفول صدره بشتى المسائل والمعلومات"

مگر استاذ احمد حسن زیات نے جاحظ کے کلام کے متعلق بدیع کا قول "جاحظ کے کلام میں اشارہ کا بُعد، عبارت کا قرب اور استعارہ کی قلت ہے" نقل کیا ہے ور فرمایا ہے یہ فیصلہ اگرچہ سخت ہے، تاہم بہت جگہوں پر درست ثابت ہوتا ہے۔" (تاریخ ادب عربی از استاذ احمد حسن زیات ترجمہ عبدالرحمٰن طاہر سورتی صفحہ ۳۶۲)

جاحظ کا علمی وادبی مرتبہ

جاحظ کا مرتبہ علمی وادبی اعتبار سے اتنا بلند ہے، جہاں تک تخیل کی رسائی ناممکن ہے۔ الفاظ اپنی وسعت کھو دیتے ہیں۔ ادباء کا زور قلم ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اس موڑ پر آکر سب لوگ پنا قلم شکستہ، اپنے الفاظ تنگ، اپنا تصور و تخیل نارسا اور ذہن مفلوج پاتے ہیں چنانچہ استاذ احمد حسن زیات نے عہد عباسی کے مختلف انشا پردازوں کے علمی و دبی مرتبہ اور قابلیت کا تذکرہ اپنے مختلف الفاظ میں کیا ہے۔ مگر جاحظ کے علمی ادبی مرتبہ کے تعین میں ان کا قلم تھرا گیا ہے۔ دماغ مفلوج اور ہاتھ شل ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور انھیں بے بس ہو کر کہنا پڑتا ہے۔

"اس مختصر سے بیان اور کوتاہ قلم میں یہ قوت نہیں کہ وہ نابغۂ عرب اور مشرق

کے والٹیر کے ادبی تاثرات کو قارئین کے سامنے بیان کر سکے۔ ہمارے لئے صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ "دفور علم، قوت استدلال، بحث کے تمام پہلوؤں پر احاطہ، مقابلہ میں شدت اور کلام کے دل نشین اور بلیغ ہونے کے باعث وہ اپنے تمام ساتھیوں سے سبقت لے گیا تھا" وہ تمام علوم میں زبردست محقق عالم کی طرح سنجیدہ مضامین لکھتا رہا۔ اور یہی سب سے پہلا عربی عالم ہے، جس نے سنجیدہ و مزاحیہ مضامین کی باہم آمیزش اور گفتگو کے موضوعات میں وسعت پیدا کی۔ بہت سی تصانیف چھوڑیں اور حیوانات و نباتات، اخلاقیات واجتماعیات کے موضوع پر بہت کچھ لکھا" (تاریخ ادب عربی از احمد حسن زیات ترجمہ عبدالرحمن سورتی صفحہ ۶۲، ۳۶۱)

ابن العمید جس کے متعلق لوگوں میں یہ مقولہ مشہور ہو گیا تھا کہ "انشا پردازی عبدالحمید سے شروع ہوئی اور ابن العمید پر ختم ہو گئی" اس نے جاحظ کے علو مرتبت کو اپنے طرز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"کتب الجاحظ تعلم العقل اولاً والادب ثانیاً"

حسن سندوبی نے کہا ہے۔

"دھل وقفت عبقریة الجاحظ عند حد اتقان المعانی فی العامة والثقافات الشائعة علی تنوعها حتی عهده؟ کلا فما کانت همته تعرف شیئاً من الحد ودخل لعرفان؟ من اجل هذا عرض لکثیر من المسائل التی لم یفکر فیها احد غیره وفتح للناس ابواباً کثیرة فی امور شتی لم یکن من نقد مه من العلماء والکتاب واهل الادب یحسبونها مما یدخل فی صنوف الادب" (البیان والتبیین صفحہ ۲۰۶)

اس کے آگے حسن سندوبی نے اس کی علویت پر طویل عبارت آرائی کی ہے ــــ سندوبی کی ایک عبارت سے جاحظ کی عبقریت اور وسیع النظری کی

وضاحت اس طرح ہوتی ہے کہ وہ اپنی جس فکر یا رائے کو ناقص سمجھتا تھا، اس کی تردید میں جھجک یا کسی قسم کا عار محسوس نہیں کرتا تھا۔

"هو اول من وضع کتاباً فی فکرة من الفکر او فی رایٍ من الاٰراء ثم نقضه بکتاب آخر، توسعاً منه فی البلاغة وتفنناً فی البراعة او رجوعاً الی مظنة الحقیقة التی قد یکون استبهم علیه سبیلها فی اول الامر وایثاراً للصواب ولم یکن هذا النوع من المؤلفات التی یراجع نفسه فیها۔ بعد وصف الاٰراء والنحل والاهواء"

(البیان والتبیین صفحہ ۹)

جاحظ کی تالیف "المحاسن والاضداد" (مطبعة المعاہد بجوار قسم الجمالیة بالقاہرہ ۱۳۵۰ھ) کے TITLE PAGE پر اسے "امام اہل الادب" لکھا گیا ہے۔

حسن سندوبی نے "البیان والتبیین" میں "الجاحظ تحلیل ادبه وعلمه ونفسیته" کے تحت جاحظ پر جو فاضلانہ اور تفصیلی مضمون لکھا ہے اس سے جاحظ کی حیات کے ہر گوشہ پر روشنی پڑتی ہے۔ مگر اخیر میں چل کر انہوں نے بھی جاحظ کی رفعت مقام کی تعیین میں اپنے عجز کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

"هذا ما ارتأینا من خصائص الجاحظ وهی بلاشك نشذ ور من مزایاه۔ اما م الالمام بماله من صفات واستیعاب ماله من مناقب وسمات، فامر فوق متناول الایدی والاقلام"

(البیان والتبیین صفحہ ۱۵)

جاحظ کی اخلاقی پستی

ENVIORONMENT & HERIDITY، PSYCHOLOGISTS = میں سے کون رجال سازی میں زیادہ موثر ہے، اس باب میں عہد قدیم سے اب

تک الجھے ہوئے ہیں گرچہ وڈ ورتھ (WOODWORTH) نے دونوں کے درمیان جادۂ اعتدال پیدا کرنے کی کوشش ہے، مگر PSYCHOLOGISTS کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے انسان کے جسمانی روحانی ارتقاء و انحطاط کا انحصار ماحول اور خاندان دونوں پر ہے ـــــ مگر جاحظ علمی اور اخلاقی اعتبار سے ماحول کا پروردہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر بصرہ کی عالمانہ فضا نے اسے بے نظیر انشا پرداز بنا دیا تھا تو وہ بغداد کے عیش پرستانہ ماحول کی وجہ سے اخلاقی اعتبار سے نہایت پست بھی بن چکا تھا۔

حسن سندوبی نے جاحظ کی کتاب "البیان والتبیین، حققہ وشرحہ حسن السندوبی" میں اپنے مقالہ "الجاحظ تحلیل ادبہ وعلمہ ونفسیتہ" کے تحت جہاں معترضین کے الزامات کی تردید میں جاحظ کے تبحر معرفت وسعت معلومات اور حفول صدر کا سہارا لیا ہے اور اسے رأس مذہب فی العقائد کے ساتھ ساتھ رأس مذہب فی الادب بھی قرار دیا ہے وہیں انہوں نے اس میں اس کی اخلاقی حالت، کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے :

"اما خصائصہ النفسیۃ ووجہات نظرۃ فی الحیاۃ فقد کان علی ما ظہر منہ میالا بطبعہ الی التحلیل من القیود التی تقف بامثالہ ونظرائہ من معاصریہ عند مقتضیات التقالید وموجبات العادات فہو لم یشأ اتخاذ زوجۃ تشارکہ بأساء الحیاۃ وضراءہا بل انصرف الی اتخاذ الجواری والقینات یتسری منہن بما تطیب بہا نفسہ و یصبو الیہا حسہ یمسکہا ما استقام امرہا معہ" (البیان والتبیین ع[1])

حسن سندوبی کے آئینہ میں جاحظ حتی الوسع لذات حیات فانیہ سے متلطف و متمتع ہونے میں کوشاں نظر آتا ہے۔

"وکان الجاحظ یری الاستمتاع بملاذ الحیاۃ واطایبھا ویطمع فی ان ینال منھا ما یمکن ان تصبوا الیہ اوسع لنفوس البشریۃ املاً و غایۃ"۔ (البیان والتبیین صفحہ ۱۴)

مگر تاریخ ادب عربی از استاذ احمد حسن زیات ترجمہ عبدالرحمن طاہر سورتی، مؤسس انجمن ترقی عربی، پاکستان، ناشر غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۱ء کے صفحہ ۳۶۱ میں جاحظ کے اخلاق کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

"جاحظ طنز و مزاح کا خوگر، نیز مروجہ رسومات و آداب کی ہنسی اڑانے کا عادی تھا تاہم وہ نہایت سلیم الطبع، زندہ دل، شگفتہ مزاج، ظریف اور اپنے دوستوں کا سچا ہمدرد تھا"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ استاذ احمد حسن زیات جاحظ کی ادبی تابناکی میں اس کی اخلاقی تاریکی کو نہیں دیکھ سکے یا انھوں نے چشم پوشی کر کے طلبۂ ادب عربی سے جاحظ کے اس تاریک پہلو کو صیغۂ راز میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جب کہ حسن سندوبی جو اپنے مقالے میں جاحظ کے بڑے معتقد اور پکے وکیل نظر آتے ہیں اور انھوں نے مختلف مقامات پر اپنے دلائل کے ذریعہ جاحظ کے دامن کو داغ دار ہونے سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ اپنے قلم کو درج بالا حقیقت کے انکشاف سے نہیں روک سکے۔ گرچہ انھوں نے اس کی اخلاقی پستی کا سہرا ماحول کے سر باندھا ہے۔

"والحق ان عصر الجاحظ کان عصر الاستمتاع بکل ما تعتلج بہ النفس الانسانیۃ من امانی وامال، ومن خیر وشر، ومن نقص وفضل ومن علم وجھل ومن استقامۃ واستھتار ومن نسک وفتک ومن تقیۃ واسترسال ومن ایمان والحاد ومن خطل وسداد، فکانت

بغداد فی ذالک الدھر اشبہ بلندن وباریس ونیویورک وبرلین وروما، مجتمعۃ فی ھذا العصر فیھا نزعات العقول ومراح الارواح ومراد العیون، وشھوات النفوس۔ وخلجات القلوب غیر ان الجاحظ کان یتناول شھوات نفسہ ونزعات عقلہ ولذائذ قلبہ فی تعقل وتلطف و اتزان"۔

جاحظ کے صرف ذہنی استمتاع کا سبب اس کی خدا ترسی نہیں بلکہ تولیدی صلاحیت کا فقدان تھا جیسا کہ حسن سندوبی نے کہا ہے:

"وقد کان عقیما فلم یعرف انہ ولد لہ ولد"

جاحظ کی سوانح عمری میں دقت بینی ودیدہ ریزی کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب تک وہ فارغ البال اور بغداد سے دور تھا۔ اس کے اندر اخلاقی دنیت بھی نہیں پائی جاتی تھی۔ مگر معاشی مجبوری کی وجہ سے بار بار بغداد جانے کی وجہ سے ایک تو وہ بغداد کی آب وہوا سے متاثر ہوا نیز اپنے آلام ومصائب اور معاشی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ لذات فانی میں غرق ہوتا چلا گیا۔ اور مضطرب شہوات میں اطمینان وکون کی جستجو میں وہ اخلاقی اعتبار سے پستی کا شکار ہو گیا۔

جاحظ بحیثیت موجد

انشا پردازی مظہر عقل وآئینۂ فکر ہے۔ اس کے جامہ جسم میں احوال وکوائف وقت کا عکس جھلکتا ہے۔ یہ سیاست وحضارت سے متاثر ہوتی ہے۔ اور زمانہ کے حالات کے مطابق اس کا طرز بدلتا رہتا ہے۔ انشا پردازی کی اس نیرنگی میں بعض ایسی شخصیتیں بھی ابھرتی ہیں۔ جن کے رنگ میں خود کو رنگنا ادبا اپنے لئے باعث فخر وکمال سمجھتے ہیں۔ جن کا اپنا اسلوب ہوتا ہے۔ متقدمین سے الگ اپنا طرز بیان ہوتا ہے۔ اور جو اس

راہ میں ایسی شمع افروزی کر جاتے ہیں، جس کی روشنی میں متاخرین کی ضیاء، قلم صفحۂ قرطاس پر کواکب و انجم کی شکل میں منتشر نظر آتی ہے۔

عربی آسمانِ صحافت و ادبیت پر جاحظ خورشید کی طرح طلوع ہوا اور اب تک غروب نہیں ہو سکا ہے۔ اسی کی درخشانیت کے سہارے اب تک کے عربی انشا پرداز راہ ادبیت میں رواں دواں ہیں۔

عربی انشاء پردازی میں جاحظ سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے متقدمین انشا پردازوں سے الگ طرزِ جدید کی بنا ڈالی۔ اور اس نے ایسی راہ ہموار کی جس پر چلنا متاخرین نے باعثِ سعادت سمجھا۔ اور جاحظ سے لے کر اب تک انشا پردازی میں کوئی ایسی کتاب عالمِ وجود میں نہیں آئی جو جاحظ کی مرہونِ منت نہ ہو۔ جاحظ کے بعد کی انشا پردازی کا مطالعہ کنندہ فاضل کے اس قول کی صداقت تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے :-

« ما منا معاشر الکتاب الا من دخل من کتب الجاحظ الحادرۃ، وشن علیھا الغارۃ، وخرج وعلی کتفہ منھا کارۃ »

عبد الرحمٰن بن خلدون نے « مقدمہ ابن خلدون » (المطبعۃ الازھریۃ بجوار الازھر بمصر سنہ ۱۹۳۰ء) کے صفحہ ۴۸۹ پر « علم الادب » کے عنوان کے ضمن میں تحریر کیا ہے :-

« وسمعنا من شیوخنا فی مجالس التعلیم ان اصول ھذا الفن واد کانہ اربعۃ دواوین وھی ادب الکاتب لابن قتیبۃ وکتاب الکامل للمبرد » و کتاب البیان والتبیین للجاحظ، وکتاب النوادر لابی علی القالی البغدادی وما سوی ھٰذہ الاربعۃ فتبع لھا وفروع عنھا »

احمد حسن زیات نے عہد عباسی کے انشا پردازوں کو چار طبقوں میں تقسیم کیا ہے

اور دوسرے طبقے کا رئیس جاحظ کو قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

دوسرے طبقے کا رئیس جاحظ ہے۔ عبارت کے آسان اور پُرشوکت ہونے میں اس کا اسلوب پہلے طبقہ سے زیادہ مشابہ ہے۔ لیکن اس طبقہ کے اسلوب کی خصوصیات میں ایک جملہ کو بہت سے مقفی یا غیر مقفی فقروں میں توڑنا، الفاظ اور جملوں میں اطناب، بات میں بات نکالتے چلا جانا، پڑھنے والوں کی اکتاہٹ دور کرنے کے لئے سنجیدہ اور ٹھوس مضامین میں ہنسی مذاق کی آمیزش، مضمون کے تمام گوشوں کو اجاگر کرنا اور مطلب کو کھول کر بیان کرنا، عقل و منطق سے استدلال اور اثنائے عبارت میں دعائیہ جملے لانا ہیں۔ اس طبقہ میں قتیبہ، مبرد اور صولی ہیں۔

(ترجمہ عبدالرحمٰن سورتی صفحہ ۳۴۶)

انہوں نے چوتھے طبقے کا سردار قاضی فاضل کو کہا ہے اور جاحظ کی انشا پردازی سے متاخرین کی اثر پذیری قاضی فاضل کے مذکورہ قول سے واضح ہو چکی ہے۔

جاحظ نے جادۂ انشا پردازی میں جدیدیت کے ساتھ ساتھ ادبی علویت کی ایسی شمع فروزاں کی جس کی ضیا پاشی سے ذرے آفتاب بنتے گئے اور خواص نے انشا پردازی کی کسوٹی جاحظ کی انشا پردازی کو قرار دیا۔

فیقال فی الاسالیب العربیۃ اذا کانت قد بلغت اعلیٰ طبقات البلاغۃ واسمی منازل البیان وکانت واضحۃ المعانی سہلۃ الالفاظ، نقیۃ الکلمات «ھٰذہ عبارۃ جاحظیۃ»، ویقال فی الرسالۃ جمعت حر الکلام الی التبسط فی المعانی وکانت کثیرۃ الافتنان اخذۃ فیہا الموضوعات بعضہا بذوائب بعض، ینتقل فیہا القاری من فن الی فن ومن لون الی لون، ومن معنی مول الی معنی مبتکر ھٰذا ادب جاحظی، (حسن سندوبی البیان والتبیین صفحہ ۱۱)

آگے چل کر حسن سندوبی نے لکھا ہے:

"وما من کاتب منذ عهد الجاحظ الی الآن الا وللجاحظ فی عنقه منة معقودة اوید مبسوطة اونعمة سابغة"

استاذ حسن بن زیات نے جاحظ کے اختراع وایجاد کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"جاحظ انشا پردازی کو پرانے طرز سے نکال کر اسے ایک نئے طرز اور جدید موضوع کی طرف لایا۔ اس نے خط نویسوں، مضمون نگاروں اور مصنفوں کے لئے انشا پردازی میں ایک نیا راستہ کھولا ہے۔ (ترجمہ عبدالرحمٰن سورتی صفحہ ۳۶۲)

اس طرح درج بالا مؤرخین وناقدین کے اقوال سے یہ بات اظہر من الشمس ہوجاتی ہے کہ جاحظ انشا پردازی میں ایک موجد کی حیثیت رکھتا ہے اور اب تک عرب انشا پرداز کسی نہ کسی طرح اس کی اتباع پر مجبور ہیں۔

جاحظ کی تصانیف جاحظ کی تصانیف دو سو سے زائد ہیں۔ اور استاذ ابن العمید کا کہنا ہے "کتب الجاحظ تعلم العقل اولا والادب ثانیا"

مگر اس کی تصانیف میں سے صرف درج ذیل چار کتابیں مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔

کتاب البیان والتبیین، کتاب الحیوان، کتاب المحاسن والاضداد اور کتاب البخلاء۔

اقبال کی شاعری میں عورت کا مقام

کمال جعفری

شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے ہر شعبۂ زندگی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی شاعری انسانی معاشرہ کے لئے چراغِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں تو انہوں نے کائنات کے مختلف مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، لیکن بحیثیت مجموعی ان کی شاعری کا موضوع انسان ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کا پیغام مرد اور عورت کے لئے یکساں ہے۔ اُردو کے دیگر شعراء کرام نے عورتوں سے متعلق جو انداز فکر اختیار کیا ہے اس کے برعکس اقبال کی فکر دور رس بالکل مختلف ہے۔ دراصل اقبال نے قرآن پاک میں مذکور تعلیم نسواں کو عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ عورت ایک پاکیزہ صنف ہے۔ اگر بے پردگی اور بیجا آزادی عورتوں میں راہ پا جائے تو انسانی معاشرہ تباہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے فرنگی معاشرت پر کھل کر تنقید کی ہے۔ اور عورتوں کی بے بسی کا ذمہ دار مردوں کو ٹھہرایا ہے؟

قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں

اقبال نے جب یورپ کا سفر کیا تو فرنگی معاشرے کا چشم دید مشاہدہ کیا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اہل مغرب نے عورتوں کے معاملے میں جو آزادانہ روش اختیار کی ہے اس کے اثرات انسانی معاشرہ کے لئے کتنے تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ اقبال نے ہندوستان اور یورپ کی خواتین کا براہ راست موازنہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی خواتین کو یورپ کی خواتین پر فوقیت حاصل ہے ؎

میں نے اے اقبال یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ وسیماؤں میں تھی

مذکورہ شعر میں "بات" کے اندر بے پناہ معنی اور وسعت پنہاں ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں اقبال نے اس ایک لفظ بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہندوستانی خواتین شرم وحیا اور پاکیزگیٔ نفس کے اعتبار سے یورپ کی خواتین کے برعکس کچھ اور ہی خصوصیت رکھتی ہیں۔

دراصل اقبال ہندوستانی معاشرہ میں عورتوں کی ترقی اور فلاح کے خواہاں تھے۔ اقبال سے قبل ہماری قومی شاعری پیغام نسواں سے یکسر خالی تھی۔ ان کو اس بات کا بحد افسوس ہے کہ ہندوستانی خواتین خواہ نئی ہو یا پرانی دونوں ہی قسم کی تعلیم سے ناآشنا ہیں اور پردہ سے بھی بیگانہ۔ اس سلسلے میں وہ قوم کی غفلت پر نہایت رنج کے ساتھ فرماتے ہیں۔ ؎

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

واقعہ یہ ہے کہ اگر فکر اقبال کے مطابق عورتوں کو ہمارے سماج میں جائز

مقام عطا کیا جائے تو مغرب کی کورانہ تقلید سے ہماری عورتیں نجات حاصل کر کے مردوں کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم برپا کر سکتی ہیں، جس کے فیضان سے ہمارا معاشرہ تہذیب و تمدن کا اعلیٰ نمونہ بن سکتا ہے۔ آج ہمارے معاشرے کا حال کیا ہے؟ ہمارے شاعر، فلسفی، افسانہ نویس اور صورت گر کے اعصاب پر عورت سوار ہے، اقبال معاشرے کی اس بے حسی کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں ؂

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

تاریخ ادب اردو کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ صدیوں سے ہمارے بیشمار شعراء محض گل و بلبل کی شاعری پر اپنا قیمتی سرمایۂ فکر ضائع کرتے چلے آرہے ہیں۔ ایسے شعراء کی اکثریت رہی ہے جنہوں نے محض لب و رخسار، کاکل و مژگاں اور حسن کی بے جا تعریف میں اپنی عمر گنوا دی، حقیقت یہ ہے کہ آج تک اس برائی سے اردو کا دامن پاک نہ ہو سکا۔ اقبال ہمارے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے سماج میں عورت کے رتبے کو پہچانا اور اس کی حیثیت متعین کر کے آنے والی نسلوں کے لئے ایک لائحہ عمل مرتب کر دیا ہے

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنوں
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

ڈاکٹر سر محمد اقبال نے تعلیم نسواں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور ایسی تعلیم

جس کے ذریعہ نسوانیت کا خاتمہ ہو جائے، کبھی حمایت نہیں کی۔ اس سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر بہت واضح ہے ۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بے گانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

اقبال کے مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہمارے بگڑے ہوئے معاشرے کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ آج ہماری درسگاہوں کا حال کیا ہے؟ کو ایجوکیشن کے نام پر تعلیم کا جو حال ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے جہاں تک فکر اقبال کا سوال ہے انہوں نے عورتوں کے مقام کا تعین اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ ان سے پہلے غالباً کسی شاعر نے ایسا انداز فکر اختیار نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر عورتوں کو مردوں کے برابر آزادی مل جائے تو انسانی معاشرہ تباہ ہو جائے، اگر قدرت کو ایسا کرنا منظور ہوتا تو عورت کو ایک الگ صنف کی حیثیت نہ دی جاتی۔ ہاں عورتوں کے جو جائز حقوق ہیں انہیں بلا شبہ ملنا چاہئے۔ عورت بچوں کی پرورش کے علاوہ امور خانہ داری کی (ذمہ داری) قبول کرتی ہے وہ ہمارے گھروں کو پُر رونق بناتی ہے اور زندگی کے عملی میدان میں مردوں کا شانہ بشانہ ساتھ دیتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ میدان جنگ میں بھی عورتوں نے مردوں کا ساتھ دیا ہے اس سلسلے میں بطور مثال اقبال کی ایک نظم "فاطمہ بنت عبداللہ" کا ایک بند پیش کر رہا ہوں جس میں اقبال نے عرب کی ایک غیور خاتون فاطمہ کو دل کی گہرائیوں سے منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ جانباز اور جواں سال فاطمہ نے طرابلس کی جنگ ۱۹۱۲ء میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی میدان جنگ میں شہادت کا جام نوش

کہا تھا ؎

فاطمہ تو آبروئے ملتِ مرحوم ہے
ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں ابھی آہو بہت پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

اقبال نے مغرب نواز جدید تعلیم اور بے پردگی کی ہمیشہ مخالفت کی، اقبال مشرقی علوم و فنون کے قائل ہیں۔ وہ مشرقی علوم کو مغربی علوم پر ترجیح دیتے ہیں۔ لہٰذا تعلیم نسواں سے متعلق اکبر الہ آبادی کے رنگ میں اپنے موقف کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِّ نظر
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ

مدیر مسئول: عمید الرحمن عثمانی

جلد نمبر ۹۸ | محرم الحرام ۱۴۰۷ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۶ء | شمارہ نمبر ۳

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

سالمیت کا تصور کوئی پرانا تصور نہیں ہے، ہندوستان کو متحد کرنے کا خیال سب سے پہلے اورنگ زیب کو آیا، اور اس نے اس مقصد کے لیے آخری ۲۵ سال دکن میں گذارے، اور ان ۲۵ برسوں میں اس کا مقابلہ دکن کی مسلم ریاستوں سے ہوتا رہا جو تقریباً سو برس سے خود مختار چلی آرہی تھیں، اورنگ زیب کی وفات تک اس کا قائم کردہ نظام پانچ چھ برس تک جوں کا توں قائم رہا، اس لیے اس کے جانشین بہادر شاہ اول کے عہدِ حکومت (۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۲ء) تک کسی جگہ پتّہ تک نہیں ہل سکا، اس نظام میں کمزوری اس وقت آئی جب مغل شاہی خاندان میں اقتدار کے لئے کشمکش شروع ہوئی اور تخت کا ہر دعویدار طاقت اور صوبیداروں اور سرداروں کی حمایت کا طلب گار ہوا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف مغلوں کے حکمراں خاندان بلکہ صوبیداروں اور وزیروں میں بھی گروہ بندی اور کشمکش کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوگیا، جس نے طاقت ور صوبیداروں کی خود مختاری، اور حکمرانوں کے انتخاب میں مداخلت کا راستہ صاف کردیا۔ اسی کشمکش کے دور میں سید برادران، حسین علی اور عبداللہ دربار میں اتنے طاقتور ہوگئے کہ جس شہزادے کو چاہتے بادشاہ بنا دیتے، جس بادشاہ کو چاہتے معزول کردیتے لیکن سید برادران کا یہ اقتدار زیادہ دن نہیں چل سکا، اور ۱۷۱۹ء سے

لے کر ۱۷۲۳ء تک کے گیارہ ۱۱ بارہ ۱۲ برسوں تک طوائف الملوکی کی حالت پیدا کرنے کے بعد دونوں بھائی بالآخر محمد شاہ کے زمانے میں قتل کر دیے گئے۔

اگر نادر شاہ کا حملہ ہندوستان پر نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ مغل سلطنت محمد شاہ کے زمانے میں سنبھالا لے لیتی لیکن ۱۷۳۹ء میں دہلی کے قتل عام نے عظیم مغل حکمرانوں کے روایتی رعب و داب کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور صوبوں کی خود مختاری کے اس دور کو شروع کر دیا، جس کی بدولت عظیم مغل حکومت، بغیر ہاتھ پاؤں کے ایک جسد کی طرح ہو کر رہ گئی۔

بنگال میں، جس میں آج کل کے بہار، اڑلیہ اور آسام کا علاقہ بھی شامل تھا، علی وردی خاں نے خود مختاری کا اعلان کیا تو دکن میں نظام نے، جن کی قلمرو میں آج کے کرالا، مدراس، اور مہاراشٹر کا بیشتر حصہ شامل تھا، دہلی کی مرکزی حکومت سے رشتہ توڑ لیا۔ اودھ میں شجاع الدولہ کی حکومت، کانپور اور فتح پور سے لے کر بنارس تک پھیلی ہوئی تھی، خود مختار ہو گئی تو مغل حکمرانوں کے پاس فی الحقیقت دہلی کے سوا کوئی علاقہ ہی باقی نہ رہ گیا جس میں پنجاب شامل تھا۔ ان علاقوں میں سکھوں کی شورش، اور باقی ماندہ علاقوں میں مرہٹوں کی تگ و تاز نے، ہندوستان کو ٹھیک اسی دور میں پہونچا دیا جو قطب الدین ایبک کی آمد سے پہلے موجود تھا، اور جس میں اتنی بے شمار حکومتوں میں یہ ملک تقسیم تھا کہ آج باوجود کوشش کے سبھی راجاؤں کا نام بھی مؤرخوں کے لیے معلوم کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔

مغل حکومت کے زوال اور کمزوری کے دور میں جو خود مختار صوبیدار پیدا ہوئے

ان کے سامنے ملک کے اتحاد اور سالمیت کا کوئی تصور تھا، اس کا جواب بمشکل ہی اثبات میں دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر صوبیدار نہ صرف اپنی حکومت کے تحفظ اور حدود کو برقرار رکھنے کی فکر سے رنجور نظر آتا تھا، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے صوبیدار کو زک پہونچانے اور موقع ہے تو اس کے علاقے کا کچھ حصہ ہتھیا لینے کا کوئی موقع ہاتھ سے دینے پر تیار نہیں ہوتا۔

اس افراتفری اور آپا دھاپی کے دور میں انگریزوں کو اپنی قوت بڑھانے کا جو سنہری موقع ملا وہ اس زمانے کی سیاسی صورت حال میں بالکل قدرتی اور منطقی معلوم ہوتا ہے، اسی کشمکش اور خود غرضی، بلکہ صوبیداروں کے درمیان رشک وحسد کی کیفیات کی بدولت اورنگ زیب کی وفات کے صرف پچاس برس بعد، انگریزوں نے پلاسی کے میدان میں علی وردی خاں جیسے عظیم کمانڈر اور بے مثال منتظم اور طاقتور حکمراں کے جانشین سراج الدولہ کو (۱۷۵۷ء میں) پلاسی کے میدان میں ایسی بے بسی کی حالت میں مبتلا کر کے، شکست دی کہ میر جعفر جیسے اس کے خاندان کے بزرگ افراد، اس کے طاقتور امیروں اور فوجی کمانڈروں کے ساتھ مل کر عین حالت جنگ میں اسے تنہا چھوڑ کر الگ جا کھڑے ہوئے۔ اور انگریزوں کی حمایت کے بل پر شجاع الدولہ نے روہیلوں کی بریلی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

پلاسی کی لڑائی کے بعد ہندوستان کے حکمرانوں کو ایک اور سنہری موقع متحد ہندوستان کی تشکیل کا ملا جب کہ (۱۷۶۱ء میں) احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کا زور توڑ کر ہندوستان کو، اس زمانہ کی سب سے بڑی شورش اور بدنظمی سے محفوظ کر دیا۔ لیکن اس وقت بھی ہمیں، متحد ہندوستان کا کوئی تصور کسی حکمراں کے ذہن میں دکھائی نہیں دیتا کیونکہ اس کے اگلے ہی سال جب ۱۷۶۵ء کے باغی اور اس وقت کے بنگال کے حکمران میر قاسم نے شاہ عالم اور شجاع الدولہ کی امداد اور تعاون کے یقین پر انگریزوں کے

بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کی آخری کوشش کی تو شجاع الدولہ نے انگریزوں کی صرف اودھ کی حکمرانی پر قائم رہنے کی ضمانت پر، عین وقت پر بکسر کے میدان سے اپنی فوجیں واپس بلالیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ عالم اور میر قاسم کو اس فیصلہ کن شکست سے دوچار ہونا پڑا، جس کے نتیجہ میں میر قاسم تو سیاسی منظر سے اس طرح غائب ہوتے کہ آج تک ان کے انجام کا پتہ نہیں چلا اور بکسر کے میدان میں شکست یافتہ شاہ عالم بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں انگریزوں کے وظیفہ خوار بن کر کٹھ پتلی حکمراں کی حیثیت پر اکتفا کرنے پر مجبور کر دیے گئے۔

اگر سچ پوچھئے تو ہندوستان سے مغل حکمران کا خاتمہ ۱۷۶۵ء میں اسی وقت ہوگیا تھا جبکہ الہ آباد کے صلح نامہ کے ذریعہ شاہ عالم نے سیاسی اقتدار انگریزوں کے حوالے کر کے، ایک وظیفہ خوار بادشاہ کی حیثیت سے لال قلعہ میں سکونت اختیار کرنے پر رضامندی دیدی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ایک ایسا منطقی عمل تھا، جس کی بدولت مغلوں کی رسمی سربراہی کی حیثیت رفتہ رفتہ مٹنے کا کام تکمیل تک پہونچا۔

۱۷۶۵ء کے ۳۰ سال بعد ہمیں، دور جنوب کی میسور حکومت کے دو حکمرانوں، حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی حکمت عملی اور فکر و نظر کے دائروں میں ملکی سالمیت کے دھندلے تصور کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے، جنہوں نے انگریزی اقتدار کے خاتمہ کو پہلی ترجیح دیکر ان کے خلاف ایک طویل مہم چلائی اور حیدر علی کی جنگی مہارت کے طفیل، چند دنوں کے لیے بظاہر ایسا محسوس بھی ہونے لگا کہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے دن ختم ہونے کے قریب پہونچ گئے ہیں، لیکن حیدر علی کی زندگی نے وفا نہیں کی، اور ان کا عین اس وقت انتقال ہوگیا جبکہ وہ مدراس اور ارکاٹ میں انگریزوں کو فیصلہ کن شکستیں دیکر، اگلے محاذ کی طرف پیش قدمی کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کے بعد ٹیپو سلطان کی طرف سے افغانستان، ترکی کے حکمرانوں یہاں تک کہ فرانس کے حکمراں

اور یورپ کے فاتح جنرل نپولین سے انگریزوں کے خلاف فوجی مدد کی درخواستوں کے ساتھ سفارتوں کی روانگی سے ایسا تاثر پیدا ہوتا ہے، جیسے انہوں نے پورے ہندوستان کی سالمیت کے تصور کے ساتھ اپنے عمل و کار کا دور رس نقشہ مرتب کر رکھا ہو، لیکن اور کسی طریقہ سے بہ ظاہر نہیں ہوتا کہ فی الواقعہ میسور کی حکومت کے تحفظ کے علاوہ پورے ملک کا مفاد ان کے مدنظر ہو۔ ان کی آخری تقریر سے بھی یہ مترشح نہیں ہوتا کہ انہوں نے میسور کے سوا متحدہ ہندوستان کے تصور پر اپنی جدوجہد کی بنیاد رکھی تھی، انہوں نے انگریزوں کے ساتھ سری رنگ پٹنم کے قلعہ کے باہر دست بدست جنگ میں شہید ہونے سے تھوڑی دیر پہلے اپنے اعیان حکومت کے سامنے، جن میں اُن کے غدار کمانڈر میر صادق، اور وزیر مالیات پورنیہ شامل تھے، آخری خطاب میں اپنے وفادار اور قابل ترین کمانڈر سید غفار کی شہادت کے بعد کہا تھا کہ

"سید غفار شہید ہو گیا ہے۔ سید غفار کبھی نہیں ڈرا وہ آخری دم تک وفادار رہا، سید قاسم اس کی جگہ سنبھال لے۔ ما بدولت کو معلوم ہو گیا ہے کہ غلطی کہاں ہوئی، اور سری رنگ پٹنم کا یہ قلعہ کیسے غداروں سے بھرا ہوا ہے۔ مگر افسوس یہ سب کچھ بعد از وقت ہے۔ میں تمہارے درمیان موجود نہیں ہوں گا، مگر اس غداری کا نتیجہ تمہیں اس وقت معلوم ہوگا جبکہ تمہاری نسلیں اس ملک میں محتاج و ذلیل بن کر ایک ایک مٹھی چاول اور پیاز کی ایک ایک ڈلی کو ترسیں گی۔"

یہاں اس بات بلکہ اس نکتہ کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ انگریزوں نے میسور کی آخری لڑائی سے زیادہ تیاریوں کے ساتھ کوئی لڑائی نہیں لڑی۔ ہمارے پاس جو بھی) تاریخی شہادتیں ہیں، ان　　　سے معلوم ہوتا ہے کہ سری رنگ پٹنم کے

محاصرہ کے وقت انہوں نے صرف اندر کے دغابازوں اور غداروں کی اعانت اور آلہ کاروں کی تخریبی کارروائیوں پر بھروسہ کو ناکافی سمجھ کر، نظام حیدرآباد کے علاوہ شمال کی اودھ حکومت سے بھی باقاعدہ امداد طلب کی تھی، اور اودھ اور نظام کی باقاعدہ فوجیں ان کے ساتھ سری رنگ پٹنم کے محاصرہ میں شامل تھیں، ۴؍مئی ۱۷۹۹ء کو ٹیپو سلطان کی شہادت اور میسور حکومت کے خاتمہ کے بعد، اودھ حکومت کی طرف سے فوجی کمانڈر ہنری مارٹن، اور نظام حیدرآباد کی طرف سے میر عالم کی جو عزت افزائی ہوئی اور انہیں انعام واکرام سے جس طرح سرفراز کیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سالمیت کا تصور اس وقت کتنا کمزور اور معدوم ہو چکا تھا۔

ایک جملہ معترضہ کے طور پر یہ بات کہنے میں حرج نہیں ہے کہ ہنری مارٹن نے انگریزوں اور اودھ حکومت سے ملی ہوئی انعامی رقم سے مارٹن پوروہ کی بستی بسائی، اور وہ لا مارٹینز اسکول قائم کیا جو آج ہندوستان بھر میں انگلش میڈیم کا ممتاز تعلیمی ادارہ سمجھا جاتا ہے اور میر عالم نے اپنی انعامی رقم سے تالاب میر عالم نام کا وہ تالاب تعمیر کر دیا۔ جو کچھ دنوں پہلے تک حیدرآباد اور سکندرآباد کے جڑواں شہروں میں عوامی آب رسانی کا واحد ذریعہ تھا۔

جہاں تک انگریزی حکومت کے استحکام اور ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کے استقلال کا سوال ہے تو یہ کام میسور کی لڑائی کے نتیجہ میں پورا ہو چکا تھا، اس کے بعد کے جتنے واقعات ہیں، وہ پرانے نظام کی باقیات کے خاتمہ کے مقصد کے تحت کیے گئے، جہاں تک ۱۸۵۷ء کی عوامی جنگ آزادی کا سوال ہے، تو اس میں بھی متحدہ ہندوستان اور سالمیت کے تصور کی کارفرمائی کی کوئی علامت موجود نہیں تھی، اول تو یہ ساری جدوجہد شمالی ہندوستان تک محدود رہی، راجستھان، پنجاب، اور جنوب کی ریاستوں میں اس جدوجہد کا نہ تو کوئی اثر تھا، نہ ہی ان علاقوں کا کوئی حکمراں اس جدوجہد

میں شریک تھا، اس کے برعکس پٹیالہ نابھ، کپورتھلہ، جے پور، جودھ پور، جیسلمیر، گوالیار بلکہ نیپال تک کی فوجوں نے اس بغاوت کو کچلنے میں پورا حصہ لیا۔ اور اسی لئے انگریزی فوج کے ساتھ گورکھوں، راجپوتوں، مراٹھوں، اور سکھ رجمنٹوں کی لوٹ مار کی داستانیں بھی ماضی قریب تک، بڑے بوڑھوں کی زبان پر رہی ہیں۔

ان حقائق کی موجودگی میں، یہ بات شبہ سے بالاتر معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کی سالمیت اور ایک ملک کا تصور، انگریزوں نے پیدا کیا، اور مغل دور میں صرف اورنگ زیب عالمگیر، ایک ایسا بادشاہ تھا، جس نے ہندوستان کے سیاسی تشخص اور ایک ملک کے تصور پر کام کیا تھا اور اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد میں اپنی زندگی کے آخری ۲۵ برس گذارے تھے، اور آخری عمر میں اس مقصد کو حاصل بھی کر لیا تھا۔ ان کے بعد ان کے جانشینوں میں، کوئی اس قابل نہ ہوا کہ اس تصور کو باقی رکھ سکتا۔

انگریزوں نے البتہ متحد ہندوستان کے تصور کو اپنی سیاسی اور سامراجی مصلحتوں سے اس طرح عملی جامہ پہنایا کہ اس کے ساتھ انتظامی سہولتوں کے لیے برما، سیلون اور عدن تک کو دہلی کے مرکزی انتظامیہ میں شامل کر رکھا تھا، اور انہوں نے ہی افغانستان، نیپال، چین اور روس کے متوقع حملوں، اور خطروں کے مقابلہ کے لیے شمالی مشرقی، اور شمالی مغربی ہندوستان کی سرحدیں متعین کی تھیں، اسی احتیاطی تدبیر کے سلسلے میں وہ مشہور میکموہن لائن بھی انھوں نے ہی مقرر کی تھی جو بعد میں ہند چین تنازعہ کا سبب بنی، اور آج تک چلی آرہی ہے۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے سیاسی تشخص متحد ملک اور سالمیت کا تصور بھی، ویسا ہی بنا اور انگریزوں کا قائم کردہ ایک تصور ہے، اور جمہوری نظام ہائی کورٹ، سپریم کورٹ، ڈاک تار کے نظام، اور ریلوے کی طرح ان چیزوں میں ہے، جو انگریزوں سے نئے ہندوستان کو وراثت میں ملی تھیں۔

غیر مسلم اور قرآن سے استفادہ[1]

(قاضی اطہر مبارکپوری)

اسلام کی تبلیغ واشاعت کے سلسلہ میں جو اہم عالمی مسائل درپیش ہیں، ان میں غیر مسلموں کے قرآن مجید چھونے، اس کو پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، ادھر پچھلی چند دہائیوں سے پوری دنیا خصوصاً یورپ اور افریقہ کے ممالک میں اسلام فہمی کے لیے براہ راست مطالعہ کا ذوق اور داعیہ بڑھ رہا ہے، اور اس کے اصل منبع وماخذ یعنی کتاب وسنت اور قدماء کی تصانیف سے اسلامی عقائد واعمال کی جستجو عام ہو رہی ہے کیونکہ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ مستشرقین اور ان کے ہم ذوق اہل علم نے اسلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ خلاف واقعہ یا ناکافی ہے، اس صورت حال کے نتیجہ میں یورپ وغیرہ کی عام درسگاہوں میں عربی زبان اور تحقیقات اسلامی کے مستقل شعبے کھل رہے ہیں، یہ بات بہت خوش آیند اور امید افزا ہے کہ خود غیر مسلموں میں اسلامی فہمی کا ذوق ان کو عربی زبان اور اسلامی علوم سے بہت قریب کر رہا ہے، ایسی حالت میں ہم مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ ان غیر مسلموں کی زیادہ سے زیادہ مدد کی جائے، اور اسلام فہمی کی راہ میں ان کے لئے آسانی پیدا کی جائے، خاص طور سے

---

[1] یہ مقالہ ہمدرد فونڈیشن پاکستان کے زیر اہتمام تیسری عالمی قرآن کانفرنس منعقدہ راولپنڈی میں ۲۴ نومبر ۱۹۸۵ء کو پڑھا گیا۔

ان کے پاس قرآن پہونچانے اور اس کو صحیح طور سے سمجھنے کا زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کیا جائے ،

کئی سال ہوئے بمبئی میں ہمارے پاس جنوبی افریقہ (جوہانسبرگ) سے اس سلسلہ میں لمبا چوڑا استفتار آیا تھا جس میں یہی سوال تھا کہ ہمارے یہاں کے یورپین اور افریقن ہم سے قرآن مجید اور اس کا ترجمہ طلب کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے طور پر اسلام کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کریں، ان میں اسلام فہمی کا شوق حد سے زیادہ ہے، جب سے یہاں کے مسلمانوں میں دینی شعور بیدار ہوا ہے اور ان کی بستیوں میں اسلامی اور دینی فضا پیدا ہو رہی ہے غیر مسلموں میں یہ ذوق بڑھتا جا رہا ہے، ایسی صورت میں ہم ان غیر مسلموں کو پورا قرآن یا اس کے اجزار مع ترجمہ کے دے سکتے ہیں، یا نہیں ؟ اس کے جواب میں ہم نے اس وقت لکھا کہ قرآن کا ترجمہ دیا جا سکتا ہے ، اور اسی وقت سے اس مسئلہ میں مزید تحقیق و تلاش جاری رہی ،

حالات کی تیز رفتاری اور ضرورت کی شدت نے بڑی حد تک قرآن کریم کو غیر مسلموں کے ہاتھ میں پہونچا دیا ہے اور وہ اپنے طور پر اس کو پڑھنے اور سمجھنے لگے ہیں، ان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں عربی زبان کی تعلیم ہو رہی ہے اور دراساتِ اسلامیہ کا شعبہ قائم ہے، ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے، اور کتاب و سنّت اور سلف صالحین کے قول و فعل سے روشنی حاصل کی جائے،

قرآن مجید کے ادب و احترام پر ہر مکلّف مسلمان کا عقیدہ و عمل ہے، اور عام مسلک یہی ہے کہ محدِث اور جنبی مسلمان اور غیر مسلم قرآن مجید کو ہاتھ نہیں لگا سکتا ہے، البتہ محدِث یعنی بے وضو مسلمان اس کو پڑھ سکتا ہے ،

اس سلسلہ میں سورۂ واقعہ کی یہ آیات قابلِ توجہ ہیں جن کے بارے میں علمار سلف کے مختلف اقوال ہیں ،

فلا اقسم بمواقع النجوم ٥ وانہ لقسم لو تعلمون عظیم ٥ انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون ٥ لا یمسہ الا المطہرون تنزیل من رب العالمین ٥

سو میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے چھپنے کی اور اگر تم غور کرو تو یہ بڑی قسم ہے کہ یہ ایک مکرم قرآن ہے جو محفوظ کتاب میں ہے، اس کو بجز پاک فرشتوں کے کوئی ہاتھ نہیں لگانے پاتا ہے، یہ رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہے کہ

جمہور صحابہؓ، تابعین اور سلف کا قول ہے کہ "لا یمسہ الا المطہرون" اس قرآن کے بارے میں ہے جو عنداللہ اور آسمان میں ہے، اور مطہرون سے مراد ملائکہ ہیں، یعنی اس آسمانی کتاب الٰہی کو صرف فرشتے ہاتھ لگاتے ہیں، سورہ عبس کی ان آیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

فمن شاء ذکرہ ٥ فی صحف مکرمۃ مرفوعۃ مطہرۃ ٥ بایدی سفرۃ کرام بررۃ ٥

سو جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے، وہ ایسے صحیفوں میں ہے جو مکرم ہیں، رفیع المقام ہیں، مقدس ہیں، جو ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں کہ وہ مقرب نیک ہیں،

حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت انس بن مالک، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہم اور مجاہد، عکرمہ، ضحاک، سعید بن جبیر، ابوالشعثار، جابر بن زید، ابونہیک، ابوالعالیہ، قتادہ حماد بن سلیمان، اسماعیل سدی، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم وغیرہ رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔

دوسرے علماء کا قول ہے کہ "لا یمسہ الا المطہرون" میں مطہرون سے مراد جنابت اور حدث سے پاک لوگ مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ قرآن کو جنبی اور محدث ہاتھ نہ لگائے، ان کا کہنا ہے کہ مذکورہ آیت میں اگرچہ خبر دی گئی ہے مگر اس کا مطلب ومعنی طلب ہے اور قرآن کریم سے مراد مصحف ہے جو لکھا اور پڑھا جاتا ہے، صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کے علاقہ میں قرآن لے کر سفر کرنے سے اس لئے منع فرمایا ہے کہ دشمن اس کو پا جائے گا، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے عامل حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو جو مکتوب روانہ فرمایا تھا اس میں درج تھا "ان لا یمسّ القرآن الّا طاہرٌ" یعنی قرآن کو صرف طاہر و پاک شخص ہاتھ لگائے۔ [1]

اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے واقعہ سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، جس میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی بہن سے کہا کہ جو کتاب تم لوگ پڑھ رہے تھے مجھے دو، تو بہن نے کہا کہ "انّک رجس وانہ لا یمسہ الّا المطہرون" یعنی تم ناپاک ہو اور اس کو پاک ہی لوگ ہاتھ لگاتے ہیں، "فقم فاغتسل او توضأ فتوضأ ثم اخذ الکتاب فقرأہ" یعنی تم اٹھو غسل یا وضو کرو، چنانچہ حضرت عمرؓ نے وضو کیا اور قرآن کو پڑھا، دوسری روایت میں غسل کرنے کی تصریح بھی ملتی ہے، چنانچہ قاضی ابن عربی مالکیؒ نے احکام القرآن میں فاغتسل واسلم لکھا ہے [2]

حضرت سلمان فارسیؓ نے ایک مرتبہ بغیر وضو کے قرآن پڑھا مگر اس کو ہاتھ نہیں لگایا، حضرت سعدؓ نے اپنے لڑکے کو قرآن چھونے کے لئے وضو کرنے کا حکم دیا، حضرت ابن عمرؓ سے بھی یہی مروی ہے، اور امام حسن بصریؒ، امام نخعیؒ بغیر وضو کے مس قرآن مکروہ سمجھتے ہیں۔ [3]

فراءؒ نے سب سے الگ اور ظاہری معنی سے ہٹ کر کہا ہے آیت "لا یمسّہ الّا المطہرون" کا مطلب بیان کیا ہے کہ لایجد طعمہ ونفعہ الّا من اٰمن بہ [4]

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲۹۸،　　[2] احکام القرآن ابن العربی ج ۲ ص ۲۳۲

[3] احکام القرآن جصاص ج ۳ ص ۵۱۱۔

[4] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲۹۸۔

قرآن کی چاشنی اور لذت اور اس کا نفع وہی شخص پائے گا جو اس پر ایمان لائے۔

قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی نے لکھا ہے کہ اس آیت کا یہ مطلب کہ قرآن کی لذت وہی لوگ پا سکتے ہیں جو گناہوں سے پاک اور تائب و عابد ہیں صحیح ہے، امام بخاری نے اس کو مختار بتایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اسلام کی لذت اس شخص نے پائی جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، اور دین اسلام کی حقانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر راضی ہوا مگر یہ توجیہ بغیر عقلی اور سمعی دلیل کے ظاہر سے عدول ہے، [۱]

قاضی ابوبکر احمد بن علی جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ مذکورہ آیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اگر آیت کو خبر پر محمول کیا جائے تو اولیٰ یہ ہے کہ اس میں وہ قرآن مراد ہو جو اللہ تعالیٰ کے یہاں ہے اور مطہرون سے مراد ملائکہ ہیں، اور اگر آیت کو نہی پر محمول کیا جائے اگرچہ یہ بصورت خبر ہے تو ہم سب کے بارے میں عام ہوگی، اور یہی اولیٰ ہے اس لیے کہ صریح روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن حزم کے پاس جو تحریر روانہ فرمائی تھی اس میں "ولا یمس القرآن الا طاهر" تھا، اور یہ نہی اسی آیت کی وجہ سے ہوگی کیونکہ اس میں نہی کا احتمال ہے۔ [۲]

یہ ساری بحثیں مسلمان محدث اور جنبی کے مس قرآن کے بارے میں ہیں جو مکلف ہیں اور جن پر شرعی احکام لاگو ہوتے ہیں اسی کے ساتھ قرآن جہاں ھدی للمتقین ہے وہیں "ھدی للناس" بھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار و مشرکین تک قرآن کی آواز پہونچانے میں جو جد و جہد فرمائی ہے اور اس راہ میں جو مصائب برداشت کیے ہیں ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں، دربار رسالت میں جو وفود دین فہمی کے لیے آتے ہیں ان کو

---

[۱]:۔ احکام القرآن ابن العربی ج ۲ ص ۲۳۱۔

[۲]:۔ احکام القرآن ج ۳ ص ۵۱۵۔

کے لیے جو اہتمام آپ نے فرمایا ہے وہ بھی معلوم ہے، اُن کی دلداری، پذیرائی اسلیے تھی کہ وہ خود دین کی سمجھ حاصل کرنے کے لئے آتے تھے، حتیٰ کہ جو حربی مشرک اور کافر قرآن سننے اور سمجھنے کے ارادے سے آتے تھے ان کو اپنی امان میں رکھکر قرآن سناتے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ○

اور اگر کوئی شخص مشرکوں میں سے آپ سے پناہ چاہے تو آپ اس کو پناہ دیدیں، تاکہ وہ کلام اللہ کو سن لے، پھر اس کو اس کی پناہ کی جگہ پہونچا دیں، یہ حکم اس لئے ہے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے،

امام ابوبکر جصاصؒ لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ کافر جب ہم سے دین کی حجت اور توحید ورسالت کے دلائل طلب کرے، تاکہ حجت اور دلیل کی روشنی میں توحید ورسالت کو تسلیم کرے، تو ہم پر اقامت حجت، اور اللہ تعالیٰ کی توحید، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بیان کرنا ضروری ہے، اور ایسے حربی کافر کا قتل کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس کو امان دینے کا حکم دیا ہے تاکہ کلام اللہ کو سنے، اس کے بعد لکھتے ہیں:

وفیہ الدلالۃ ایضاً علی ان علینا تعلیم کل من التمس منا تعریفہ شیئاً من امور الدین، لان الکافر الذی استجارنا لیسمع کلام اللہ انما قصد التماس معرفۃ صحۃ الدین[1]

نیز اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص ہم سے دین کی کوئی بات معلوم کرنا چاہے، ہم پر ایسے تمام لوگوں کو تعلیم دینا فرض ہے، کیونکہ جس کافر نے کلام اللہ سننے کے لئے ہم سے پناہ وامان چاہی ہے اس کا مقصد

---

[1] احکام القرآن ج ۳ ص ۱۰۳ -

دین کی صحت کی معرفت ہی ہے۔

موجودہ دور میں بہت سے غیر مسلموں کے بارے میں تقریباً یہی صورت حال ہے کہ وہ تحقیق کے لئے قرآن کو سمجھنا چاہتے ہیں، اور گویا ہم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کو قرآن کی تعلیمات اور توحید و رسالت کے بارے میں بنیادی باتیں بتائی جائیں، اس لئے ان کی پذیرائی، دلداری اور تالیف قلب کے ساتھ اسلام کے اصل منبع و ماخذ تک ان کے لئے راہ پیدا کرنی چاہئے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے غیر مسلم کے مس قرآن کا مسئلہ سامنے آتا ہے، ظاہر ہے کہ عام حالات میں غیر مسلم کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے، جبکہ وہ اپنے طور پر قرآن چھوتے اور پڑھتے ہیں۔ چنانچہ امام ابو بکر جصاص رحؒ نے مشہور تابعی امام ابو قتادہ بن دعامہ سدوسی بصری رحؒ متوفی ۱۱۸ھ کا یہ بیان نقل کیا ہے:

وقال قتادة: لا يمسه عند الله الا المطهرون فاما في الدنيا فانه يمسه المجوسي، والنجس، والمنافق۔[۱]	جو قرآن عند اللہ ہے اس کو صرف پاک لوگ چھوتے ہیں اور جو دنیا میں ہے اس کو مجوسی اور ناپاک اور منافق بھی چھوتا ہے۔

امام ابن کثیر رحؒ نے بھی حضرت قتادہ کا یہ قول معمولی اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے:

لا يمسه عند الله الا المطهرون فاما في الدنيا فانه يمسه المجوسي النجس والمنافق الرجس۔[۲]	جو قرآن عند اللہ ہے اس کو صرف پاک لوگ چھوتے ہیں اور جو دنیا میں ہے اس کو نجس مجوسی اور ناپاک منافق بھی چھوتا ہے۔

---

[۱] احکام القرآن جصاص ج ۳ ص ۵۱۱۔

[۲] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲۹۸۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول صورت حال کی خبر اور بیان واقعہ کے طور پر ہے، یعنی ان کے زمانہ میں بصرہ اور عراق کے دوسرے شہروں میں جو غیر مسلم اور مجوسی وغیرہ آباد تھے اور مسلمانوں سے ان کا اختلاط تھا، وہ اپنے طور پر بوقت ضرورت قرآن کو ہاتھ لگاتے اور پڑھتے تھے، جیسا آج بھی یہ صورت ہے کہ غیر مسلم طابعین وناشرین قرآن مجید کی طباعت کرتے ہیں، اور ایسے ادارے اپنے طور پر اس کا احترام بھی کرتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قبول اسلام سے پہلے مصحف کو ہاتھ لگانے کے لیے جو وضو یا غسل کیا تھا ظاہر ہے کہ وہ بحالت کفر تھا اور اس کا مقصد ظاہری صفائی اور ستھراپن تھا، غالباً اسی ظاہری صفائی کے پیش نظر ائمۂ احناف میں امام محمد رح نے غسل کے بعد نصرانی کے مسِ قرآن کو جائز قرار دیا ہے، جیساکہ درمختار میں ہے:

ویمنع النصرانی من مسّہ، وجوزہ محمد اذا اغتسل، [۱]

مسِ قرآن سے نصرانی کو روکا جائے گا، اور امام محمدؒ نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ جبکہ وہ غسل کرلے،

نیز اسی زمانہ میں کوفہ کے بعض اجلۂ تابعین اور ائمہ دین نے نصاریٰ سے اپنے لیے قرآن لکھوایا تھا، ظاہر ہے کہ ان حضرات نے نصاریٰ کی ظاہری صفائی پر اعتماد کرکے یہ کام ان سے لیا تھا، چنانچہ امام ابراہیم نخعی رح اپنے استاد امام علقمہ بن قیس نخعی کوفی رح متوفی ۶۲ھ کے متعلق بیان کرتے ہیں:

انّہ کان اذا اراد ان یتخذ مصحفاً امر نصرانیاً فنسخہ، [۲]

جب ان کو مصحف کی ضرورت پڑتی تو ایک نصرانی کو حکم کرتے اور وہ اُن کے

---

[۱]: درمختار مع الشامی ج ۱ ص ۱۸۳

[۲]: المحلی ابن حزم ج ۱ ص ۸۲

لیے لکھدیا کرتا تھا،

اس روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علقمہؒ اس عیسائی کاتب سے بار بار مصحف لکھوایا کرتے تھے، اور اس پر ان کو پورا اطمینان تھا۔

حضرت علقمہ بن قیس رحمۃ اللہ علیہ علماء ربانیین میں سے تھے، حضرت عمرؓ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت سعد، حضرت حذیفہ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور دیگر اجلۂ صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے، حضرت ابن مسعود کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور علم وعمل، سیرت وکردار میں ان کے مثنیٰ تھے، ان کے حلقۂ درس میں حضرات صحابہؓ شریک ہوکر دینی سوال کرتے اور فتویٰ پوچھتے تھے۔ [۱]

اسی طرح حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کوفی متوفی ۸۳ھ نے مقام حیرہ کے ایک نصرانی سے اجرت پر قرآن کی کتابت کرائی تھی، مصنف عبدالرزاق، باب بیع المصاحف میں ہے:

ان عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ کتب له نصرانی من اهل الحیرة مصحفاً بسبعین درهماً [۲]	عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے لیے حیرہ کے ایک نصرانی نے ایک مصحف ستر درہم میں لکھا تھا،

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ کوفہ کے کبار تابعین اور ثقاتِ اسلام میں سے ہیں، ایک سو بیس صحابہ کی صحبت ومعیت سے فیضیاب ہیں، ان کے حلقۂ درس میں بھی حضرات صحابہؓ تشریف لاتے تھے، جن میں حضرت براء بن عازبؓ بھی ہوا کرتے تھے، یہ حضرات نہایت خاموشی اور ادب کے ساتھ ان سے احادیث سنتے تھے، [۳]

---

[۱]:- تہذیب التہذیب ج۷ ص۲۷۳ ۔

[۲]:- مصنف عبدالرزاق ج۸ ص۱۱۴ ۔

مشہور امام محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے والد ہیں۔ سلہ

ان حضرات کے اس عمل پر معاصر ائمۂ دین کی طرف سے کسی قسم کی نکیر کا پتہ نہیں چلتا، حالانکہ اس دور میں ہر جگہ علماء، وفقہاء اور محدثین کا جم غفیر موجود تھا اور مختلف فیہ مسائل میں اختلاف رائے ہوتا تھا، ظاہر ہے کہ نصرانی کاتب سے قرآن لکھوانے میں اس کی ظاہری پاکی وصفائی کا لحاظ رہتا رہا ہوگا، جیسا کہ حضرت عمرؓ کے ایک واقعہ میں یہی بات تھی، اور ایسی صورت میں وہ نصرانی کاتب قرآن کو چھوتے اور پڑھتے تھے،

اس کے باوجود عہد سلف میں بلاکسی شرط و قید ہر محدث و جنبی اور غیر مسلم کے قرآن مجید کو ہاتھ لگانے اور پڑھنے کے جواز میں کوئی صریح قول نہیں ملتا، البتہ حضرت قتادہؒ کا قول "فاما فی الدنیا فانہ یمسہ المجوسی والنجس والمنافق" بتاتا ہے کہ عہد صحابہ و تابعین میں قرآن کو غیر مسلم بھی ہاتھ لگاتے تھے، بعد میں پانچویں صدی کے مشہور ظاہری امام و عالم ابن حزم اندلسیؒ متوفی ۴۵۶ھ جو بلاکسی قید و شرط کے علی الاطلاق اس کے جواز کے قائل ہیں اور محدث، جنبی اور کافر و مشرک سب کے لیے قرآن چھونے اور پڑھنے کو جائز قرار دیتے ہیں، اور عدم جواز کے تمام دلائل کا رد کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

جنبی کے لیے مس قرآن کو ناجائز قرار دینے والوں نے جن آثار سے استدلال کیا ہے، ان میں سے کوئی صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ یا مرسل ہے، یا غیر مستند صحیفہ ہے، یا اس کا راوی مجہول ہے، یا ضعیف ہے۔ سلہ

اور اپنے اس قول کے استدلال میں مکتوب نبوی بنام ہرقل کو پیش کیا ہے،

سلہ: تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۶۰۔

سلہ المحلی ج ۱ ص ۸۱۔

جس میں قرآنی آیات ہیں اور نصاریٰ نے ان کو ہاتھ لگایا اور پڑھا ہے، یہ مکتوب مبارک صحیح بخاری کی کتاب بدء الوحی میں یوں درج ہے:-

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، من محمد عبد اللہ ورسولہ الیٰ ہرقل عظیم الروم، سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ، اما بعد فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم یوتک اللہ اجرک مرتین، فان تولیت فان علیک اثم الاریسیین، ویآ اھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا، ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ، فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون ۰"

اس مکتوب نبویؐ کو نقل کرکے ابن حزمؒ نے لکھا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے نصاریٰ کے پاس یہ مکتوب روانہ فرمایا جس میں یہ آیت ہے! حالانکہ آپ کو یقین تھا کہ وہ اس مکتوب کو ہاتھ لگائیں گے، [۱]

اس مکتوب کے پیش نظر بعض علماء حنبلی کے لیے ایک دو آیات پڑھنے اور دشمن کے ملک میں قرآن کے بعض اجزاء بھیجنے اور اس کے ساتھ سفر کرنے کے قائل ہیں، [۲]

غیر مسلم کو قرآن کی تعلیم دینے کے بارے میں علماء سلف کے مختلف اقوال ہیں:-

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ امام مالکؒ نے کافر کو قرآن کی تعلیم سے مطلقاً منع کیا ہے، حنفیہ کے نزدیک مطلقاً جائز ہے، امام شافعیؒ کے اس بارے میں دو اقوال ہیں:-

بعض مالکی علماء نے غیر مسلم پر دین کی حجت قائم کرنے کے لیے قرآن کی مختصر تعلیم

۱۔ فتح الباری جلد ا ص ۳۹ -

۲۔ المحلی ۱/ ۸۳ ص -

جائز قرار دی ہے، اور ضرورت سے زیادہ تعلیم سے منع کیا ہے، انھوں نے مکتوب نبوی بنام ہرقل سے استدلال کیا ہے، آخر میں لکھا ہے کہ:

وقد نقل النووی الاتفاق علی جواز الکتابۃ الیہم بمثل بذلک[۱]

امام نووی نے نصاریٰ وغیرہ کے پاس اس قسم کے خط لکھنے پر علماء کا اتفاق نقل کیا ہے،

حنفیہ کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ وہ غیر مسلم کے لیے قرآن کی تعلیم مطلقاً جائز سمجھتے ہیں، درمختار میں ہے:

ویمنع النصرانی من مسہ، وجوزہ محمد اذا اغتسل، ولا باس بتعلیمہ القرآن والفقہ عسی ان یہتدی[۲]

نصرانی کو مس قرآن سے روکا جائے گا، اور امام محمدؒ اس کو جائز قرار دیتے ہیں جبکہ وہ غسل کرلے، اور اس کو قرآن اور فقہ کی تعلیم دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے ہدایت پا جائے،

علمائے ہند میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے غیر مسلم کو صرف ترجمہ قرآن دینا جائز قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ قرآن کریم کا ترجمہ مسلمانوں کے حق میں قرآن مجید کا حکم رکھتا ہے، اور غیر مسلموں کو تبلیغ کے لئے دینا جائز ہے[۳]

الحاصل غیر مسلم کے ہاتھ میں قرآن کریم دینے اور اس کو قرآن کریم کی تعلیم دینے کے بارے میں (۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانے سے پہلے غسل یا وضو کے بعد قرآن

---

[۱] ۔ فتح الباری ج ۶ ص ۱۳۴ ۔

[۲] ۔ درالمختار ج ۱ ص ۱۸۳ ۔

[۳] ۔ کفایت المفتی ج ۱ ص ۱۲۵ ۔

کا چھونا اور پڑھنا، (۲) مکتوب نبوی بنام ہرقل (۳) حضرت قتادہؒ کا بیان، (۴) حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ اور حضرت علقمہ بن قیسؒ کا نصرانی سے قرآن لکھوانا، (۵) امام محمد بن حسن شیبانیؒ کا قول (۶) احناف کے نزدیک غیر مسلم کی ہدایت کی امید پر اس کو قرآن کی تعلیم دینے کا جواز، (۷) امام ابن حزم ظاہری اندلسیؒ کے نزدیک علی الاطلاق سب کے لیے مسِ قرآن کا جواز، ان سب تصریحات کی روشنی میں ایسے غیر مسلموں کو قرآن چھونے اور پڑھنے پر سنجیدگی سے غور کیا جاسکتا ہے جو واقعی ہدایت کے طالب ہیں، اور اس کا اپنے طور پر احترام کرتے ہیں، ایک بات خاص طور سے قابل غور ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اور علقمہ بن قیس نے نصرانی سے قرآن لکھوایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے متعدد سربراہان ملک کے پاس دعوتی مکاتیب روانہ فرمائے مگر نصرانی سربراہ ہرقل کے مکتوب میں قرآنی آیات تحریر فرمائیں، امام محمد نے نصرانی کو غسل کے بعد قرآن چھونے کی اجازت دی ہے، ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے اہل مذاہب کے مقابلہ میں عیسائی اسلام اور مسلمانوں سے زیادہ قریب تھے، اور قرآن کا کسی حد تک احترام کرتے تھے، اس لیے اہل علم کو ان پر اعتماد تھا،

دوسری بات یہ ہے کہ قتادہؒ، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ، علقمہ بن قیسؒ اور امام محمدؒ علمائے عراق میں سے ہیں جن کے یہاں تو مسلموں اور غیر مسلموں کے اختلاط و اجتماع کی وجہ سے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے تھے، اور ائمۂ دین ان کو کتاب و سنّت کی روشنی میں اپنی فقہی بصیرت سے حل کرتے تھے، اس دور میں عراق کے مرکزی شہر کوفہ، بصرہ وغیرہ عجمی و عربی رجال و افکار کا گہوارہ تھے، اور ان میں مذہبی بحث و مناظرہ کی مجلسیں برپا رہا کرتی تھیں، اسی وجہ سے علماء عراق جدید مسائل کے بارے میں سند اور اسوہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں توسّع پایا جاتا ہے۔

امام ابوزرعہ رازیؒ

(از مولانا اسیر ادروی صاحب، ادری، اعظم گڈھ)

ابوزرعہ الرازی اپنے دور کے مشہور محدث، حافظ حدیث، اسماء الرجال اور فن جرح وتعدیل کے بہت بڑے عالم اور امام فن تھے، حفظ حدیث، ذکاوت اور علم وعمل ہر اعتبار سے ممتاز تھے، ان کی عظمت اور علم وفضل کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے تلامذہ میں امام ترمذیؒ، امام نسائیؒ، ابن ماجہ، ابوحاتم رازی جیسے مشہور محدثین شامل ہیں، آپ امام بخاریؒ ومسلمؒ جیسے یگانۂ روزگار محدثین کے معاصر ہیں اور بہت سے شیوخ حدیث میں شریک ہیں، لاکھوں حدیثیں انہوں نے اپنے ہاتھ سے نقل کیں، اسماء الرجال اور فن جرح وتعدیل کی کتابوں میں امام بخاری ومسلم اور دوسرے مشاہیر فن کے ساتھ ان کے بھی اقوال مذکور ہیں اور ان کی بڑی اہمیت ہے۔

آپ کا نام عبید اللہ بن عبد الکریم بن یزید بن فروخ ہے، لیکن علمی دنیا میں آپ کی شہرت صرف ابوزرعہ رازی کے نام سے ہے، آپ کی ولادت دوسری صدی کے آخر میں سنہ ۱۹۴ھ میں ہوئی۔ امام بخاری کا سال ولادت بھی یہی ہے، آپ کی ولادت شہر رَے میں ہوئی اور وہیں نشو ونما پائی۔

خاندان آپ کا خاندان ایک علمی خاندان تھا، آپ کے دادا یزید بن فروخ رَے کے تین مشہور محدثین میں شامل ہیں، اسماعیل بن یزید

اور محمد بن یزید ابو جعفر الاحدب اور تیسرے یہی یزید بن فروخ ہیں، آپ کے والد عبدالکریم بن یزید خود بھی صاحب علم تھے اور مشہور محدثین کی علمی مجلسوں میں برابر شریک ہوتے تھے، اسماء الرجال کی بہت سی معلومات ابوزرعہ کو اپنے والد ہی کے ذریعہ حاصل ہوئیں، اسی طرح ان کے بھائی ابو بکر بھی اہل علم تھے اور محدثین سے حدیثوں کے سماع کے سلسلہ میں ابوزرعہ اپنے بھائی ابو بکر کے ساتھ بسا اوقات جاتے تھے، اسی طرح ان کی پھوپھی کا گھرانہ بھی علمی گھرانہ تھا، ان کے پھوپھی زاد بھائی کے ساتھ مشہور محدث ابو حاتم رازی نے تحصیل حدیث کے سلسلہ میں اسفار کیے ہیں۔

ابوزرعہ نے اپنے خاندان اور عزیز و اقارب اور اپنے شہر کے علمی ماحول اور آب و ہوا میں نشو و نما پائی جہاں ہر طرف اور ہمہ وقت قال اللہ و قال الرسول کے ایمان افروز اور حوصلہ افزا نغمے گونج رہے تھے۔

وطن آپ کا وطن شہر رَے، ایک مردم خیز شہر تھا اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی دنیا میں ایک علمی مرکز کی حیثیت سے بھی مشہور تھا، رے میں ہر طرف علم حدیث کا چرچا تھا، متعدد محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل کے علمی زمزمہ آرائیوں سے پورا شہر معمور تھا، دنیائے اسلام میں ہمہ وقت جو علمی کارواں سرگرم سفر رہا کرتے تھے، ان کی ایک منزل رَے بھی تھی جہاں ارکردہ اپنی علمی تشنگی بجھاتے تھے، رے کے محل وقوع نے بھی اس کی مرکزیت و مرجعیت میں اضافہ کر دیا تھا کیوں کہ ماوراء النہر کے تمام علمی مرکزوں نیشاپور، مرو، بلخ، ہرات وغیرہ مشہور شہروں کے قافلوں کی شاہراہ پر واقع تھا، ان علاقوں سے حاجیوں کے قافلے اور طلب حدیث میں سرگرم سفر رہنے والے کارواں رَے ہی سے ہو کر گزرتے تھے، اس کی سرایوں اور مسافر خانوں میں یہ قافلے خیمہ زن رہا کرتے تھے، اور کارواں کے افراد اپنے اپنے ذوق کے مطابق رَے کے محدثین کی علمی مجلسوں میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے تھے اور کچھ دنوں قیام

کرکے پھر آگے کے سفر پر نکل جاتے تھے۔ اس کی وجہ سے رَے میں ہمہ وقت علمی ہماہمی کا ایک ماحول بنا رہتا تھا، ہر طرف علمی چرچے، درسِ حدیث کی باتیں، مذاکرے و مباحثے اس طرح شب و روز ہوتے رہتے تھے جیسے اس کے علاوہ یہاں اور کوئی مصروفیت اور دلچسپی کی چیز ہی نہیں ہے۔ پھر رَے کا تجارتی مرکز ہونا، اور خلفاء کا خصوصیت کے ساتھ یہاں کے علماء و محدثین کا لحاظ و خیال رکھنا اور ان کو علمی مشغلوں کی سہولتیں فراہم کرنا بھی رَے کی شہرت کا باعث تھا۔

رَے میں بہت سے علمی خانوادے تھے جن میں درس و تدریس کا سلسلہ اور علمی چرچا رہا کرتا تھا اس کے افرادِ علمی مشاغل میں مصروف تھے اور وہ رَے آنے والوں کے سامنے اپنے آبا و اجداد کے علمی ذخیروں سے لوگوں کو مستفید ہونے کے مواقع فراہم کرتے رہتے تھے، رَے کے متعدد علماء اور محدثین کی عالم اسلام میں شہرت نے بھی رَے کی مرکزیت میں اضافہ کر دیا تھا، مشاہیر اسلام اور جلیل القدر محدثین کے سفرِ رَے کا حال تاریخوں میں مذکور ہے، ان میں سے کچھ ممتاز اور نمایاں نام درج ذیل ہیں:۔

امام سعید بن جُبیر الاسدی الوالبی جن کو حجاج نے ۹۵ھ میں "ظلماً" قتل کرایا، مشہور محدث ضحاک بن مزاحم الہلالی الخراسانی (متوفی ۱۰۵ھ) امیر المؤمنین فی الحدیث عامر بن شراحیل (متوفی ۱۰۳ھ) جو صرف شعبی کے نام سے مشہور ہیں، خبابہ بن نافع الضبی الکوفی (متوفی ۱۱۷ھ) جو نافع مولیٰ ابن عمرؓ کے مشہور راوی ہیں، حجاج بن ارطاط بن ثور النخعی الکوفی القاضی (متوفی ۱۴۵ھ) مشہور محدث و فقیہ امام ابو حنیفہ کے مشہور شاگرد امام محمد بن الحسن الشیبانی امام المغازی محمد بن اسحاق بن یسار المدنی (متوفی ۱۵۲ھ) امیر المومنین فی الحدیث سفیان بن سعید بن مسروق الثوری (متوفی ۱۶۱ھ) امام القرأة والتجوید والنحو علی بن حمزہ بن عبد اللہ الاسدی الکوفی الکسائی (متوفی ۱۸۰ھ) مشہور

فقیہ و محدث عبداللہ بن المبارک المروزی (متوفی سنہ ۱۸۱ھ) ابوالفضل سلمہ بن بشیر النیسابوری (متوفی سنہ ۲۱۱ھ) امام علی بن عبداللہ بن جعفر بن نجیح السعدی ابوالحسن ابن المدینی البصری (متوفی سنہ ۲۳۴ھ) جو امام بخاری کے مشہور شیوخ میں ہیں۔

دنیائے اسلام کی ان مشہور اور عظیم المرتبت شخصیتوں کے خیر مقدم کرنے کا شرف سرزمین رے کو حاصل ہوا، ان علماء و محدثین نے افادہ واستفادہ کی غرض سے رے کا سفر کیا۔ اس تفصیل سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ ابوزرعہ کے نشو و نما کا زمانہ کتنا زرخیز تھا۔ رے کے اس علمی ماحول اور فضا میں ان کا بچپن گذرا۔

کنیت ابوزرعہ کی کنیت میں رے اور دوسرے مقامات کے تقریباً پچاسوں اہلِ علم شریک ہیں۔ لیکن فن اسماء الرجال وفن جرح و تعدیل اور علم حدیث میں جب مُطلق بغیر نسبت کے ابوزرعہ کی کنیت استعمال کی جاتی ہے تو اس سے مراد یہی ابوزرعۃ الرازی ہوتے ہیں کیونکہ "المطلق اذا اطلق یراد بہ الفرد الکامل" ابوزرعہ کی علمی عظمت وشان نے ان کے اسلاف و معاصرین کو جو ان کے ساتھ کنیت میں شریک تھے پردۂ خفا میں ڈال دیا۔

تحصیل علم چونکہ گھر اور خاندان میں ہمہ وقت علمی چرچا رہتا تھا، خود ان کے والد علماء و محدثین کی مجلسوں میں برابر شریک ہوتے رہتے تھے اس لیے قدرتی طور پر ابوزرعہ اپنی کم عمری ہی میں علمی مجلسوں میں شریک ہونے لگے تھے عہد اسلام کی ابتدائی صدیوں میں تحصیل علم کا مروجہ طریقہ یہ تھا کہ طالبان علم حدیث کا قافلہ مرتب ہوتا تھا۔ اور اجتماعی طور پر یہ قافلہ شہروں شہروں میں قیام کرتا ہوا علم حدیث کے مرکزوں تک پہونچتا اور حسب ضرورت وہاں قیام کرکے پھر آگے بڑھتا تھا، چونکہ راستے مخدوش تھے اس لئے جان و مال کی حفاظت کے خیال سے تنہا سفر نہیں کیا جاتا تھا۔

ابو زرعہ کا پہلا علمی سفر تیرہ سال کی عمر میں ہوتا ہے، اسی عمر میں انہوں نے اپنی فطری ذکاوت و قوت حافظ اور فہم و فراست کی وجہ سے اکابر محدثین کا اعتماد حاصل کر لیا تھا، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب مشہور محدث قتیبہ بن سعید (متوفی ۲۴۰ھ) رے تشریف لائے ہیں تو لوگوں نے ان سے روایت حدیث کی درخواست کی تو انہوں نے کہا:

"میری مجلس درس میں احمد بن حنبل، یحیٰی بن معین، علی بن المدینی، ابوبکر ابن ابی لیلیٰ، شیبہ اور ابوخیثمہ جیسے اہل علم شریک ہوتے ہیں، میں یہاں کس کے سامنے حدیث بیان کروں؟

لوگوں نے عرض کیا کہ آپ نے مختلف مجلسوں میں جو حدیثیں بیان کی ہیں ہمارے یہاں ایک نوجوان ہے جو ان حدیثوں کو پوری ترتیب کے ساتھ حرف بحرف بیان کر دے گا، یہ کہہ کر لوگوں نے ابوزرعہ سے کہا کہ ابوزرعہ کھڑے ہو جاؤ، چنانچہ ابوزرعہ آئے اور انھوں نے وہ تمام حدیثیں بیان کر دیں جو قتیبہ بن سعید اب تک رے کی مختلف مجلسوں میں بیان کر چکے تھے، یہ حیرتناک حافظ دیکھ کر قتیبہ ششدر رہ گئے اور درس حدیث شروع کر دیا۔[1]

علمی اسفار علمی اسفار خاص طور پر دو مقصدوں کے پیش نظر ہوتے تھے، ایک تو یہ کہ جس راوی سے ان کو حدیث ملی ہے اگر اس کے شیخ سے ملاقات ممکن ہے تو اس شیخ سے براہ راست مل کر حدیث کا سماع کرنا وہ پسند کرتے تھے، تاکہ سند مختصر ہو جائے، فن علوم الحدیث میں اس کو علو اسناد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دوسرا مقصد سفر راویوں کے حالات کا صحیح علم تاکہ جرح و تعدیل کے اعتبار

---

[1]:- تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۳۲ تاریخ دمشق لابن عساکر فی ترجمہ ابی زرعہ۔

سے اُن کا صحیح مقام و مرتبہ تعین کیا جا سکے اور روایت کا درجہ معلوم ہو جائے، اسی تلاش و تفحص اور جستجو کے نتیجہ میں فن اسماء الرجال اور فن جرح و تعدیل وجود میں آیا۔ ان اسفار کا مقصد شیوخ حدیث اور اکابر اُمت سے تبرکاً ملاقات کسی کے پیش نظر نہیں تھا۔ جیسا کہ موجودہ زمانہ میں ہوتا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ حدیث کی صحت اور ضعف، کا دارو مدار راوی کے مجروح و ثقہ ہونے پر منحصر ہے، تدوین حدیث کے سلسلہ میں اسکی اہمیت و ضرورت اور بڑھ جاتی تھی، ان سفروں سے جہاں ذخیرۂ حدیث کی فراہمی میں مدد ملتی تھی وہیں روایتوں کی صحت و ضعف کا علم بھی علی وجہ البصیرۃ حاصل ہو جاتا تھا، ان سفروں کو بڑی اہمیت حاصل تھی یہاں تک کہ جو لوگ طلب حدیث کے سلسلے میں اسفار نہیں کرتے تھے ان کا درجہ محدثین کی مجلسوں میں بہت کمتر سمجھا جاتا تھا، یحییٰ ابن معین فرماتے ہیں:

اربعۃ لا تونس منھم، رشدا منھم رجل یکتب فی بلدہ ولا یرحل فی طلب الحدیث [1]

چار طرح کے لوگوں میں صحیح علمی بصیرت نہیں پیدا ہو سکتی، ان میں سے ایک وہ لوگ ہیں جو طلب حدیث میں اپنا وطن نہیں چھوڑتے ہیں۔

ابن ادہمؒ کہا کرتے تھے کہ:

ان اللہ یرفع البلاء عن ھذہ الامۃ برحلۃ اصحاب الحدیث [2]

اللہ تعالیٰ طلب حدیث کے سلسلہ میں سفر کرنیوالوں کی برکت سے اس امت کو بہت سی بلاؤں سے محفوظ رکھتا ہے،

---

[1]:۔ الرحلۃ فی طلب الحدیث للبغدادی ص ۸۷۔

[2]:۔ ایضاً ص ۸۷ و فتح المغیث ج ۲ ص ۳۱۵۔

تحصیلِ حدیث کے سلسلہ میں اسفار کی اس اہمیت کے باوجود یہ بھی ایک طے شدہ اصول تھا کہ ترکِ وطن سے پہلے اپنے شہر کے اہل علم اور شیوخ حدیث کی مجلسوں میں شریک ہو کر ان کے علوم کو حاصل کرے پھر اپنے وطن کے قرب و جوار میں واقع شہروں اور قریوں کے اہل علم سے استفادہ کو مکمل کرنے کے بعد دور دراز کے علمی مرکزوں کا سفر اختیار کرے،

ابوزرعہ نے بھی اس اصول کو مدنظر رکھا، انھوں نے سن شعور کے ابتدائی مرحلوں میں رے کے محدثین سے سماع حدیث کے بعد اپنے علمی سفر کا آغاز کیا، خود ابوزرعہ کا بیان ہے:

کتبت بالری قبل ان اخرج الی العراق عن نحو ثلاثین شیخا، منهم عبد الله بن الجراح التیمی ابو محمد القهستانی نزیل الری، عبد العزیز بن المغیرة المنقری ابو عبد الرحمن البصری نزیل الری، عبد الصمد بن حسان المروزی خادم سفیان الثوری جعفر بن عیسی البصری قاضی الری بشر بن یزید بن الازهر النیسابوری، سلمة بن بشیر النیسابوری نزیل الری عبید بن اسحاق العطار ابو عبد الرحمن الکوفی[1]

سفر عراق سے پہلے میں اپنے شہر کے تقریباً ۳۰ شیوخ حدیث سے حدیثیں لکھ چکا تھا، ان میں سے چند نام یہ ہیں عبد اللہ بن الجراح تیمی ابو محمد قہستانیؒ (متوفی ۲۳۲ھ) عبد العزیز بن مغیرہ منقری بصریؒ، عبد الصمد بن حسان مروزی خادم سفیان ثوریؒ۔ جعفر بن عیسیٰ بصری قاضی رےؒ (متوفی ۲۱۹ھ) بشر بن یزید بن الازہر نیشاپوریؒ، سلمہ بن بشیر نیشاپوریؒ۔ عُبید بن اسحاق عطار ابو عبد الرحمن کوفیؒ وغیرہ

---

[1] :- تقدمۃ الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم ص ۳۳۵ ـ بقیہ صفحہ آگے پر ـ

ابوزرعہ سے پوچھا گیا کہ آپ نے فضل بن دکین (متوفی ۲۱۸ھ) سے کس سال حدیثیں لکھیں تو انھوں نے کہا کہ ۲۱۴ھ میں یعنی اس وقت جب آپ کی عمر بیسویں سال میں داخل ہو چکی تھی[۱]۔

پہلا سفر ابوزرعہ نے پہلا علمی سفر ۲۰ سال کی عمر میں کوفہ کا کیا ہے جو اس زمانہ میں علم وفن کا اہم ترین مرکز تھا، گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں علماء ومحدثین کی مجالس درس قائم تھیں، ہر طرف علم وفن، تعلیم وتعلم، درس وتدریس کی چہل پہل تھی، واردین وصادرین کا کوفہ میں ایک تسلسل لگا ہوا تھا، ابوزرعہ کا یہ سفر ٹھیک اسی طرح کے ایک قافلے کے ساتھ تھا جیسے سوداگروں اور بیوپاریوں کا قافلہ چلا کرتا تھا، کیونکہ راستے خطرات سے خالی نہیں تھے، تنہا سفر کرنا ممکن نہ تھا۔

اس سفر میں آپ کے دس مہینے لگے، اسی سفر میں آپ نے کوفہ کے مشہور محدث ابونعیم فضل بن دکین سے حدیثوں کا سماع کیا۔

بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ

۲ : تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۱۶۹۔

۳ : الجرح والتعدیل ج ۲ ص ۳۹۷۔

۴ : الجرح والتعدیل ج ۳ ص ۵۴۱۔

۵ : میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۳۴ ۔ ۱۴۳۔

۶ : الجرح والتعدیل ج ۲ ص ۱۵۷۔

۷ : الجرح والتعدیل ج ۲ ص ۱۵۷۔

۸ : ایضاً ج ۲ ص ۱۰۴۔

---

۱ : تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۳۳۹۔

دوسرا سفر ابوزرعہ کا دوسرا علمی سفر طویل ترین سفر تھا اور اسی کے ساتھ ان کا یہ سفر استفادہ و افادہ کے لحاظ سے اہم ترین بھی تھا، یہ سفر ۲۲۷ھ سے شروع ہو کر ۲۳۲ھ کے ابتدائی مہینوں تک جاری رہا، اس سفر میں انھوں نے بہت سے علمی مرکزوں سے استفادہ کیا، مختلف شہروں اور دور دراز گاؤں میں پہونچ کر وہاں کے اہل علم سے علم حدیث حاصل کیا، خود ابوزرعہ نے اپنے اس سفر کی روداد بیان کی ہے اس لیے اُن ہی سے یہ رُوداد سماعت فرمائیں، وہ کہتے ہیں کہ:

"میں دوسری بار ۲۲۷ھ میں رے سے نکلا اور ۲۳۲ھ میں رے واپس آیا، اس سفر میں سب سے پہلے میں نے مکہ پہونچ کر فریضۂ حج ادا کیا، حج سے فراغت کے بعد مصر پہونچا، مصر میں میں نے پندرہ مہینے گزارے جبکہ آغاز سفر کے وقت مصر میں کم سے کم قیام کا ارادہ تھا لیکن وہاں پہونچ کر جب میں نے علمی چہل پہل دیکھی، ہر طرف افادہ و استفادہ کا ولولہ انگیز سلسلہ جاری پایا تو میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اور مصر میں میرے قیام کی مدت دراز سے دراز ہوتی چلی گئی، اسی طرح امام شافعیؒ کی کتابوں کے سماع کا بھی میرا ارادہ نہیں تھا لیکن جب میں نے غیر معین قیام کا ارادہ کر لیا تو میں نے ایسے شخص کی جستجو کی جو امام شافعی کی کتابوں سے بہتر طور پر واقف ہو، جب ایسا شخص مل گیا اور میں نے اجرت پر نقل کرنے کا معاملہ طے کر لیا میرے پاس دو کپڑے اپنی ضرورتوں کے لیے تھے، ان کو فروخت کر کے کاغذ خریدا اور اس شخص کے حوالے کر دیا [۱]"

قیام مصر کے زمانہ میں ابوزرعہ کے فضل و علم کو جو شہرت ملی اور محدثین مصر کے نزدیک

---

[۱] تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۳۴۰ ۔

جو ان کو مقام و مرتبہ حاصل ہوا اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ کے مشہور شاگرد ربیع بن سلیمان کہتے ہیں:

لم نلق مثل ابی زرعۃ و ابی حاتم قدم علینا من العلماء، سلہ۔	جتنے علماء مصر آئے ان میں ابوزرعہ اور ابو حاتم جیسا کوئی عالم نہیں آیا۔

تیسرا سفر تیسرے علمی سفر کا واقعہ بھی خود ابوزرعہ نے بیان کیا ہے انھوں نے بتایا ہے کہ اس سفر میں شام عراق اور مصر میں ساڑھے چار برس صرف ہوئے، اس مدت میں ہر جگہ حسب حالات قیام کر کے وہاں کے مشاہیر شیوخ حدیث سے انہوں نے استفادہ کیا، حدیثوں کا سماع کیا، ان کی کتابوں کو نقل کیا غرضیکہ علم حدیث کی تحصیل میں شب و روز کا ہر لمحہ لگا دیا اور ہر چھوٹے بڑے شہر اور گاؤں تک پہونچنے کی کوشش کی جہاں بھی کوئی قابل ذکر محدث کی خبر ملی، حتی کہ بعض حدیثوں کے سماع کے لیے وہ اسلامی قلمرو کے سرحدی مقامات پر واقع فوجی چھاؤنیوں میں بھی تشریف لے گئے جہاں غیر فوجی کو جانے کی اجازت نہیں تھی، انھوں نے مرابط بن کر ان فوجی چھاؤنیوں میں مہینوں گزارے اور وہاں قیام پذیر ہو کر محدثین سے علم حدیث حاصل کیا۔ خلیلی نے ابوزرعہ کے شاگرد برذعی کا بیان نقل کیا ہے، برذعی کہتے ہیں،

سمعت ابا زرعۃ الرازی یقول لم	میں نے ابوزرعہ رازی سے سنا وہ کہتے تھے،
اعرف لنفسی رباطاً خالصاً فی ثغرہ	کہ میں فوجی چھاؤنیوں میں مرابط بن کر
قصدت قزوین مرابطاً ومن ھمتی	داخل ہوا میرا مقصد صرف سماع حدیث تھا
ان اسمع الحدیث من الطنافسی و	میں قزوین کی چھاؤنی میں گیا میرا مقصد
محمد بن سعید بن سابق ودخلت	وہاں علی بن محمد ابوالحسن الطنافسی /

سلہ: الارشاد للخلیلی ج ۶ ترجمہ ابوحاتم۔

بیروت مرابطا ومن همتي ان اسمع عن العباس بن الوليد ودخلت رها مرابطاً ومن نيتي ان اسمع عن ابي فروة الرهاوي فلا اعرف لنفسي رباطاً اخلصت نيتي فيه ثم بكى اله

(متوفی ۲۳۳ھ) اور محمد بن سعید بن سابق ابوسعید الرازی (متوفی ۲۱۶ھ) سے سماع حدیث تھا۔ بیروت کی چھاؤنی میں جانے کا مقصد عباس بن الولید العذری البیروتی (متوفی ۲۷۰ھ) سے حدیث سننا تھا، رہا کی چھاؤنی میں جانے کی غرض ابوفروہ رہاوی، (متوفی ۲۱۹ھ) سے سماع حدیث تھا، ہم رباط میں جاتے رہے میری نیت خالصۃً طلب حدیث کی تھی کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا۔ یہ کہہ کر وہ رو پڑے۔

مختلف مقامات کا سفر

ابوزرعہ کے مقامات سفر کا جب تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ صرف مشہور علمی مرکزوں ہی پر اکتفاء نہیں کرتے تھے بلکہ اس مرکزی مقام پر استفادہ مکمل کرنے کے بعد اس کے اطراف وجوانب کے چھوٹے چھوٹے نسبتاً غیر مشہور مقامات کا بھی سفر کرتے تھے۔ اگر وہاں کوئی قابل ذکر اہل علم موجود ہے، چنانچہ مختلف تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابوزرعہ کے مقامات سفر میں مندرجہ ذیل شہر اور گاؤں شامل ہیں:

۱۔ قزوین جو شہر رے سے ۲۷ فرسخ پر واقع ہے، قزوین کے مشاہیر علماء، محدثین میں ابوعبداللہ بن ماجہ، موسیٰ بن ہارون بن حبان، حسین بن علی طنافسی، احمد بن ابراہیم بن سمویہ العجلی، اسحاق بن محمد الکسائی اور ابوبکر بن ہارون بن الحجاج سے حدیث کا سماع کیا اور ان سے علمی استفادہ کیا، یہ سفر ۲۱۴ھ سے قبل ہوا تھا۔ [۲]

---

[۱] [۲] الارشاد ۶۷ ب فی علماء قزوین۔

۲۔ ابوزرعہ نے علماء "ساوہ" سے بھی اکتساب فیض کیا، ساوہ رے اور ہمدان کے وسط میں واقع ہے، دونوں جگہ سے اس کی مسافت ۳۰ فرسخ ہے، ساوہ کے مشہور محدث عیسیٰ بن موسیٰ المعروف بغنجار (متوفی ۱۸۶ھ) کے شاگرد محمد بن امیۃ الساوی کے پاس ان کی حدیثیں تھیں، ان حدیثوں کے سماع کے لیے یہ سفر کیا گیا تھا۔

۳۔ نیساپور اسلامی علوم و فنون کا ایک بڑا مرکز رہا ہے، نیساپور میں ان دنوں مشہور محدث و فقیہ اسحاق بن راہویہ، ابو یعقوب الحنظلی المعروف بابن راہویہ المروزی (متوفی ۲۳۸ھ) قیام پذیر تھے، ابوزرعہ کا یہ سفر انہی سے سماعت حدیث کے لیے تھا، ابوزرعہ کی نیساپور میں آمد کو ابن راہویہ نے کتنی اہمیت دی تھی اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب ان سے کہا گیا کہ ایک نوجوان عالم ابوزرعہ آپ کے پاس استفادہ کے لیے آئے ہوئے ہیں تو ابن راہویہ نے کہا کہ:-

بلغنی ان ھذا الفتی دار وقد اعددت مائۃ وخمسین الف حدیث القیھا علیہ خمسون الفامنہا معلولات لاتصح [۱]	ہاں مجھے خبر ملی ہے، میں نے ڈیڑھ لاکھ حدیثیں ان کے لیے تیار رکھی ہیں، جن میں پچاس ہزار حدیثیں معلول ہیں یہ سارا ذخیرۂ حدیث ان کو پیش کروں گا۔

یہ ذہن میں رہے کہ ابن راہویہ کا یہ اہتمام اس نوجوان کے لیے ہے، جس کی عمر صرف بیس سال کی تھی۔

۴۔ ابوزرعہ کا سفر بغداد ان کے علمی اسفار میں ایک اہم ترین سفر ہے، انھوں نے بغداد کا سفر ایک سے زائد بار کیا ہے جیسا کہ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں تفصیل سے لکھا ہے، یہ سفر افادہ و استفادہ دونوں اعتبار سے ممتاز تھا۔ ایک طرف وہ عالم اسلام کی مشہور

---

[۱]:- الارشاد ج ۹ فی ترجمۃ اسحاق بن راہویہ۔

ترین شخصیت امام احمد بن حنبلؒ سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں، دوسری طرف علماء بغداد میں ابراہیم بن اسحاق الحربی، عبداللہ بن احمد بن حنبلؒ اور قاسم بن زکریا المطرز وغیرہ محدثین ابوزرعہ سے سماع حدیث کرتے ہیں۔ [1]

امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے حضرت عبداللہ کا بیان ہے کہ:

لما ورد علینا ابو زرعۃ نزل عندنا فقال لی ابی یا بُنی قد اعتضت بنوافلی مذاکرۃ ھذا الشیخ [2]

ابوزرعہ جب بغداد آئے تو وہ ہمارے یہاں ہی اترے اس وقت والد صاحب نے کہا کہ صاحبزادے میں اپنی نفل نمازوں کے بدلے اس شیخ سے تذاکرۂ حدیث کرونگا۔

یوں تو حضرت امام احمد بن حنبلؒ ابوزرعہ کے استاذ اور شیخ حدیث تھے اور ابوزرعہ نے بھی آپ سے استفادہ میں کوئی کمی نہیں کی، لیکن دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل کو بہت سی حدیثوں کی صحت میں تردد تھا اور ان روایتوں کی صحت کو آپ نے ابوزرعہ کے ذریعہ جانا، چنانچہ ایک مشہور روایت کے سلسلہ کا ایک واقعہ ہے، خطیب بغدادی نے اس واقعہ کو محمد بن صالح بغدادی کی روایت سے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ "

رأیت ابا زرعۃ دخل علی احمد بن حنبل وحدثنا ورأیتہ قد تجمج علی حدیث کان حدثہ عبد الرزاق عن معمر عن منصور عن جابر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا سجد جافی بین جنبیہ، قد تجمج علیہ احمد فقال

حضرت ابوزرعہ امام احمد بن حنبل کے پاس آئے اور انھوں نے حدیث بیان کی تو میں نے دیکھا کہ حضرت امام کو اس حدیث کو قبول کرنے میں تردد ہوا تو ابوزرعہ نے امام صاحب سے کہا کہ اس حدیث کے بارے میں کیا تردد ہے؟

---

[1]: تاریخ بغداد للخطیب ج ۱۰ ص ۳۲۶۔

[2]: ایضاً ص ۳۲۷۔

فقال لہ ابوزرعۃ ای شئ خبر ھٰذا! انھوں نے فرمایا کہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ یہ حدیث صحیح
الحدیث فقال اخاف ان یکون غلطاً نہیں ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف
علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلط منسوب ہے۔

اس کے بعد کا واقعہ یہ ہے کہ ابوزرعہ نے کہا کہ حضرت! یہ حدیث صحیح ہے اور پھر ابوزرعہ نے دو صحیح ترین سندوں سے اس حدیث کو امام صاحب کے سامنے پیش کیا، تب امام صاحب نے اس حدیث کی صحت پر اظہار اطمینان کیا اور ابوزرعہ سے فرمایا کہ ذرا قلم دیجئے، اور ان کے ہاتھ سے قلم لے کر اپنی کتاب میں آپ نے صحٓ، صحٓ، صحٓ تین بار لکھ دیا۔[۱]

۵۔ ابویعلی الموصلی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوزرعہ شہر واسط میں بھی کچھ قیام کرکے افادہ واستفادہ میں مصروف رہے، ان کے الفاظ ہیں:-

کتبنا بانتخابہ بواسط ستۃ الاف[۲] ہم نے واسط میں ان کی چھ ہزار منتخب حدیثوں کو لکھا ہے۔

۶۔ انبار سے چند فرسخ کے فاصلہ پر حدیثۃ النورۃ واقع ہے، مصر سے واپس ہوتے ہوئے یہاں بھی آپ نے قیام کیا اور وہاں کے مشہور محدث سُوید بن سعید بن سہل بن شہریار الہروی ابومحمد الحدثانی الانباری نزیل حدیثۃ النورہ (متوفی سنہ ۲۴۰ھ) جو امام مسلم، ابن ماجہ وغیرہ کے شیوخ میں سے ہیں، ان سے استفادہ کیا۔ ابوزرعہ کی ان کے بارے میں رائے ہے :-

اما کتبہ فصحاح وکتب اتتبع اصولہ ان کی کتابیں تو سب کی سب صحیح ہیں، ان
واکتب منھا فاما اذا حدث من کی روایت کرنا صحیح ہے جو انہوں نے اپنے

۱؎ : تاریخ بغداد للخطیب ج ۱۰ ص ۳۲۷۔

۲؎ ایضاً ص ۳۳۴ و تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۲۔

حفظہ فلا[1] حافظہ کی مدد سے بیان کیں وہ میں نے نہیں لکھیں۔

ابوزرعہ کی اس رائے کا وزن امام بخاری کی اس تشریح سے معلوم ہوتا ہے، جو انہوں نے سوید بن سعید کے بارے میں پیش کی ہے، امام بخاری نے لکھا ہے:

کان قد عمی فیلقن مالیس من حدیثہ[2] بعد میں نابینا ہو گئے تھے لوگ ان کی روایتوں میں آمیزش کر کے روایت کرنے لگے تھے۔

۷۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں بصرہ علم حدیث کا ایک اہم ترین مرکز تھا۔ اس لیئے ابوزرعہ ایک سے زائد بار بصرہ تشریف لے گئے اور بصرہ کے بیشتر محدثین سے انہوں نے استفادہ کیا، اسی کے ساتھ ساتھ علماء بصرہ بھی حضرت ابوزرعہ کے قدر شناس اور ان کی عظمت وفضیلت کے معترف تھے ابن ابی حاتم کا بیان ہے: کہ حضرت ابوزرعہ نے بتایا کہ جب ہم بصرہ میں تھے تو حضرت ابوالولید الطیالسی جو اپنے دور کے امام حدیث تھے انھوں نے ہم سے کہہ رکھا تھا:

اذا کان عندنا قوم فلا تستاذنوا فلیس علیکم حجاب[3] جب لوگ میرے پاس ہوں تو آپ کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں بے تکلف چلے آئیں۔

ابوزرعہ نے مزید بتایا کہ کبھی کبھی وہ دسترخوان پر ہوتے تھے تو ہمیں اپنے ساتھ کھانے پر مجبور کر دیا کرتے تھے، ابوزرعہ نے ان سے بہت سی حدیثیں لکھیں لیکن وسعت علم اور تحقیق وتنقید کی فطری صلاحیتوں سے کام لے کر ان حدیثوں میں سے جو ان کے معیار صحت پر پوری اترتی تھیں انھیں لکھ لیتے تھے، بقیہ مرویات کو ترک کر دیتے تھے۔

---

[1]: تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۳۰۔

[2]: تہذیب التہذیب ج۴ ص ۲۷۲۔

[3]: تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۳۴۵۔

اسی طرح ابو زرعہ نے بصرہ کے دوسرے مشہور محدث ابوسلمہ التبوذکی سے دس ہزار حدیثیں لکھیں، بصرہ میں بعض مواقع پر اُن کے علم وفضل کا امتحان بھی لیا گیا لیکن جب انھوں نے ایک سے زائد ثبوت پیش کیے تو وہ مطمئن ہو گئے، جیسا کہ سلیمان الشاذ کوفی کی مجلس درس کا واقعہ ہے جب انھوں نے ان کی کئی روایتوں پر تنقید کی تو انھوں نے غصہ کا اظہار کیا لیکن ابو زرعہ کے بحر مواج نے اس آتش غضب کو بجھا دیا۔[1]

۸۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کو جو امتیاز اور خصوصیت حاصل تھی اسکی وجہ سے ہر صاحب علم کے لیے تکمیل علم کے لیے ان دونوں مقدس شہروں کے اہل علم سے استفادہ ضروری تھا، ابو زرعہ نے اپنے دوسرے سفر میں جو ۲۲۷ھ سے شروع ہو کر اوائل ۲۳۲ھ میں ختم ہوتا ہے ان دونوں شہروں کے محدثین وعلماء سے استفادہ کیا، مکہ میں محمد بن عاصم بن حفص المعافری ابوعبداللہ المصری (متوفی ۲۱۵ھ) جو ان دنوں مکہ میں اقامت گزیں تھے ان سے حدیثوں کی کتابت کی۔[2]

ابو زرعہ نے مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران ہی یعقوب بن اسحاق بصری، اسی طرح موسیٰ بن حماد النخعی، محمد بن سلام بن عبداللہ بن زیاد ابوعبداللہ الایلی، عمرو بن ہاشم البیروتی سے روایتیں لیں۔

مدینہ طیبہ تین بار جانے کا اتفاق ہوا، وہاں کے مشہور محدث اسماعیل بن ابی اویس سے استفادہ کا موقعہ بعض اسباب کی وجہ سے نہ حاصل ہو سکا جیسا کہ خود ابو زرعہ نے بیان کیا:

دخلت المدینۃ ثلاث مرات وھو حی ولم یقدر لی ان اکتب عنہ شیئا	میں مدینہ تین بار گیا وہ اس وقت حیات تھے لیکن ایسے اتفاقات ہوئے کہ میں ان

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۲۹۔

[2] الجرح والتعدیل ج ۲ ص ۵۵، ۳ ایضاً ص ۲۰۴، ۱۴۰، ج ۳ ص ۲۷۸۔

سے کچھ بھی نہ لکھ سکا۔

قلت - القائل البرذعی - وکیف ذلک؟ سائل برذعی نے کہا، وہ کیونکر؟ توانہوں نے

قال کان مرۃ علیلاً ومرۃ متواریاً فرمایا کہ ایک بار تو وہ صاحب فراش تھے،

وکان مرۃ غائباً [۱] ایک بار وہ روپوش تھے ایک باران کے سلسلہ

میں کوئی خبر ہی نہیں ملی کہ وہ کہاں ہیں؟

۹۔ حضرت ابوزرعہ شام کے مشہور شہروں میں بھی طلب حدیث کے سلسلے میں تشریف لے گئے، پورے شام میں دمشق کو خصوصی اہمیت حاصل تھی، اسلامی حکومت کا دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے یہاں بہت سے صحابہ کرامؓ اقامت گزین تھے، ان کی ذات سے احادیث نبویؐ کا فیضان عام ہوا، پھر ان کے بعد ان سے استفادہ کرنے والے تابعین و تبع تابعین کا وہ مرکز رہا، بڑے بڑے محدثین نے وہاں اپنی مسند درس بچھائی، حضرت ابوزرعہ اس سے کیسے صرف نظر کر سکتے تھے، آپ نے ایک سے زائد بار شام کے شہروں کا سفر کیا، شہر دمشق کے ایک درجن سے زائد محدثین کے نام ملتے ہیں جن سے امام ابوزرعہ نے روایتیں لی ہیں، حلب میں متعدد محدثین سے سماع حدیث کیا۔

ابوزرعہ جس شہر میں تشریف لے جاتے وہاں تکمیل استفادہ کے بعد اس بات کی بھی جستجو کرتے کہ اطراف و جوانب میں کہاں کہاں محدثین اور اہل علم موجود ہیں، اور جب پتہ چل جاتا تو وہاں آپ تشریف لے جاتے چنانچہ حران سے دو فرسخ کے فاصلہ پر ایک آبادی تھی، وہاں جاکر آپ نے مخلد بن مالک سے علم حدیث حاصل کیا۔ [۲]

اسی طرح عسقلان، بیروت، مصر اور راہ میں پڑنے والی آبادیوں میں رک رک کر اہل علم سے استفادہ کرتے رہے غرضکہ حضرت ابوزرعہ نے سن شعور کو پہونچتے

---

[۱] :۔ اجوبہ ابی زرعہ علی اسئلۃ البرذعی ورق ۳۹ بحوالہ ابوزرعہ الرازی وجہودہ فی السنۃ النبویہ ج۱ ص ۷۵

[۲] :۔ الجرح والتعدیل ج۳ ص ۳۴۹۔

ہی جو علمی اسفار کا سلسلہ شروع کیا تو اس وقت تک وطن میں سکون کے ساتھ نہ بیٹھے جب تک ان کے پاس احادیث نبوی کا عظیم ترین ذخیرہ نہ جمع ہو گیا، چونکہ ان اسفار میں افادہ واستفادہ دونوں کا سلسلہ جاری تھا اس لیے اہل علم اور محدثین نے ابوزرعہ کے مقام و مرتبہ کو بھی اچھی طرح پہچان لیا جیسا کہ مصر کے مشہور محدث حافظ حدیث یونس بن عبد الاعلیٰ نے کہا ہے:

ابازرعۃ اشہر فی الدنیا من الدنیا ؎۱	ابوزرعہ کی دنیا میں شہرت دنیا سے زیادہ ہے۔

ان اسفار میں ابوزرعہ نے ۵۶ شیوخ حدیث سے حدیث کا سماع کیا ان کی روایتوں کو قلم بند کیا ان کے علاوہ ۲۴ وہ شیوخ حدیث ہیں جن سے خط وکتابت کے ذریعہ علم حدیث حاصل کیا اور ان کی روایتوں کی اجازت ملی، ۱۴ شیوخ حدیث وہ ہیں جن سے ملاقات کے باوجود ابوزرعہ نے ان سے روایتیں نہیں لیں ؎۲، کیونکہ ان کی روایتیں ابوزرعہ کے مقرر کردہ معیارِ تحقیق پر پوری نہیں اترتی تھیں، چند ایسے شیوخ حدیث ضرور ہیں جن کے ضعف کے باوجود بھی ابوزرعہ نے ان کی روایتوں کو ذکر کیا ہے، اس کا یہ معنی نہیں کہ ان کو ان کے ضعف کا علم نہیں، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ روایتیں انھوں نے بطور استشہاد اور شہادت زائدہ کے طور پر لی ہیں جیسا کہ صحیح بخاری میں امام بخاریؒ نے کیا ہے، کہیں بنیادی طور پر ان کو نہیں لیا گیا ہے، ابوزرعہ سے روایت کرنے والوں اور ان کے تلامذہ کی تعداد تلاش وتفحص کے بعد ۶۸ ملتی ہے۔ ؎۳

؎۱:۔ تاریخ دمشق لابن عساکر فی ترجمۃ ابی زرعہ۔

؎۲:۔ ابوزرعۃ الرازی وجھودہ فی السنۃ النبویہ ج ۱ ص ۸۵ تا ص ۱۵۸ میں تفصیل دیکھئے۔

؎۳:۔ تفصیل کے لیے دیکھئے ابوزرعۃ الرازی وجھودہ فی السنۃ النبوی از ص ۱۶۳ تا ص ۱۷۲۔

فضائل وکمالات

علم القرأت جو خالص اسلامی فنون میں سے ایک ہے، قرآن کے اندر مختلف قرأتیں ہیں، ان قراءتوں کی روایت کرنے والے بھی الگ الگ ہیں، ابوزرعہ نے چودہ مشہور راویان قرأت سے روایتیں لی ہیں، علم القرأت میں ان کے تبحر اور وسعتِ علم کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہوتا ہے جسے خطیب بغدادی نے پوری سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔

عن اُم عمر وبنت شمر قالت سمعت سوید بن غفلۃ یقرأ عیسیٰ عین یرید حور عین، قال صالح القیت ھذا علی ابی زرعۃ فبقی متحیرًا وقال انا احفظ فی القراءات عشرۃ الاف حدیث قلت، فتحفظ ھذا؟ قال، لا ۔ [1]

ام عمرو بنت شمر نے کہا کہ میں نے سوید بن غفلہ کو حور عین کی جگہ عیسیٰ عین پڑھتے ہوئے سنا تو راوی صالح نے کہا کہ میں نے یہ بات ابوزرعہ کے سامنے پیش کی، انھوں نے بڑی حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ میں قرأت کے سلسلے میں دس ہزار حدیثیں یاد رکھتا ہوں مجھے کسی روایت میں یہ قرأت نہ ملی۔

ابن رجب ابوزرعہ کا بیان نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک دن فرمایا کہ :-

انا احفظ ست مائۃ الف حدیث صحیح واربعۃ عشر الف اسناد فی التفسیر والقراءات [2]

میرے حافظہ میں چھ لاکھ صحیح حدیثیں ہیں اور چودہ ہزار سندیں تفسیر اور قراءتوں کے سلسلہ میں ہیں۔

روایت ودرایت کے اصول جو ابوزرعہ کے یہاں پائے جاتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ان اصولوں پر کافی غور وخوض کے بعد ان کو قبول کیا ہے مثلاً:

---

[1] شرح علل الترمذی ص ۱۹۲ بحوالہ ابوزرعۃ الرازی ج ۱ ص ۱۲۶ ۔

[2] ایضاً

ایک مسئلہ یہ ہے کہ مراسیل حجت ہیں یا نہیں؟ اس کے متعلق ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے:

سمعت ابی وابا زرعة یقولان لا یحتج بالمراسیل ولا تقوم الحجة الا بالاسانید الصحاح المتصلة[1]

میرے والد اور ابوزرعہ دونوں کہتے ہیں کہ مرسل روایتیں حجت نہیں، صحیح سند متصل سے جو روایتیں ہیں وہی حجت بن سکتی ہیں۔

اسی طرح ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی ثقہ کسی ضعیف راوی سے روایت کرتا ہے تو کیا اس ضعیف راوی سے روایت کی جائے گی؟ ابن ابی حاتم نے ابوزرعہ سے پوچھا کہ سفیان ثوری، کلبی سے روایت کرتے ہیں جبکہ کلبی ضعیف ہے تو سفیان ثوری کا اس سے روایت کرنے کا کیا مقصد ہے؟ کیا ان کے نزدیک وہ ضعیف نہیں ہے؟ اس کے جواب میں ابوزرعہ نے کہا:

کان الثوری یذکر الروایة عن الکلبی علی الانکار والتعجب لیتعلقوا عنه روایته عنه ولم تکن روایته عن الکلبی قبوله له[2]

سفیان ثوری کلبی سے جو روایت کرتے ہیں تو ان کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس کو صحیح سمجھتے ہیں بلکہ ان کا مقصد اس روایت کی غلطی کو ظاہر کرنا ہوتا ہے، نہ کہ وہ اس کو قبول کرتے ہیں۔

اس توجیہ سے معلوم ہوا کہ ابوزرعہ کے نزدیک کسی ثقہ کا کسی ضعیف راوی سے روایت کرنا اس کی تعدیل نہیں ہو سکتی۔

سندوں اور راویوں پر ان کی نگاہ کتنی گہری تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب ان سے سوال کیا گیا کہ اصح الاسانید کون ہیں تو انھوں نے فرمایا کہ الزھری عن سالم عن ابیہ عن النبی ﷺ صحیح، منصور عن ابراهیم عن علقمہ عن عبد اللہ

---

[1]: المراسیل لابن ابی حاتم ص ۱۳۔

[2]: الجرح والتعدیل ج ۱ ص ۳۶ ر ۳۷۔

عن النبی صلعم صحیح ، ابن عون عن محمد بن سیرین عن عبیدۃ السلمانی عن علی عن النبی صلعم صحیح ، ابوزرعہ سے مزید دریافت کیا گیا کہ عن سہیل بن ابی صالح عن ابیہ عن ابی ھریرۃ؟ یہ کیسی سند ہے تو انھوں نے فرمایا کہ سہیل اشبہ۔[1]

اسی طرح ابن ابی حاتم نے مختلف سندوں کو ابوزرعہ کے سامنے پیش کرکے ان کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی ہے، اس کے جواب میں جو انہوں نے باتیں لکھیں وہ بعد کے محدثین کے لیے دلیل راہ ثابت ہوئیں، ایک سند ہے، عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ، اس سند میں ابوالزناد سے روایت کرنے والے چار راوی ہیں، ابوزرعہ کے نزدیک ان چاروں راویوں میں بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے، ابوالزناد سے روایت کرنے والے ابن ابی الزناد، ورقاء، شعیب ابن ابی حمزہ، مغیرہ بن عبدالرحمٰن المدینی چار راوی ہیں، ابوزرعہ سے دریافت کیا گیا کہ ابوالزناد سے ان روایت کرنے والوں میں آپ کا پسندیدہ کون راوی ہے؟ تو آپ نے کہا کہ ورقاء ان سب میں بہتر ہے ، پھر پوچھا گیا کہ اس کے بعد کون ہے؟ تو آپ نے کہا کہ مغیرہ بقیہ دونوں سے بہتر ہے، پھر پوچھا گیا ابن ابی الزناد اور شعیب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ تو آپ نے کہا کہ ابن ابی الزناد کے مقابلہ میں شعیب بہتر ہے۔[2]

ابوزرعہ کے یہاں عنعنہ کے قبول کرنے کی شرط رویت کے ساتھ ثبوتِ سماع بھی ہے، اگر رویت ثابت ہے اور سماع کا ثبوت اور تصریح نہیں تو عنعنہ ان کے نزدیک قابل قبول نہیں، جبکہ بعض لوگوں کے نزدیک امکانِ لقاء یا رویت کافی ہے، یہی وجہ ہے کہ ابوزرعہ نے یحییٰ ابن ابی کثیر کے حضرت انس سے عنعنہ کو

---

[1] - الجرح والتعدیل ۔ ص ۔ ۲۶۔

[2] - ایضاً۔

قبول نہیں کیا کیوں کہ رویت تو ثابت ہے لیکن ان سے سماع ثابت نہیں، ان کے نزدیک اتصالِ سند اس وقت مانا جائے گا جب سماع کا ثبوت مل جائے، یہ شرط ابن المدینی اور امام بخاری کی شرط سے زیادہ کڑی ہے کیوں کہ ان کے نزدیک اتصال کے لیئے لقار اور سماع دونوں میں سے ہر ایک کافی ہے، جبکہ ابوزرعہ کے نزدیک صرف لقار کافی نہیں، جب تک کہ سماع کی تصریح نہ ہو، ؎

تصانیف ابوزرعہ نے سارے عالم اسلام میں چل پھر کر اپنی زندگی کے بہت بڑے حصہ میں جو علوم ومعارف کا ذخیرہ کیا ہے، اس کا اندازہ مذکورہ بالا تفصیل سے ہو چکا ہوگا۔ اسی سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تصانیف کتنی اہم رہی ہونگی لیکن افسوس کہ آج ان کی اکثر تصانیف ناپید ہیں اگر ابن ابی حاتم اور برذعی کی کتابیں نہ ہوتیں تو آج ہم ان کتابوں کے ناموں سے قطعاً ناواقف ہوتے، البتہ ان سے استفادہ کرنے والوں نے ان کے بہت سے علوم ومعارف کو اپنی کتابوں میں محفوظ کر لیا ہے، تنہا ابن ابی حاتم کی کتابیں جو طبع ہو کر عام ہو چکی ہیں، ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ ابوزرعہ کے علوم ومعارف پر مشتمل ہے، فن اسمار الرجال اور جرح وتعدیل میں اپنے والد ابوحاتم اور ابوزرعہ کے جتنی کثرت سے اقوال نقل کیے ہیں اس سے ابوزرعہ کی راویوں کے بارے میں ان کی وسیع معلومات کا پتہ چلتا ہے، ابن ابی حاتم اپنی کتابوں میں جرح وتعدیل، علل الحدیث، مراسیل اور بیان خطأ البخاری، اعتقاد اہل السنۃ وتفسیر کے سلسلہ میں ابوزرعہ کی آرار کا مسلسل ذکر کرتے ہیں، ہم ابن ابی حاتم اور برذعی کی کتابوں کی مدد سے ابوزرعہ کی کتابوں کے جتنے نام ملتے ہیں، اور ان کی مشتملات کا جو علم حاصل ہوتا ہے ان کی روشنی میں ابوزرعہ کی تصانیف کا ایک اجمالی تعارف پیش کراتے ہیں۔

؎ شرح علل الترمذی ص ص ۲۷۷-۲۷۸-۲۷۹-

المسند ابوزرعہ سے پہلے اور ان کے زمانہ میں اور ان کے بعد بھی مسانید کے جمع کرنے کا سلسلہ جاری رہا، مسند، احادیث کے ایسے مجموعہ کو کہا جاتا ہے جس میں ہر صحابی کی الگ الگ روایتیں جمع کردی جاتی ہیں، چاہے وہ روایت صحیح ہو یا ضعیف، صحابہ کرامؓ کے ناموں کو حروف ہجا کے اعتبار سے ترتیب دے کر ان کی روایتوں کو جمع کر دیا جاتا تھا بعض ایسی بھی مسند ہیں جس میں کسی ایک صحابی کی روایتوں کو جمع کیا گیا ہے، جیسے مسند ابی بکر وغیرہ، بعض اور دوسرے نقطہ نظر سے بھی مسندیں جمع کی گئی ہیں، اس وقت الواب کی ترتیب کے لحاظ سے احادیث کے مجموعے کم تھے۔

ابوزرعہ کی مسند کا ذکر بھی ہمیں کتابوں میں ملتا ہے مگر اس کا کوئی نسخہ اب تک دنیا کے کتب خانوں میں دریافت نہیں ہوا ہے، لیکن متقدمین کی کتابوں میں مسند ابی زرعہ کا ذکر ضرور آتا ہے، جس سے یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے کوئی مسند جمع کیا تھا، دنیا کے بعض کتب خانوں میں جو مسانید جن ناموں سے پائے جاتے ہیں وہی نام متقدمین نے ابوزرعہ کی مسند کا بھی لیا ہے اس لیے انھیں کو مسند ابی زرعہ مان لیا گیا ہے حالانکہ محقق علماء نے اس کی تائید و تصدیق نہیں کی ہے بلکہ تحقیق اور غائر مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مسند احمد بن حنبل کے اجزاء ہیں جن کو غلطی سے مسند ابی زرعہ سمجھا گیا ہے جیساکہ برلن میں "مسند الشامیین" کے نام سے جو نسخہ ہے اس کے متعلق بڑے دعوے سے کہا گیا ہے کہ وہ مسند ابی زرعہ کا ایک جزء ہے کیونکہ مسند ابی زرعہ کا ذکر متقدمین کی کتابوں میں ملتا ہے لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ وہ مسند امام احمد بن حنبل ہی کا ایک حصہ ہے۔

مختلف کتابوں میں مسند ابی زرعہ کے حوالوں سے اس کی ترتیب کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ مسند ابی زرعہ کی ترتیب عام مسندوں کی ترتیب سے الگ تھی، ان کی

اپنی مسند میں ترتیب یہ تھی کہ سب سے پہلے عشرہ مبشرہ کی روایتوں کو جمع کیا گیا ہے، پھر مہاجرین کی حدیثوں کو، پھر انصار کی حدیثوں کو جمع کیا ہے اور پھر الگ الگ شہروں میں اقامت گزیں صحابۂ کرامؓ کی حدیثوں کو جمع کیا گیا ہے اور سب سے آخر میں شام میں مقیم صحابۂ کرامؓ کی روایتیں ہیں جن کو کچھ لوگوں نے "مسند الشامیین" کے نام سے ذکر کیا ہے، اسی طرح مسند کے مختلف اجزاء کو الگ الگ ناموں سے یاد کیا ہے مثلاً ابن ابی حاتم نے اپنی کتاب میں کہیں "مسند ابن عمر" لابی زرعہ کہا ہے اور کہیں لکھا ہے "اخرج ابوزرعۃ فی مسند المصریین" کہیں "ادخلہ ابوزرعۃ فی مسند البصریین" لکھا ہے کہیں اخرج اسم فلان ابوزرعۃ فی "مسند الشامیین" لکھا ہے، اس طرح مسند ابی زرعہ کے مختلف اجزاء کو مختلف نام دیئے ہیں، لیکن وہ سب کے سب مسند ابی زرعہ کے اجزاء ہیں، آج دنیا میں "مسند ابی زرعہ" کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔[1]

---

[1] یہ ساری تفصیل الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم میں موجود ہے۔

ایران کی ایک عظیم شاعرہ
پروین اعتصامی تبریزی

(سعیدہ خان ایم، اے، لکچرار شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ۔)

فارسی زبان دنیا کی شیریں اور دل کش ترین زبانوں میں سے ہے اور فارسی شاعری میں کئی ایسے تخلیقی شاہ کار پائے جاتے ہیں جو عالمی ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔ جیسے مولانا جلال الدین رومی کی "مثنوی" اور فردوسی طوسی کا "شاہنامہ" وغیرہ۔

فارسی شاعری کی تاریخ بنانے میں جہاں ہزاروں مردوں نے اپنا جگر خون کیا ہے، وہاں خواتین نے بھی اس راہ میں کہیں کہیں اپنے قدموں کے پختہ نقوش ثبت کیے ہیں۔ اور اس لالہ زار سخنوری کی گل گشت میں ایرانی پری جمالوں کے ساتھ ساتھ افغانی مہ لقائیں اور ہندوستانی گوریاں بھی محوخرام نظر آتی ہیں۔

چوتھی صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری تک حسن و ادا کی بہت سی پتلیوں نے بساط شاعری پر جلوہ پاشیاں کی ہیں، جن میں سب سے زیادہ مرکز نظر بننے والی زہرہ دشوں کے نام اس طرح ہیں:۔

۱۔ اپنے غلام کے ساتھ عشق کی شطرنج کھیلنے والی امیرزادی، رابعہ قزداری (چوتھی صدی ہجری)

۲۔ گنجہ کے خطیب زادے کی عاشقہ و معشوقہ، مہستی گنجوی (چھٹی صدی ہجری)

۳۔ بابی مذہب کی مبلغ اور اباحیت کے فلسفے کی علمبردار، قرۃ العین قزوینی (تیرہویں صدی ہجری)

۴:۔ حد سے بڑھے ہوئے ادبی ذوق اور شاعرانہ مزاج کی وجہ سے ایک سنجیدہ شوہر کے ساتھ نباہ نہ کر سکنے والی پروین اعتصامی تبریزی (چودھویں صدی ہجری)

ان میں موخر الذکر (پروین) کو اپنے علمی ذوق اور غیر معمولی شاعرانہ لیاقت کی بنا پر بقیہ تمام شاعرات پر تفوق حاصل ہے۔

پروین اعتصامی کا باپ یوسف اعتصامی اپنے وقت کا معروف سیاسی رہنما اور اہل قلم تھا۔ اس کی متعدد طبعزاد اور دوسری زبانوں سے ترجمہ کی ہوئی کتابیں چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں۔ اور اس کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے "بہار" کی فائلیں اب بھی کتابی شکل میں مجلد تہران کے بک سیلر فروخت کرتے ہیں۔ پروین اعتصامی ایران کے اسی مشہور لیڈر اور مصنف کی ذہین اور تعلیم یافتہ بیٹی تھی۔

پروین ۱۲۸۵ شمسی میں اپنے آبائی شہر تبریز میں پیدا ہوئی۔ بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ تہران آگئی اور باقی عمر شہر تہران کے اندر بسر کی۔ فارسی اور عربی ادبیات کی تعلیم اس نے اپنے باپ سے حاصل کی اور ۱۳۰۲ شمسی میں تہران کے زنانہ امریکن کالج کا نصاب مکمل کیا۔ ۱۳۱۲ شمسی میں اپنے چچا کے بیٹے کے ساتھ شادی کی۔ لیکن یہ شادی اس کی طبیعت کو راس نہ آئی اور وہ ڈھائی ماہ سے زیادہ شہر کرمان شاہ میں اپنے شوہر کے پاس نہ رک سکی۔ اور اپنے باپ کے گھر لوٹ آئی اور نو ماہ کے بعد باقاعدہ طلاق حاصل کر لی۔ غالباً پروین کے یہ اشعار اسی دور کی یادگار ہیں ؎

ای گل تو ز جمعیت گلزار چہ دیدی
جز سرزنش و بد سری خار چہ دیدی
ای لعل دل افروز تو با این ہمہ پرتو

جز مشتری سفلہ بہ بازار چہ دیدی
رفتی بچمن، لیک قفس گشت نصیبت
ای مرغ گرفتار چہ دیدی عز از قفس

ان میں سے پہلے شعر میں پروین نے خود کو ایسے پھول سے تشبیہ دی ہے جس کو چمن میں کانٹوں کی جھڑکیوں اور بدمزاجی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دوسرے شعر میں وہ خود کو دل کو روشن کرنے والا لعل بتاتی ہے اور بے وقوف بازاری خریدار کہہ کر اپنے شوہر کی ہجو کرتی ہے اور تیسرا شعر واضح طور پر بیتا رہا ہے۔ کہ وہ شادی کے بعد شوہر کے گھر میں باپ کے گھر سے زیادہ آزاد اور بے باک رہنا چاہتی تھی۔ اور چونکہ اس کی توقع پوری نہ ہو سکی اسی لئے شوہر سے قطع تعلق کر کے اور اس کو احمق بنا کر اپنے دل کو مطمئن کر رہی ہے۔

بہرحال اس کے بعد پروین نے دوسری شادی نہیں کی اور ۱۳۲۰ شمسی میں جب اس کی عمر ۳۵ سال کی تھی بارہ روز چیچک کی بیماری میں مبتلا رہ کر اس کی موت واقع ہو گئی اور اس کی نعش شہر قم لے جا کر اس کے خاندانی مقبرے میں اس کے باپ کی قبر کے نزدیک دفن کر دی گئی۔ اس کے سنگ مزار پر خود اسی کا موزوں کیا ہوا یہ قطعہ کندہ ہے۔ ؎

ایں کہ خاک سیہش بالین است	اختر چرخ ادب پروین است
گرچہ جز تلخی ایام ندید	ہرچہ خواہی، سخنش شیریں است
صاحب آں ہمہ گفتار، امروز	سائل فاتحہ و یاسین است
دوستاں بہ کہ زوی یاد کنند	دل بی دوست دل غمگین است
خاک در دیدہ، بسی جاں فرساست	سنگ بر سینہ، بسی سنگین است
ہر کہ باشی و ز ہر جا برسی	آخرین منزل ہستی، این است

آدمی ہر چہ توانگر باشد — چوں بدیں نقطہ رسد مسکین است
اندر آنجا کہ قضا حملہ کند — چارہ تسلیم وادب، تمکین است
زادن وکشتن وپنہاں کردن — دہر را رسم ورہِ دیرین است
خرم آں کس کہ دریں محنت گاہ — خاطری را، سبب تسکین است

پروین کی ذہانت اور شعر گوئی کی لیاقت بچپن سے ہی ظاہر ہونا شروع ہوگئی تھی۔ اور اس کے باپ یوسف اعتصامی سے ملاقات کے لیے جو علماء وفضلاء اور شعراء وادباء اس کے گھر آیا کرتے تھے وہ اس کی استعداد اور شاعرانہ صلاحیت پر تعجب کیا کرتے تھے۔ اور اس کی یہی فطری قابلیت تھی جس نے صرف ۳۵ سال کی عمر میں عرفی شیرازی کی طرح اسکو فارسی زبان کی ایک باکمال اور عظیم شاعرہ بنا دیا۔

پروین اعتصامی نے زندگی بھر جو کچھ کہا ہے اس کا مجموعہ کتابی شکل میں پہلی بار اس کے بڑے بھائی ابوالفتح اعتصامی نے ۱۳۱۴ شمسی میں شائع کیا تھا جس پر ملک الشعراء محمد تقی بہار خراسانی نے دیباچہ لکھا تھا۔ اس کے بعد ایک مفید فرہنگ کے اضافے کے ساتھ پروین کا دیوان متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔

عام شعرا کے دواوین کے خلاف، پروین کا تمامتر دیوان قصائد، قطعات اور چھوٹی چھوٹی اخلاقی روحانی اور فلسفیانہ مثنویوں سے عبارت ہے۔ غزل اس کے دیوان میں تلاش کرنے سے بھی دستیاب نہیں ہوگی۔ پروین کے دیوان کو ابوالفتح نے دو حصّوں میں ترتیب دیا ہے۔ پہلے جز میں مکمل اور نامکمل قصائد ہیں۔ جن کی تعداد ۴۲ ہے۔ دوسرے جز میں قطعات اور مثنویات کو محفوظ کر دیا ہے۔ مجموعی طور پر قطعات ومثنویات ۱۶۹ ہیں۔

جیسا کہ ملک الشعراء بہار نے بھی لکھا ہے: پروین کی شاعری میں دو لفظی ومعنوی اسالیب آمیختہ ہو کر ایک مستقل اسلوب بن گئے ہیں۔ اس کا اسلوب

شاعری خراسانی شعراء اور بالخصوص ناصر خسرو جیسے اساتذہ کے ساتھ (جن کا تعلق فارسی شاعری کے خراسانی اسکول سے ہے) عراق و فارس کے سعدی جیسے استاد (ان) کے اسلوب کو بھی اپنے اندر ضم کیے ہوئے ہے جس سے ایک نیا اسلوب وجود میں آتا ہے، جس میں موجودہ عہد کا خاص اسلوب تجسیم و تصویر اشیاء بھی شامل ہے۔ معنوی اعتبار سے پروین کا کلام فلاسفہ اور صوفیاء کے خیالات و افکار کی نمائندگی کرتا ہے۔

پروین کے قصائد ناصر خسرو کے قصائد کی آب و تاب رکھتے ہیں جن میں درمیان (ان کے) درمیان بہت سے ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جو سعدی اور حافظ کی زبان کی شیرینی کی یاد دلاتے ہیں۔ اس کے قصائد میں نصیحتیں ہیں، اخلاقی خوبیوں کا بیان ہے، فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے دنیا کی حقیقت پر تبصرہ ہے اور اسی کے ساتھ مآخذ و انسانی سعادت، زندگی گزارنے کا اعلیٰ و ارفع طریقہ، اور محنت کی اہمیت اور علم کی ضرورت و افادیت کو بھی دلپذیر انداز میں تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ اور بتاتی ہے کہ زندگی کے طوفانی سمندر میں عزم اور ارادے کی کشتی پر سفر کرنا چاہیے اور امید و آرزو کی فضا میں ہنر کے بازوؤں پر پرواز کرنا چاہیے۔ وہ کہتی ہے: ؎

علم سرمایۂ ہستی است نہ گنج زر و مال

روح باید کہ ازیں راہ توانگر گردد

(مال و دولت کا خزانہ نہیں، بلکہ ہستی کا سرمایہ علم ہے۔

روح کو علم کی دولت سے مالا مال ہونا چاہیے)

پروین اپنے قصائد میں سعی و عمل، امید حیات، وقت کی قدر، حصول کمال و ہنر، ہمت اور پیش قدمی اور بزرگی و نیک بختی کا راستہ دکھاتی ہے۔ ؎

دیوانگی است، قصہ تقدیر و بخت نیست

از بام سرنگوں شدن و گفتن ایں قضا است

در آسمانِ علم، عمل برتریں پر است

در کشورِ وجود ہنر بہتریں غنا است

میجوی گرچہ عزم تو ز اندیشہ برتر است

میجوی گرچہ راہ تو در کام اژدہا ست

(یہ تقدیر اور قسمت کی کہانی نہیں، دیوانگی ہے کہ چھت پر سے چھلانگ لگا دی جائے اور کہا جائے کہ حکم الٰہی یوں ہی تھا ہے۔)

(علم کے آسمان پر پرواز کے لیئے عمل سب سے بڑا پر ہے اور ملک ہستی کے اندر ہنر سب سے بہتر دولت ہے۔)

(اگر تمہارا ارادہ فکر کی حدود سے بھی بلند ہو تب بھی مسلسل جستجو کرتے رہو اور اگرچہ تمہاری آرزو کا راستہ اژدہا کے منہ سے ہو کر گزرتا ہو تب بھی چلتے ہی رہو)

قطعات و مثنویات کے اندر پروین کا اسلوب یکسر بدل جاتا ہے۔ اپنے زیادہ تر قطعات اور مثنویات میں اس نے اسلوب سوال و جواب یا صنعت مناظرہ و مکالمہ کا استعمال کیا ہے۔ صنعت مناظرہ کا استعمال اگرچہ فارسی شاعری کی ایک بہت پرانی روایت ہے، لیکن عرصے سے یہ روایت مردہ ہو چکی تھی جس کو پروین نے دوبارہ زندہ کیا اور اس کو خوش اسلوبی کے ساتھ برتنے میں تمام متقدمین پر برتری حاصل کی ہے۔

دراصل پروین کی شاعری کی اصل جلوہ گاہ اس کے قطعات ہی ہیں۔ جن میں اس کی طبیعت کا ہنر پورے کمال کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔ اس کے قطعات کے اندر بیان کی لطافت، معانی کی دقت، اور مضمون آفرینی کا ذوق ایک مناسب ترتیب و ترکیب کے ساتھ یکجا اور تحریر ہو گئے ہیں۔ قطعات کے اندر پروین نے اپنی شخصیت اور لیاقت کو پورے طور پر نمایاں کیا ہے۔ ہر قطع میں تخیل اور حقیقت کو لطیف احساسات کے ساتھ فنکارانہ طور پر جمع کر دیا ہے۔

اپنے قطعات میں پروین ماں کی ممتا اور اپنی روح کی لطافت کو، پرندوں غریب ماؤں، اور مجبور لوگوں کی زبان سے بیان کراتی ہے، کہیں وہ ایک غمگسار ماں کے روپ میں نظر آتی ہے اور کہیں مولانائے روم، شیخ عطار اور ملا کے جامی کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ے

مرغک اندر بیضہ چوں گردید بید
گوید اینجا بس فراخ است وسپید
عاقبت کاں حصن از ہمت شکست
عالمی بیند ہمہ بالا و پست
گہ پرد آزاد در کہسارہا
گہ چمد سرمست در گلزارہا

(جب انڈے کے اندر چڑیا وجود میں آتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ یہ جگہ بہت وسیع اور دل کش ہے)

(آخر میں جب انڈے کا سخت قلعہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے تو اس کو ایک پوری بلند اور پست دنیا نظر آتی ہے۔)

(جہاں وہ کبھی آزادانہ پہاڑوں میں اڑان بھرتی ہے اور کبھی مستی کے عالم میں باغوں میں ٹہلتی ہے۔)

پروین کا ہنر خاص طور پر اس وقت ظاہر ہوتا ہے، جب وہ آنکھ اور پلک، دام اور دانہ، سانپ اور چیونٹی، سوئی اور قمیص، ہانڈی اور توا، مٹی اور ہوا، پرندہ اور مچھلی، شکاری اور پرندہ، شبنم، ابر اور بارش، ٹاٹ اور ہیرا، پہاڑ اور گھاس وغیرہ وغیرہ کی زبان سے گفتگو کرتی ہے، اور پڑھنے والے کو "الف لیلہ" اور "کلیلہ ودمنہ" کی دنیا میں پہنچا کر بچپن،

جوانی اور بڑھاپے کی کیفیات اور ہزاروں ظاہری اور باطنی احوال کی سیر کراتی ہے، اور انسان کو زندگی کی تاریک راہ میں امید و آرزو کی روشنی دکھا کر سکون بخشنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور چونکہ مسرت کی طرح غم بھی زندگی کا لازمہ ہے اس لیے وہ کبھی کبھی ایسی نظمیں بھی لکھتی ہے جن سے انسانی عواطف کا یہ پہلو بھی نمایاں ہوتا رہے اور اس کے لیے وہ غریب بچے، مجبور و کمزور بڑھیا اور "کمہلایا ہوا گلاب" جیسے عنوانات و موضوعات کا انتخاب کرتی ہے اور جب ان غمناک موضوعات سے افسردہ ہو جاتی ہے تو "لطفِ حق" جیسی شاہکار نظم لکھتی ہے جس کو پڑھ کر قاری اپنی تمام مایوسیوں اور اور محرومیوں کی گرد کو اپنے دامن احساس سے جھٹک کر خدا کی رحمت و کرم کے آسرے پر از سر نو زندگی کی راہ میں سعی و عمل کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی پروین کے اندر کی عورت اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر ہے، اور بقول ملک الشعراء بہار کے وہ ایک ماں کے فرائض ادا کرنا نہیں بھولی ہے۔ چنانچہ وہ حضرت موسیٰؑ کے واقعہ کا ذکر کر کے یہ بتانا چاہتی ہے کہ تمام مصائب کا علاج خدا کی مہربانی اور رحمت سے وابستہ ہے۔ ؎

مادرِ موسیٰ چو موسیٰ را بہ نیل
در فگند از گفتۂ ربِّ جلیل
خود ز ساحل کرد با حسرت نگاہ
گفت کای فرزندِ خُردِ بی گناہ
گر فراموشت کند لطف خدای
چوں رہی زیں کشتی بی ناخدای
گر نیارد ایزد پاکت بہ یاد

آب ، خاکت را دہد ناگہ بہ باد

(موسیٰؑ کی والدہ نے جب خدا کے حکم سے موسیٰؑ کو دریائے نیل میں ڈال دیا تو خود ساحل سے حسرت کے ساتھ دیکھا اور کہنے لگیں کہ اے بے گناہ ننھے سے بیٹے! اگر لطف الٰہی تجھ کو فراموش کردے تو اس بے ملاح کی کشتی کے ذریعے تو کیسے بچ سکتا ہے ۔ اگر خدائے پاک تیری خبر گیری نہ کرے تو ، یہ دریائے نیل کا پانی تجھے اچانک ہلاک کر ڈالے گا۔)

یہ درست ہے کہ پروین نے اپنی منظومات میں متقدمین کے اسلوب کے ساتھ ان کے خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے ، لیکن اس نے صرف نقل اور ترجمے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان خیالات پر اضافہ کیا ہے ، اور ان کی لطافت و معنویت کو بڑھا کر مضمون کو اپنا بنا لیا ہے ۔ مثلاً بابا طاہر عریاں کا شعر ہے ؎

زدست دیدہ و دل ہر دو فریاد

کہ ہرچہ دیدہ بیند ، دل کند یاد

یا اسی مضمون کا سعدی کا ایک شعر ہے ۔ ؎

تقصیر ز دل بود و گناہ از دیدہ

آہ از دل و صد ہزار آہ از دیدہ

ان دونوں شعروں سے استفادہ کر کے پروین نے "دیدہ و دل" کے عنوان سے مناظراتی انداز میں ۳۲ شعروں پر مشتمل ایک عمدہ نظم لکھی ہے ۔ جس کے چند شعر یہ ہیں ۔ ؎

ترا کہ آسماں صاحب نظر کرد

مرا مفتون و مست و بے خبر کرد

شمارا قصۂ دیگر گون نوشتند

حساب کارہا باخوں نوشتند

ہرآں گوہر کہ مژگانِ تو می سفت

نہاں با من ہزاراں قصہ می گفت

مرا شمشیر زد گیتی، ترا مشت

ترا رنجور کرد، اما مرا کشت

اگر سنگی زکوی دل برآمد

ترا بر پائے و مارا بر سر آمد

بتی اگر تیر زابروی کماں زد

ترا بر جامہ و مارا بہ جاں زد

(دل آنکھ سے کہتا ہے ــ جس وقت سے آسمان نے تجھ کو صاحب نظر بنایا ہے، مجھے عاشق اور مست اور بے خبر بنایا ہے ــ)

تمہاری کہانی دوسرے انداز میں لکھی گئی ہے لیکن ہمارے معاملات کا حساب خون کی روشنائی سے تحریر کیا گیا ہے۔

تیری پلکوں سے جو آنسو بھی گرتا تھا وہ خفیہ طور پر مجھ سے ہزاروں کہانیاں بیان کر جاتا تھا۔

دنیا نے تیرے تو صرف مکا مارا ہے، لیکن مجھ پر تلوار چلائی ہے۔ تجھے تو صرف بیمار ہی کیا ہے، لیکن مجھے تو قتل کر ڈالا ہے۔

اگر معشوق کے کوچے سے کوئی پتھر پھینکا گیا ہے تو وہ تیرے پیر سے ہو کر گذر گیا ہے لیکن میرے سر پر آکر لگا ہے۔

اگر کسی معشوق نے کمان ابرو سے تیر چلایا ہے تو صرف تیرے لباس کو چھو کر گزر گیا ہے لیکن ہماری روح پر آکر لگا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، پروین نے پونے دو سو کے قریب منظومات وقطعات لکھے ہیں۔ ان میں سے اس کی شاہکار نظموں اور قطعات کے عنوانات یہ ہیں:-

سفر اشک، لطف حق، کعبہ دل، گوہر اشک، روح آزاد، دیدۂ دل، دریائے نور، گوہر و سنگ، حدیث مہر، ذرہ، جولائے خدا اور نغمۂ صبح۔

ناقدین کی رائے ہے کہ اگر پروین کی صرف ایک نظم "سفر اشک" موجود ہوتی اور اس کے علاوہ اس کا سب کلام ضائع ہو چکا ہوتا یا اس کے علاوہ اس نے کوئی نظم نہ لکھی ہوتی تب بھی وہ فارسی شاعری میں ایک بلند اور ارجمند مقام پر فائز ہوتی۔

اور بقول ملک الشعراء بہار، پروین نے جتنا کلام اور جس ہمواری، فصاحت اور روانی اور دوسرے خصوصیات وکیفیات سے متصف اس مختصر سی عمر میں فارسی شاعری کے ذخیرے میں اضافہ کیا ہے وہ فارغ البال مردوں کو بھی میسر نہیں، ایک معروف عورت سے اس کی کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ ایران کے اندر اب تک کوئی دوسری ایسی عورت پیدا نہیں ہوئی جس کے اندر شاعری کی یہ لیاقت اور ذوق پایا گیا ہو، اور جس نے اپنے دوسرے تعلیمی اور گھریلو مشاغل کے باوجود اپنی نادر قسم کی نظمیں فارسی زبان میں کہی ہوں۔

مراجع

۱:- دیباچۂ دیوان پروین از ملک الشعراء محمد تقی بہار خراسانی: سہ ۱۳۲۱ شمسی تہران۔

(بقیہ صـ پر)

دوسری قسط

اقبال کی شاعری میں عورت کا مقام

کمال جعفری

اقبال کی نظر میں عورت کا مقام ایک واضح نصب العین رکھتا ہے جو نہ بہت قدیم طرزِ معاشرت کا قائل ہے۔ اور نہ فیشن آمیز جدید آوارگی کا۔ اقبال کا نقطۂ نظر عورتوں کے مقام کے تعین میں درمیانی راہ کا حامی ہے۔ اقبال عورتوں کو چہار دیواری میں مقید رکھنے کے بھی خلاف ہیں۔ انہوں نے اس ضمن میں گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ عورتوں کو محض جاہل و ناکارہ بنا کر ان کی زندگی تباہ نہ کی جائے۔ وہ جدید علوم کے قائل ہیں لیکن تعلیمی بے راہ روی پر نالاں ہیں، علوم تازہ کو اقبال نے کبھی غلط نہیں سمجھا۔ ؎

علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

اقبال نے عورتوں کے حقوق کی پامالی پر اپنے غم کا اظہار بڑے تیکھے لہجے میں کیا ہے اور انہیں اس کا دکھ ہے کہ موجودہ سماج نے عورتوں کے جائز حقوق تسلیم کرنے سے گریز کیا ہے۔ ؎

میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اقبال کا پیغام قرآن پاک کی روشنی میں عورتوں کے لیے سراپا مبنی برحقیقت ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "عورت مرد کا لباس ہے اور مرد عورت کا"، اگر اس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اقبال کا پیغام عورت کے لیے وہی ہے جو خود خدا نے اپنی مقدس کتاب قرآن کے ذریعہ عورتوں کے لئے وضع کیا ہے۔

تاریخ دعوت و جہاد برصغیر کے تناظر میں

مصنّف :- عبید اللہ فہد فلاحی
تبصرہ نگار :- پروفیسر مولانا محمد تقی امینی

دعوت وجہاد، اسلامی تعلیم کا خلاصہ ہے۔ اصل تاریخ، اسلام کی دعوت وجہاد ہی کی ہے۔ یہ تاریخ چھٹی صدی عیسوی سے (جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی) نہیں، بلکہ اس وقت سے شروع ہوتی ہے، جب سے انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے انبیاء علیہم السلام مجاہد تھے اور ان ہی کی بدولت انسان کی زندگی کو زندگی ملی۔ وہ اپنی قدروں سے واقف ہوا۔ اچھائی برائی، حلال وحرام، پاکیزگی وگندگی سے اس کو شناسائی ہوئی۔ دعوت وجہاد کی کارگزاری اس پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس سے بہت آگے تک جاتی ہے۔ دنیا کو آباد کرنے، اس کو ترقی دینے، تہذیب وتمدن کی شمع روشن کرنے میں انہوں نے نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔

وکذلک کل نبی استخلفهم فی عمارة الارض وسیاسة الناس

وتکمیل نفوسھم وتنفیذ امرہ فیھم۔　　(بیضاوی)

دعوت وجہاد اسلامی زندگی کا نچوڑ ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کی تاریخ کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ اسلامی تاریخ سے جوہر نکال کر اس کی جگہ خزف ریزوں سے پُر کرنے کی کوشش ہوتی رہی اور دعوت وجہاد کے اصل کردار واثرات کو نمایاں کرنے کے بجائے تاریخ کو واقعات کی کھتونی بنایا گیا۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب مسلم نوجوان اپنی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں، یعنی دعوت وجہاد کی تاریخ۔ ان کو ایسے نقوش درکار ہیں جن کے مطابق خود کو بیکر بنا سکیں۔ خاکے درکار ہیں جن میں وہ خود رنگ بھر سکیں۔ عزیزم عبید اللہ فہد فلاحی نوجوان برادری کے نہایت ذہین باصلاحیت اور ہونہار فرد ہیں جنہوں نے اس کتاب میں دعوت وجہاد کے نقوش اُبھارنے کی کوشش کی ہے اور خاکے پیش کیے ہیں جن میں رنگ بھرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ موصوف جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ کے فاضل، پولیٹکل سائنس کے طالب علم اور فہم قرآن میں مکتبۂ فراہی کے شیدائی ہیں جن سے بجا طور پر توقع ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوں گے۔ مختلف موضوعات پر کئی کتابوں کا ترجمہ کر چکے ہیں، یہ ان کی اپنی تصنیف ہے جس کو نو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ابواب کی تقسیم کچھ اس طرح ہے:

پہلا باب:- عرب تاجر اور دعوت دین

دوسرا باب:- مسلم سلاطین اور اشاعت اسلام

تیسرا باب:- صوفیاء ومشائخ اور تبلیغ اسلام

چوتھا باب:- تجدید واحیائے دین

پانچواں باب:- تحریکات اسلامی

چھٹا باب:- تحریکات آزادی

ساتواں باب :۔ تعلیمی تحریکات

آٹھواں باب :۔ بیسویں صدی کی چند شخصیات

نواں باب :۔ اقامت دین کی جد وجہد ۔

انتساب :۔ جبل پور مدھیہ پردیش کے اس گمنام مسلمان کے نام ہے جو دن میں ٹھیلے پر سبزی بیچتا پھرتا ہے اور رات میں واپس آکر تحریک اسلامی کا کام کرتا ہے ۔ کتاب کا مقدمہ بیس صفحات پر مشتمل ہے جس میں اسلام کو بحیثیت ایک نظریہ ایک تحریک متعارف کرانے کی عمدہ کوشش کی ہے ۔ کتاب کے آخر میں کتابیات کی فہرست بھی ہے جس سے قارئین کو مطالعہ کی سہولت فراہم ہو جاتی ہے ۔

پیش لفظ مولانا جلال الدین انصر عمری ؔ اڈیٹر تحقیقات اسلامی علی گڈھ کا، اور تعارف پروفیسر اقبال انصاری سابق چیرمین اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے تحریر فرمایا ہے ۔ شروع میں مصنف نے التماس نامہ بھی شامل کر دیا ہے جو محسنوں کی خدمت میں ہدیہ تشکر ہے کہ من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ ۔

کتاب کے مندرجات اور حالات کے تجزیہ میں بعض جگہ اختلاف کی گنجائش ہونا فطری بات ہے ۔ لیکن دعوت وجہاد کی تاریخ کو اس انداز سے پیش کرنے کی کوشش قابل صد مبارکباد ہے ۔ یہ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے زمانہ سے اب تک کی دعوت وجہاد کی مختصر تاریخ ہے ۔ ضرورت ہے کہ حضرت آدمؑ سے ہی دعوت وجہاد کی یہ تاریخ شروع کی جائے اور اس کے کردار واثرات پر اس انداز سے ہمہ جہتی روشنی ڈالی جائے کہ دنیا اس اعتراف پر مجبور ہو جائے کہ :۔

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے — یہ سب پود انھی کی لگائی ہوئی ہے

ہندوستان کی دعوتی وجہادی تاریخ پر مشتمل ۳۹۱ صفحات کی یہ کتاب آفسیٹ کی روشن کتابت وطباعت اور جاذب نظر ومعنی خیز ٹائیٹل اور بہترین کاغذ کے باوجود صرف تیئس ۲۳ روپے میں بازار میں دستیاب ہے اتنی خوبصورت اور علمی کتاب کو اتنی کم قیمت میں پیش کرنے پر ادارہ ہندوستان پبلی کیشنز دہلی تعریف و ستائش کا مستحق ہے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ عزیز موصوف کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور مقبول بنائے، اور اس راہ کی اگلی جدوجہد کی توفیق دے اور آسان بنائے آمین!

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

(پروفیسر مولانا محمد تقی امینی)

بقیہ صہ ۵۶ کا:-

۲:- فرہنگ دیوان پروین از ابوالفتح اعتصامی۔ تہران ۔ ۱۳۲۳ شمسی۔

۳:- دیوان پروین اعتصامی، طبع چہارم۔ تہران ۱۳۳۳ شمسی

۴:- زنان سخنور (جلد اول) از علی اکبر مشیر سلیمی۔ تہران ۔ ۱۳۳۵ شمسی

ماہنامہ برہان کا

مفکرِ ملت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ نمبر

مفکرِ ملت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کے تذکرہ کے بغیر، آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی جدوجہد کا کوئی بھی تذکرہ نامکمل سمجھا جائے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کی وفات پر ڈھائی سال سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد، کسی اور کی تو کیا کہیں خود برہان، کو کوئی یادگار نمبر نکالنے کی توفیق نہ ہو سکی۔

اس تاخیر کے اصل اسباب میں خود میری تساہلی، مفتیؒ صاحب کے معاصرین اور قدر دانوں کی بے پروائی اور ادارہ برہان کی مالی کمزوری کا بڑا دخل رہا ہے۔

مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کی یادگار میں کوئی بھی اشاعت اس وقت تک ناقص اور نامکمل رہے گی جب تک اس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی، پرنس نجم الدین، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، قاضی سجاد حسین، قاری محمد ادریس امام جامع مسجد نئی دہلی، مولانا انظر شاہ کشمیری، عابد رضا بیدار، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مولانا محمد سالم قاسمی، اور درجنوں ان مشاہیر کے تاثرات شامل نہ ہوں، جو مفتی صاحب رحمۃ اللہ کے ساتھ قریبی معاصرانہ، عقیدتمندانہ اور دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔

اس کے علاوہ ان کے شایان شان نمبر کوئی یادگار اشاعت کی تکمیل اس وقت

تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ کم از کم ۵۰ ہزار روپیہ کی رقم پہلے سے ادارہ برہان کے پاس موجود نہ ہو۔

اور یہ دونوں باتیں دشوار اور ناممکن نہیں کہ اس وقت تک وہ وسیع دعریض حلقہ موجود ہے، جس میں مفتی صاحبؒ نے آدھی صدی سے زیادہ مدت تک اپنی ذہانت وخدمت کی شمعیں روشن رکھیں، اور ایک تاریک مستقبل کو روشن کرنے کی جدوجہد میں بے نظر مشقت کا مظاہرہ کیا، ان تمام مضمرات پر غور کرنے کے بعد۔ اب یہ فیصلہ ناگزیر ہوگیا ہے کہ —

جنوری ۱۹۸۷ء میں برہان کا

مفکر ملت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ نمبر۔

شائع کردیا جائے۔

- ۵۰۰ کے قریب صفحات پر پھیلے ہوئے اس نمبر کی قیمت کا اندازہ فی الحال ۵۰ روپیہ کیا گیا ہے۔
- اس کے لیے مفتی صاحبؒ کے قدردانوں، اور اہل استطاعت سے درخواست ہے کہ وہ اس نمبر کے اخراجات کی تخمینی رقم کے لیے مالی اعانت اور عطیات فراہم کرنے میں ادارہ برہان کے ساتھ تعاون فرمائیں۔
- اہل قلم اور اہالیان علم وسیاست سے درخواست ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے تاثرات —— زیادہ سے زیادہ نومبر کے پہلے ہفتہ تک ارسال فرمادیں۔
- برہان کے خریداروں سے بھی درخواست ہے کہ وہ مبلغ ۵۰ روپیہ پیشگی روانہ فرمادیں، تاکہ اس ضخیم نمبر کی کتابت، طباعت اور کاغذ کی فراہمی کا کام رکنے نہ پائے۔

عطیات مضامین، اور چندہ کی ترسیل —— عمید الرحمان عثمانی، منیجر ماہنامہ برہان کے نام دہلی کے پتہ پر ہونی چاہیے۔

جمیل مہدی — ایڈیٹر — برہان۔
دہلی۔

اپنے محسنوں و کرم فرماؤں سے ایک معذرت و گزارش

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی یاد میں جس خاص نمبر کے شائع کرنے کا اعلان کیا گیا تھا اس میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ اس تاخیر پر ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ دراصل اس قیمتی نمبر کے لئے جس تحقیقی مواد اور معیاری مضامین کی ضرورت ہے۔ ابھی تک وہ فراہم نہیں ہو سکے۔

ہماری کوشش یہ ہے کہ یہ نمبر حضرت مفتی صاحب کے شایانِ شان ہو۔ اور اس میں حضرت مفتی صاحب کی ہمہ گیر خدمات اور ان کی جامعیت اور ان کے اعتدالی و توازن پر بھرپور حاصل روشنی ڈالی گئی ہو۔ ہم اس میں کتنا کامیاب ہو سکیں گے یہ تو آنے والا وقت ہی بتلائے گا۔

اس سلسلے میں ہم اپنے قارئین سے اپیل کرتے ہیں کہ تحقیقی مضامین سے خواہ وہ بصورت نظم ہوں یا نثر ہمارا تعاون فرمائیں۔

اور جن حضرات کے پاس حضرت مفتی صاحب کے مکاتیب ہوں اس کے منتخبات ارسال فرمائیں، تاکہ اس نمبر کی افادیت میں مزید اضافہ ہو۔

مشہور تجارتی مراکز بمبئی، کلکتہ، مدراس، حیدرآباد، لکھنؤ وغیرہ کے احباب سے گذارش ہے کہ اپنی اپنی اکاڈمیوں، مدرسوں، کتابوں اور دواؤں کے اشتہارات دیکر رکاوٹوں کو دور فرمائیں۔

ساتھ ہی حضرت مفتی صاحب کے مقامی و بیرونی معتقدین و محبین سے گزارش ہے کہ حضرت کی ملی و ملکی خدمات کے پیش نظر بطور یادگار ایک اکاڈمی قائم کرنے اور علاقہ جامع مسجد میں مفتی عتیق الرحمٰن روڈ موسوم کرانے کے لئے پوری سعی فرمائیں۔ ہم آپکے ممنون و مشکور ہوں گے۔

نوٹ :- اشتہارات کا نرخ کامل صفحہ = ۵۰۰/- آدھا صفحہ = ۲۵۰/- روپے اور کوارٹر = ۱۲۵/- روپے

دستخط منیجر :-

مدیر مسئول: عمید الرحمٰن عثمانی

شمارہ ۴	صفر المظفر ۱۴۰۷ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۶ء	جلد ۹۸

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظرات

از عمید الرحمٰن عثمانی

دانائے راز علامہ اقبال نے کہا ہے اور بجا کہا ہے کہ ؎

آدمیت احترام آدمی باخبر شو از مقام آدمی

انسان اس سرزمین پر خالقِ کائنات کا حسین شاہ کار اور نائب سلطنت ہے اور اس میں ان تمام اوصاف اور کمالات کا ہونا لازمی اور ضروری ہے جو خود خالقِ کائنات نے اس کی ذات کے اندر ودیعت کر رکھے ہیں۔ اور ان سب میں اہم ترین صفت انسان شناسی ہے۔ اس میں خود اس کی اپنی ذات بھی شامل ہوتی ہے۔ جب انسان کو یہ ملکہ حاصل ہوگا تو وہ بجا طور پر خالقِ کائنات کا خلیفہ اور نائب سلطنت ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ انسان کو اپنی معرفت اور نوع انسانی کے عرفان کے لئے کیا کرنا ہوگا؟ ہمارے خیال میں اس کا آسان ترین اور مجرب ترین نسخہ دنیا کے سب سے بڑے انسان اور مردِ کامل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر دنیا کو حیران کر دیا ہے کہ "اوروں کے لئے اس بات کو پسند نہ کرو جو تمہیں اپنی ذات کے لئے پسند نہیں" یا یہ کہ "خدا کی قسم وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے کرتوت سے اس کے پڑوسی پریشان ہوں۔" یہ دو رہنما اصول ہیں جن کو سامنے رکھ کر انسان بنتا ہے اور وہ آدمیت کا احترام کرنے لگتا ہے۔ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ کون انسان ایسا ہوگا جو اپنا قتل ہونا پسند کرے، کون انسان ہوگا جو اپنے مال و متاع کو آگ لگانا پسند کرے، کون انسان ہوگا جو اپنے گھر کی عورتوں کی عصمتیں برباد ہوتے دیکھے اور خوش ہوتا رہے۔ کون انسان ہوگا جو اپنے عزیزوں، جگر کے ٹکڑوں اور دل کی راحتوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے

نیزوں، بندوقوں اور چھروں کا نشانہ بنتا دیکھے اور وہ پاگل نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی اس وسیع و عریض سرزمین میں کہیں بھی کوئی انسان نہیں ملے گا۔ یورپ میں اس کا نام و نشان نہیں ملے گا۔ ایشیا میں اس کا وجود نظر نہیں آئے گا، افریقہ میں اس قسم کی ذلت شنیعہ کا پتہ نہیں ملے گا، اور جہاں جہاں انسان رہتا ہے وہاں وہاں ایک بھی انسان ایسا نظر نہیں آئے گا جو اپنے سرمایۂ حیات کو غارت ہوتا دیکھ کر خوش ہوتا ہو۔ دنیا کے سب سے بڑے انسان نے فرمایا کہ جو چیز تمہیں اپنے لئے پسند نہیں اسے دوسروں کے لئے پسند نہ کرو۔ پس اگر دنیا کے کسی انسان کو اپنی ذات کے لئے اس قسم کی مجنونانہ حرکتیں پسند نہیں ہو سکتیں، تو وہ ان چیزوں کو اوروں کے لئے کیوں پسند کرتا ہے؟ اور پھر بھی اپنے انسان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ اس انسانی معاملے میں مذہب کے فرق کو کوئی دخل نہیں۔

مذہب کیا ہے؟ مذہب دراصل انسان کو انسان بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ کون مذہب ہے جو غارت گری کی تعلیم دیتا ہے؟ کون مذہب ہے جو لوٹ مار سکھاتا ہے۔ کون مذہب ہے جو انسان کو وحشت و بربریت کا فلسفہ پڑھاتا ہے۔ تمام مذاہب کے بنیادی اصولوں کو دیکھا جائے تو یہ بات واضح طور پر نظر آئے گی کہ ہر مذہب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان انسان بنے تاکہ آدمیت کا احترام کرے اور آدمی کے مقام کو پہچانے اور اس طرح سے خود کو پہچانے۔ دنیا کے اس سب سے بڑے انسان نے یہ بھی فرمایا کہ تمام انسان اللہ کا کنبہ اور عیال ہیں۔ ایک گھر میں دس افراد ہوں گے اور تمام کے تمام خاندان کے افراد ہوں گے۔ ان افراد خاندان میں کون ایک کو دوسرے سے ممتاز سمجھتا ہے، کون آپس میں غارت گری کرتا ہے۔ اگر افرادِ خاندان میں اختلافات ہوں تو ان کو بوجہ احسن دور کیا جاتا ہے اور خاندان کو ایک دوسرے کی جان کا لہو پینے سے بچانے کے لئے کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ انسان پیدائش کے اعتبار سے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں البتہ ذہنی طور پر ہر شخص کی سوچ الگ الگ ہوتی ہے۔ اس طرح ایک انسان کا دوسرے

انسان کے ساتھ اختلاف ہونا بھی فطری ہے اُسے روکا نہیں جا سکتا مگر اختلاف کو دور کرنے کے معاملہ میں انسان کو انسانیت کی شان کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اختلاف کو دور کرنے کے لئے اگر انسان بربریت اور بہیمیت کا مظاہرہ کرنے لگے تو وہ انسان اور انسانیت کی توہین کا ارتکاب کرتا ہے۔

ہمارا ملک ایک نیم براعظم ملک ہے۔ مختلف تمدنوں کا گہوارہ ہے۔ اس میں قدرتی طور پر مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف مذاہب کے ماننے والے، مختلف معاشرتیں رکھنے والے الگ الگ رنگ اور روپ کے لوگ موجود ہیں، صوبے صوبے میں اپنے اپنے رسم و رواج ہیں۔ رہن سہن کے اپنے اپنے طریقے ہیں۔ بول چال اپنی اپنی ہے مذاہب اپنے اپنے ہیں اور اسی اختلاف میں اتحاد بھی ہے اور کثرت میں وحدت پنہاں ہے کہ سب ایک سرزمین کے رہنے والے ہیں جن کے مفادات بھی مشترک ہیں اور نقصانات بھی۔ سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ لگاتار بارشوں سے دریاؤں میں باڑھ آجاتی ہے تو وہ تباہی پھیلاتے وقت یہ نہیں دیکھتی کہ مسلمان کا کھیت تباہ ہو رہا ہے یا ہندو کا، محلے میں آگ لگ جاتی ہے تو آگ یہ نہیں سوچتی کہ ہندو کا گھر جلتا ہے یا مسلمان کا۔ اسی طرح خدانخواستہ ملک پر بیرونی حملہ ہو تو حملہ آور اس ملک کے رہنے والوں کے چہروں کو دیکھ کر ان کی گردن نہیں پکڑے گا۔ اس کے سامنے جو آئے گا برباد ہو جائے گا۔ ہندوستان انگریز سامراج کی غلامی میں گرفتار رہا تو ہر ہندوستانی کے گلے میں غلامی کا طوق تھا۔ آزاد ہوا تو ہر ہندوستانی آزاد ہوا۔ اب جب یہ صورت ہے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس میں لڑنے جھگڑنے اور اس لڑنے جھگڑنے میں انسانیت کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر حیوان بننے کا کیا جواز ہے؟ ماتم اس بات کا ہے کہ انسان حیوان بن رہا ہے وہ اپنی پیدائش کے مقصد کو بھول رہا ہے، مقصد زندگی سے انحراف کر رہا ہے۔ ہندو اپنے مذہب کی تعلیمات پر پانی پھیر دیتا ہے،

بودھ گوتم کے پیغام کی مٹی پلید کرتا ہے اور مسلمان امن وسلامتی کے پیغمبرؐ کے پیغام سے روگردانی کرتا ہے۔ سکھ اس ملک کے سب سے بڑے صوفی اور امن دوست مصلح نانک کے صلح کل والے مسلک سے منہ موڑتا ہے اور ہر ہندوستانی بلا لحاظ مذہب وملت جو اس شرمناک خونریزی میں حصہ لیتا ہے، عہد حاضر کے ایک بہت بڑے انسان کی توہین کرتا ہے جس نے اپنی جان ہندو مسلم اتحاد کے کاز کے لئے قربان کر دی اور جس کے خون کے داغ ابھی تک ہندوستان والے اپنے دامن سے نہیں دھو پائے ہیں۔

ہماری پریشانی اور ہماری تشویش اس بات پر ہے کہ انسان بے رحمی کا شکار ہو رہا ہے۔ آزادی کے ۳۹ سال بعد بھی ایک فرقہ دوسرے فرقے کی تباہی کے درپے ہے مگر اس سے زیادہ پریشانی اس بات کی ہے کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان اپنی زریں روایات کو خاک میں ملا کر انسانیت کو رسوا کر رہے ہیں اور یہ اتنا بڑا نقصان ہے کہ ہم صدیوں تک اس کی تلافی نہیں کر پائیں گے۔ تاریخ بہت ظالم اور بے رحم ہوتی ہے وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتی۔ ایک وقت آئے گا جب آج کی اس بربریت کی تاریخ پڑھی جائے گی اور آئندہ آنے والی نسل ہم پر رحمت کی بجائے لعنت بھیجے گی۔ ہماری آنے والی نسلوں کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کی جنگ آزادی لڑنے والا عدم تشدد کا پرچارک گاندھی خود تشدد کا شکار ہوا اور ہندوستان کی تہذیب داغدار ہوئی تو وہ کیا کہیں گی پھر جب ان کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ گاندھی صرف ایک دفعہ گولی کا شکار نہیں ہوا بلکہ آزادی پانے کے بعد بھی چار دہائیوں میں اس کا سینہ ہر روز گولیوں سے چھلنی ہوتا آ رہا ہے۔ مراد آباد میں اس پر قیامت برپا کی جاتی ہے۔ علی گڈھ میں اسے تختہ دار پر لٹکایا جاتا ہے۔ جمشید پور اور احمد آباد میں اسے سولی پر چڑھایا جاتا ہے تو ظاہر ہے ہماری یہ آنے والی نسلیں ہم پر

درود و سلام نہیں، لعنت ہی بھیجیں گی۔ سوال یہ ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ یہ سوال ہر ہندوستانی کو اپنے آپ سے کرنا ہوگا اور خود ہی اس کا جواب بھی دینا ہوگا اور ظاہر ہے کہ اگر ہر شخص اس سوال کا جواب دینا چاہے تو آسانی سے دے سکتا ہے۔

ان حالات کو دیکھ کر ملک کا ہر باشعور انسان قدرتی طور پر تشویش میں گرفتار ہے۔ لیکن صرف تشویش میں گرفتار ہونا کافی نہیں بلکہ ہر دردمند دل والے انسان کو اس صورت حال کی اصلاح کے لئے حتی الامکان کوشش کرنی ہوگی۔ ہر دانشمند اور صاحب فہم انسان پر یہ ایک انسانی اور قومی فریضہ ہے کہ وہ اس عذاب سے ملک کو نجات دلانے کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں بروئے کار لائے۔ عام لوگوں پر یہ بات ذہن نشین کرنا ہوگی کہ بیرونی جارحیت کے مقابلے میں ملک کا اندرونی انتشار زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اندرونی انتشار بیرونی جارحیت کے لئے راہ ہموار کرتا ہے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ قوموں کو غلام بنانے کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ ہندوستانی قوم بحیثیت مجموعی صلح پسند، رواداد اور عالی حوصلہ ہے فسادیوں، فسطائی قوتوں اور بدمعاشوں کی ایک مٹھی بھر جماعت ملک کے امن اور ملک کی تہذیب کو برباد کر دیتی ہے اور افسوسناک بات یہی ہے کہ اتنی بڑی صلح پسند قوم اس مٹھی بھر گروہ کا قلع قمع نہیں کر سکتی۔ اس کے عزائم کو خاک میں ملا نہیں سکتی اور اس کے ارادوں کو ناکام نہیں بنا سکتی۔ دانشور طبقے کا یہی کام ہے کہ وہ قوم کو ایک سمت دیں اور

اسے خبردار کریں کہ مفسدہ پردازوں کی اس مٹھی بھر جماعت کا صفایا کردے۔ یہ واقعی بڑی شرم کی بات ہے کہ صرف چند غنڈے اتنی بڑی قوم کو یرغمال رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور قوم اس کا تدارک نہیں کرسکتی۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ غنڈوں اور بدمعاشوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اُن کا اگر کوئی مذہب ہے تو وہ فساد فی الارض ہے اور اس طرح افراتفری بپا کرکے اپنے حقیر مفادات کی حفاظت کرنا ان کا دین بھی ہے اور دھرم بھی۔ یہ منطق ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ کوئی دیندار مسلمان فساد کا روادار ہوگا۔ وہ جانتا ہے کہ ایک انسان کے بلا وجہ قتل کو قرآن مجید نے تمام عالم انسانیت کا قتل قرار دیا ہے۔ ہم یہ نہیں مان سکتے کہ ایک سچا ہندو امن کو درہم برہم کرنے اور قتل و غارت کو ہوا دینے کا ناپاک کام کرے گا کیونکہ اسے اپنے مذہب اور دھرم نے بتایا ہے کہ عدم تشدد سب سے بڑا دین اور سب سے بڑا مذہب ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ تشدّد، تعصّب، نفرت، دہشت انگیزی، تنگ نظری اور فرقہ واریت کی لعنتوں سے ملک کو پاک کرنے کے لئے انسانیت، آدمیت اور احترام آدمیت کا سبق ملک کے کونے کونے میں پھیلا دیا جائے۔ انسانیت، شرافت، محبت کا پیغام سب سے بڑا پیغام ہے۔ انسان کو حقیقی انسان بنانے کی طرف راغب کرنے کا کام سب سے بڑی عبادت ہے۔ نفرت ایک آگ ہے

جس میں خود نفرت کرنے والا بھی جل کر راکھ ہوجاتا ہے۔ محبت آبِ حیات ہے جو قوموں کو رہتی دنیا تک زندہ رکھتی ہے۔ بہرحال ؎

جو اربابِ سیاست ہیں وہ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے

معزز قارئین! ہمیں شرمندگی ہے کہ مفکرِ ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی علیہ الرحمہ کے شایان شان اب تک برہان کا خصوصی شمارہ منظرِ عام پر نہیں آسکا۔ کوشش برابر جاری ہے اور اس سلسلہ میں محترم قبلہ جمیل مہدی، قبلہ مولانا فقیہ الدین، مولانا سید انیس الحسن، مولانا محمد سعید الرحمٰن شمس مدیر نصرۃ الاسلام کشمیر اور راقم نمبر کی ترتیب اور مواد کی فراہمی میں مصروف کار ہیں۔ امید ہے کہ انشاء اللہ نئے سال کے آغاز میں یہ دستاویزی پیشکش نذر قارئین ہوسکے گی، آپ سے دعا کی درخواست ہے۔

نوٹ: حضرت مولانا حکیم محمد زماں صاحب حسینی مدظلہٗ رسالہ برہان کے سرپرست اور مدیر اعزازی جناب مولانا قاضی اطہر مبارک پوری صاحب مدظلہٗ ان حضرات کی موجودگی کے بغیر یہ اہم کام میں سمجھتا ہوں کہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچ سکے گا۔ (شکریہ)

صحابۂ کرامؓ کی تحصیلِ حدیث کی کیفیات

جناب مولوی محمد رضی الاسلام صاحب ندوی، ندوۃ العلماء لکھنؤ

اسلامی شریعت میں قرآن کریم کے بعد دوسرا درجہ "حدیث" کا ہے اور اس پر عمل کرنا اسی طرح واجب اور فرض ہے جس طرح قرآن پر ــــ حدیث ایک ایسا مستند اور معتبر ذخیرہ ہے جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت، آپ کے اقوال و افعال، آپ کی سیرت و شمائل، آپ کے عادات و اطوار اور اخلاق و اوصاف غرض یہ کہ حیات طیبہ کا ایک ایک گوشہ ہمارے سامنے پوری طرح عیاں ہوجاتا ہے۔ اس کی حیثیت تاریخ کے ان ذخیروں کی سی نہیں جن کی اساس محض چند افواہوں، سنی سنائی بازاری باتوں، مجہول کرم خوردہ مخطوطات یا کہنہ الواح سے بڑھ کر نہیں، جو کسی زمانے میں قلم بند کر لی جاتی ہیں اور جن نے نہ راویوں کا پتہ چلتا ہے نہ ان کے احوال معلوم ہوتے ہیں، بلکہ حدیث ایک ایسی مستند دستاویز ہے جس کے عینی مشاہدین لاکھوں کی تعداد کو پہنچے ہوئے ہیں اور جس کے راویوں کی پوری زندگی ہمارے سامنے واضح ہے۔

تاریخ کے عام ذخیروں سے حدیث کا امتیاز:

حدیث نبوی کو عام تاریخی ذخیروں سے صرف یہی ایک چیز ممتاز نہیں کرتی

بلکہ اس سے بھی اہم امتیاز یہ ہے کہ مؤرخین کا اپنی تاریخ سے کوئی قلبی ربط نہیں پایا جاتا۔ اولاً تو تاریخ کے اولین راویوں کا پتہ ہی نہیں چلتا پھر اگر عرصے بعد کے کسی مؤرخ کا نام بھی ملتا ہے تو ظاہر ہے کہ تاریخ سے اس کا قلبی ربط اور باہمی تعلق مفقود ہوتا ہے برخلاف اس کے صحابہ کرامؓ کا جو قلبی تعلق، باہمی ربط اور شدید محبت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور احادیث نبویہ سے تھی وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ حضرات صحابہؓ کو آپؐ کی ذات سے جو حقیقی عشق تھا اس کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے ماں باپ اور عزیز و اقارب تک کو آپؐ پر فدا کرنے کو تیار رہتے تھے اور اپنی جان و مال کو آپؐ کے ایک اشارے پر قربان کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر آپؐ کا اشارہ پاتے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے ثلث مال سے "جیش عسرہ" کی تجہیز کرتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ اپنا نصف مال لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنا کل کا کل مال لاکر آپؐ کی خدمت میں ڈھیر کر دیتے ہیں اور اپنے پیچھے اپنے گھر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا ذکر چھوڑ آتے ہیں۔ غزوۂ احد میں جب جانثاری و فداکاری کا موقع نصیب ہوتا ہے تو حضرت ابودجانہؓ اپنے جسم کو ذات رسول کے لئے ڈھال بنا دیتے ہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ آپؐ کے سامنے سینہ سپر ہو کر دشمنوں کے تیروں کا جواب دیتے ہیں اور کچھ جانثار صحابہ آپؐ کے گرد حصار کر کے آپؐ کو دشمنوں کی ایذا سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ ایک صحابیہ اپنے پدر، فرزند اور خواہر کی شہادت کی خبر سننے کے باوجود جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بخیر و عافیت دیکھ لیتی ہیں تو ان کی زبان سے بے اختیار نکل پڑتا ہے۔ کل مصیبۃ بعدک جلل (آپؐ کو بخیریت دیکھ لینے کے بعد ہر مصیبت گوارا ہے) صحابہ کرامؓ کے آنحضرتؐ سے انتہائی محبت کی اس سے

اعلیٰ مثال اور کیا ہوگی جو ایک دشمن اسلام کی زبان سے بیان ہوئی ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود نے قریش کو مخاطب کرکے کہا تھا:

یا معشر قریش واللہ إنی ما رأیت ملکا فی قوم قط مثل محمد فی أصحابہ، ولقد رأیت ما یصنع بہ أصحابہ، لا یتوضأ إلا ابتدروا وضوءہ ولا یبصق بصاقا إلا ابتدروہ ولا یسقط من شعرہ شیٔ إلا أخذوہ۔ (سیرت ابن ہشام)

اے قریش کے لوگو! خدا کی قسم میں نے محمد کی طرح کبھی کسی قوم کے بادشاہ کو نہیں دیکھا ہے میں نے ان کے ساتھ ان کے اصحاب کا معاملہ دیکھا ہے۔ وہ وضو کرتے ہیں تو لوگ ان کے مستعمل پانی کے لئے دوڑ پڑتے ہیں۔ وہ تھوکتے ہیں تو وہ ان کا تھوک حاصل کرنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں۔ وہ ان کے ایک بال کو بھی گرنے نہیں دیتے اور اسے حاصل کر لیتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی محبت کی وجہ:

جو شخص بھی جاہلیت اور اسلام دونوں کا موازنہ کرے گا وہ بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ صحابۂ کرامؓ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس درجہ قلبی تعلق کیوں تھا؟ "جاہلیت" ــــ جس کا نام سنتے ہی ہماری آنکھوں کے سامنے وحشت و بربریت، ظلم و ستم، جنگ و جدال، لوٹ مار و خوں ریزی، باہمی عداوت و دشمنی اور اس سے بڑھ کر ضلالت و گمراہی کی بھیانک تصویریں آجاتی ہیں ــــ کے گھٹا ٹوپ ماحول سے نکال کر انھیں امن و امان، عدل و انصاف، اخوت و محبت، اور ہدایت و حق کی طرف لانے والی ذات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تو تھی جنھیں اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف مبعوث فرمایا تھا۔ قرآن کریم اس احسان کا بصراحت ذکر کرتا ہے:

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۔ وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۔

(آل عمران ۔ ۱۰۲)

اپنے اوپر ہونے والے خدا کے احسانات کو یاد کرو جب تم آپس میں دشمن تھے اس نے تمھارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم آپس میں بھائی بھائی ہوگئے ۔ تم ایک آگ کے گڈھے کے کنارے کھڑے تھے اس نے تم کو اس سے نجات دی ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا طبعی تقاضہ :

صحابۂ کرامؓ کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی محبت ، عشق اور قلبی تعلق کا طبعی تقاضہ تھا کہ آپؐ سے آپؐ کی تعلیمات اور خدا کے احکام حاصل کرنے پھر اسے اپنی زندگیوں پر جاری وساری کرنے میں پوری کوشش صرف کردیں جنھوں نے ان کو ضلالت و جہالت کی تاریکی سے نکال کر نورِ حق کی شاہراہ پر لا کھڑا کردیا تھا اور ایک غیر مہذب اور وحشی نظام زندگی سے نجات دلا کر ایک صالح ، پاکیزہ اور مہذب نظام حیات عطا کیا تھا ۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ کو قرآن و حدیث حاصل کرنے اور حضور اکرمؐ کے اسوہ کو اپنی زندگیوں پر تطبیق کرنے کا نہایت درجہ شوق تھا ، چنانچہ وہ ہر اس عمل کی طرف دوڑ پڑتے تھے جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے ہوئے دیکھتے تھے اور ان اعمال سے فوراً اجتناب کر لیتے تھے جنھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ترک کرتے ہوئے دیکھتے تھے ۔ حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک بار آنحضرتؐ نے سونے کی انگوٹھی بنوائی تو صحابۂ کرامؓ نے بھی بنوالی پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پھینک دیا اور فرمایا اب کبھی نہیں پہنوں گا چنانچہ تمام صحابہؓ نے بھی پھینک دی (بخاری) اسی طرح ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے کہ نماز ہی میں اپنے جوتے نکال دیے

تمام صحابہ نے آپ کی نقل کرتے ہوئے اپنے اپنے جوتے نکال دیے۔ نماز کے بعد آپؐ نے صحابہ سے پوچھا کہ تم لوگوں نے جوتے کیوں نکال دیے تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے آپؐ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جبرئیلؑ نے مجھے بتلایا تھا کہ میرے جوتے میں گندگی لگی ہوئی ہے (کتاب الشفا ابن عبدالبر) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر عمل کی اتباع کرتے تھے حتیٰ کہ ایک بار حج کرنے جارہے تھے، راستے میں اونٹ سے اتر کر ایک جگہ بیٹھ گئے پھر اٹھ گئے۔ لوگوں نے پوچھا تو فرمایا کہ ایک بار میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ آپؐ نے یہیں بیٹھ کر استنجا فرمایا تھا۔ حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ اگر تم لوگ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال وافعال کی اتباع کرتے ہوئے دیکھتے تو انھیں پاگل سمجھتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ایک بار جمعہ کی نماز پڑھنے جارہے تھے ابھی دروازے ہی تک پہنچے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ میں فرماتے سنا "اجلسوا" فوراً وہیں بیٹھ گئے۔ رسول اکرمؐ نے دیکھا تو بلالیا۔ ان روحانی عوامل وبواعث کے ساتھ ساتھ کچھ اور عوامل تھے جو صحابہ کرامؓ کے قرآن وحدیث کے شوقِ حصول میں کارفرما تھے۔

صحابہ کرام کے تحصیل قرآن وحدیث کے عوامل:

۱۔ ان کے سامنے قرآن کریم اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم حاصل کرنے کی بہت سی فضیلتیں بیان کی تھیں اور علماء اور غیر علماء کے درمیان بہت بڑا فرق بتلایا تھا مثلاً:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (فاطر – ۲۸)	خدا سے اس کے بندوں میں سے صرف علماء ڈرتے ہیں۔
هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ	صاحب علم اور غیر ذی علم بھلا برابر

لا یعلمون۔ (الزمر-۹)	ہو سکتے ہیں!
یرفع اللہ الذین امنوا والذین اوتوا العلم درجات (مجادلہ-۱۱)	خدا مومنوں اور اصحاب علم کے درجات بڑھاتا ہے۔
فقیہ واحد أشد علی الشیطان من ألف عابد (ترمذی۔ ابن ماجہ)	ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے بڑھ کر ہے۔
فضل العالم علی العابد کفضلی علی أدناکم (ترمذی)	عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہی ہے جیسے میری فضیلت ایک ادنیٰ امتی کپر ہے۔
من سلك طریقا یلتمس فیه علما سهل الله له طریقا الی الجنة (احمد، ترمذی، ابوداؤد)	جو شخص علم کے راستے میں چلے گا اللہ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرمائے گا
العلماء ورثة الانبیاء۔	علماء انبیاء کے وارث ہیں۔
ان الملائکة لتضع اجنحتها لطالب العلم رضا بما صنع۔ (ابوداؤد، ترمذی)	فرشتے طالب علم کے لئے اس کے عمل سے خوش ہو کر پر بچھاتے ہیں۔

۲۔ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول وعمل اور ہر نمونہ کو اختیار کریں اور اپنی زندگیوں پر جاری وساری اور نافذ کریں:

ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا۔ (حشر-۷)	رسول نے تمھیں جس چیز کا حکم دیا ہے اسی پر عمل کرو اور جس چیز سے منع کیا ہے اس سے رک جاؤ۔
وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ۔ (نساء-۶۴)	ہم رسول کو اسی لئے بھیجتے ہیں کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران - ۳۱)	اے رسول! کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔
وَلَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب - ۳۱)	تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین اسوہ ہے۔

۳۔ ان پر صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کی اتباع ہی ضروری نہ تھی بلکہ مزید بر آں یہ بھی فریضہ عائد تھا کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنیں اور جو کچھ دیکھیں اسے دوسروں تک پہنچائیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران - ۱۱۵)	تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔
وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (آل عمران - ۱۰۴)	تم میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہو جو خیر کی طرف دعوت دے نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے۔ دراصل ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔
نضر اللہ إمرأ سمع مقالتی فوعاها ثم اداها كما سمع (صحاح)	اللہ تعالیٰ اس شخص کو شاداں و فرحاں رکھے جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا پھر جس طرح سنا تھا اسی طرح دوسروں تک پہنچا دیا۔
تركت فيكم شيئين لن تضلوا	میں نے تم لوگوں میں دو چیزیں چھوڑی

بعدهما كتاب الله وسنتي
ولن يتفرقا
(صحاح)

ہیں ان کو پکڑنے کے بعد کبھی گمراہ نہ
ہوسکے۔ کتاب اللہ اور میری سنت ۔
بشرطیکہ دونوں جدا نہ ہوں۔

ألا فليبلغ الشاهد الغائب
فرب مبلغ أوعى من سامع۔
(صحاح)

سن لو موجود شخص غائب کو سب کچھ تبلادے
بسا اوقات پہنچایا جانے والا شخص سننے
والے سے زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے۔

تسمعون ويسمع منكم ويسمع
من الذين يسمعون منكم۔
(ابوداؤد۔ مستدرک)

اس وقت تم لوگ سن رہے ہو پھر تم
سے سنا جائے گا پھر تم سے سننے والوں
سے سنا جائے گا۔

۴۔ انھیں جو کچھ معلوم تھا اسے چھپانا اور غلط بیانی سے کام لینا سخت جرم اور گناہ سمجھتے تھے اور اس سلسلہ میں قرآن کریم نے اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد تنبیہات اور وعیدیں بیان فرمائی تھیں:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا
مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ
مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ
أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ
اللَّاعِنُونَ
(البقرہ ۱۵۹)

جو لوگ ہماری نازل کردہ کھلی نشانیوں
اور ہدایت کو چھپاتے ہیں جبکہ ہم نے
انھیں لوگوں کے لئے کتاب میں واضح
کردیا ہے ان لوگوں پر اللہ بھی لعنت
کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی۔

من سئل عن علم ثم كتمه، ألجم يوم
القيامة بلجام من النار۔
(ابوداؤد، ترمذی)

اگر کسی سے کچھ پوچھا جائے اور وہ اس کو
چھپائے تو قیامت کے دن اس کے
منہ میں آگ کی لگام لگائی جائے گی۔

من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار۔

جو مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

(حدیث متواتر)

صحابہ کرامؓ کا حدیث میں غایت درجہ اشتیاق:

ان عوامل و اسباب کی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے اور آپؐ سے قرآن و حدیث کی تعلیمات و احکام حاصل کرنے کا بے انتہا شوق پایا جاتا تھا۔ صحابہ کرامؓ اپنی معاشی اور دیگر مصروفیتوں کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں زیادہ سے زیادہ شریک ہونے کی کوشش کرتے۔ ان میں ایک جماعت ایسی تھی جس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی "ملازمت" اختیار کرلی تھی اور سفر و حضر، ...... گھر بازار، ہر وقت اور ہر جگہ آپؐ کے ساتھ رہتی تھی اور جس کا کام ہی یہ تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہ کر قرآن و حدیث حاصل کرے اور دوسروں تک پہنچائے۔ اس مقدس و مبارک جماعت کو ہم "اصحاب صفہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس جماعت کے سرخیل حضرت ابوہریرہؓ اس پر فخر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

إنکم تزعمون ان أباهريرة یکثر الأحادیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، واللہ ...... کنت رجلا مسکینا اصحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ علی ملأ بطنی وکان المهاجرون یشغلهم الصفق بالأسواق وکانت الأنصار لشغلهم القیام علی أموالهم۔ (مسلم ج ۲)

تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت احادیث روایت کرتا ہے۔ خدا کی قسم میں غریب آدمی تھا۔ قوت لایموت کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتا تھا جبکہ مہاجرین تجارت میں مشغول تھے اور انصار اپنے اموال کی حفاظت میں لگے رہتے تھے۔

اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت آیا جایا کرتے تھے حتیٰ کہ صحابہؓ یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ بھی اہل بیت میں سے ہیں (دارمی) ان سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تھا کہ تم ہر وقت میرے گھر میں داخل ہو سکتے ہو اور کھلے چھپے سے باخبر ہو سکتے ہو۔

جو صحابہؓ معاشی مشاغل کی وجہ سے روزانہ حاضر نہ ہو سکتے تھے انھوں نے آپس میں باری مقرر کر لی تھی، چنانچہ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا وہ واپس جاکر اپنے ساتھی کو پورے دن کی خبریں پہنچاتا۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں:

کنت أنا وجار لی من الأنصار من بنی امیة بن زید ـــ وهی من عوالی المدینة ـــ وکنا نتناوب النزول علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم ـ ینزل یوما وانزل یوما فاذا نزلت جئته بخبر ذلك الیوم من وحی وغیره واذا نزل فعل مثل ذلك ـ	میں اور میرا ایک پڑوسی جو قبیلہ بنی امیہ بن زید میں سے تھا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں باری باری آیا جایا کرتے تھے۔ ایک دن وہ آتا ایک دن میں۔ جس دن میں آتا اس دن کی تمام خبریں وحی اور اس کے علاوہ دیگر چیزیں سب اس کو بتلا دیتا تھا اور جس دن وہ آتا وہ بھی ایسا ہی کرتا۔

(بخاری کتاب العلم)

جو صحابہ بہت دور رہتے تھے وہ وقتاً فوقتاً اپنے وفود اور نمائندوں کو بارگاہ رسالت میں بھیجتے تھے تاکہ آپؐ کے پاس چند دن ٹھہر کر اسلامی احکام اور تعلیمات حاصل کریں اور پھر واپس اپنی قوم میں جاکر تعلیم و ارشاد کی خدمت انجام دیں۔ حضرت مالک بن الحویرثؓ فرماتے ہیں:

أتينا النبي صلى الله عليه وسلم ونحن شيبة متقاربون فاقمنا عنده عشرين ليلة فظن أنا اشتقنا أهلنا وسألنا عمن تركنا في أهلنا فاخبرناه وكان رفيقاً رحيما فقال ارجعوا إلى اهليكم فعلموهم ومروهم۔

(صحیح بخاری)

ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہم لوگ ادھیڑ عمر اور ایک ہی عمر کے تھے ہم آپؐ کی خدمت میں بیس دن رہے حتیٰ کہ آپؐ گمان کرنے لگے کہ ہم اپنے اہل وعیال کے مشتاق ہو گئے ہیں لہٰذا آپؐ نے ہم سے ان کے بارے میں پوچھا ہم نے آپؐ کو بتلایا۔ آپؐ کا برتاؤ ہمارے ساتھ بہت ہی رحمت ورافت کا تھا۔ پھر فرمایا اپنے اہل وعیال کی طرف واپس جاؤ، انھیں تعلیم دو اور نیکیوں کا حکم دو۔

اسی طرح اگر کوئی صحابی دور رہتا ہوتا اور اسے کوئی اہم واقعہ پیش آتا یا کوئی اشکال ہوتا تو وہ فوراً مدینہ طیبہ روانہ ہو جاتا اور طویل مسافت طے کر کے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اس واقعہ میں حکم الٰہی دریافت کرتا۔ حضرت عقبہ بن الحارث کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک عورت نے انھیں بتلایا کہ اس نے ان کو اور ان کی بیوی دونوں کو دودھ پلایا ہے۔ وہ فوراً مدینہ روانہ ہوئے یہاں تک کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے یہ مسئلہ پوچھا کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے شادی کرلے پھر بعد میں معلوم ہو کہ وہ اس کی رضاعی بہن ہے تو اس کا کیا حکم ہے۔ آپؐ نے فرمایا کیف وقد قیل (اب کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کہا جا چکا) چنانچہ انھوں نے فوراً اس بیوی کو چھوڑ کر دوسری شادی کرلی۔

اسی طرح جو صحابہؓ کسی سریہ میں چلے جاتے یا کسی وجہ سے پیچھے رہ جاتے وہ

واپس آکر دوسرے صحابہؓ سے تمام احادیث معلوم کرلیا کرتے تھے۔ حضرت براءؓ بن عازب فرماتے ہیں:

ما کل الحدیث سمعناہ عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کان یحدثنا أصحابنا وکنا مشتغلین فی رعایۃ الإبل واصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کانوا یطلبون ما یفوتہ سماعہ عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فیسمعونہ من اقرانہم۔

تمام احادیث ہم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی ہیں ہم سے صحابہ حدیث بیان کرتے تھے اور ہم اونٹ چرانے میں مشغول رہتے تھے۔ اصحاب رسول اگر کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سُن پاتے تھے تو اپنے رفقاء سے حاصل کر لیتے تھے۔

(معرفۃ علوم الحدیث)

حضرات صحابہؓ کا معمول تھا کہ جو احادیث وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں سنتے تھے وہاں سے اٹھنے کے بعد آپس میں مذاکرہ کر لیتے تھے تاکہ اگر کسی کو ٹھیک سے یاد نہ ہوئی ہو تو پختہ ہو جائے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

کنا نکون عند النبی صلے اللہ علیہ وسلم فنسمع منہ الحدیث فاذا قمنا تذاکرنا فیما بیننا حتی نحفظہ۔

(الجامع لاخلاق الراوی والسامع)

ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے تھے تو آپؐ سے احادیث سنتے تھے پھر جب آپؐ کے پاس سے اٹھتے تھے تو مذاکرہ کر لیتے تھے یہاں تک کہ انھیں یاد کر لیتے۔

صحابہ کرامؓ کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تحصیل حدیث کے غایت درجہ

اشتیاق کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ان سے کوئی ایسا بھی سوال کرتے جس کا جواب پوری طرح واضح ہوتا پھر بھی وہ جواب دینے کے بجائے صرف اللہ ورسولہ اعلم (اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے) کہہ دیا کرتے تھے کیونکہ وہ سوچتے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ذریعے کوئی نئی حکمت عملی بتلانا چاہتے ہوں۔ احادیث کے ایک بڑے ذخیرہ میں ہم یہ شئی دیکھتے ہیں۔ حجۃ الوداع کے مشہور خطبے میں جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے پوچھا کہ یہ کون سا دن ہے؟ یہ کون سا مہینہ ہے؟ یہ کون سا شہر ہے؟ ہر سوال کے جواب میں صحابہ فرماتے اللہ ورسولہ اعلم پھر خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی فرماتے کیا یہ یوم عرفہ نہیں ہے؟ کیا یہ ذی الحجہ کا مہینہ نہیں ہے؟ کیا یہ بلد حرام نہیں ہے؟ پھر آپ نے فرمایا:

إن دماءکم واموالکم حرام علیکم إلی أن تلقوا ربکم کحرمۃ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا۔ (بخاری)	تمہارا خون اور تمہارے اموال تم پر قیامت تک حرام ہیں جس طرح آج کے دن کی حرمت اس مہینہ کی حرمت اور اس شہر کی حرمت ہے۔

اسی طرح حدیث جبرئیل میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے پوچھا أتدری من السائل (جانتے ہو یہ پوچھنے والے کون تھے؟) انہوں نے عرض کیا اللہ ورسولہ أعلم۔ فرمایا: انہ جبرئیل أتاکم یعلمکم دینکم (یہ جبرئیل تھے جو تم لوگوں کو دین کی باتیں سکھلانے آئے تھے) (متفق علیہ)

صحابۂ کرامؓ کا قوی حافظہ:

تحصیل حدیث کے سلسلہ میں صحابۂ کرامؓ کا اس درجہ اشتیاق انھیں احادیث کے حفظ و اتقان پر اکساتا تھا اور وہ احادیث کو یاد کر کے محفوظ کرنے میں پوری

کوشش صرف کرتے تھے۔ پھر یہ کہ صحابہ بلکہ عرب کی اکثریت جاہل اور ان پڑھ تھی۔ لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے۔ ان کی تاریخ کا پورا دارومدار ان کے حافظے پر تھا۔ خدا نے انھیں حافظ کا انتہائی قوی ملکہ عطا فرمایا تھا حتی کہ روایتوں میں آتا ہے کہ وہ اپنے جانوروں تک کی پشتہا پشت کی نسلوں سے واقفیت رکھتے تھے۔

حافظہ پر پورا اعتماد ہونے کی وجہ سے صحابہ کرامؓ کی اکثر تعداد احادیث کو حفظ کرتی تھی۔ ابتدار اسلام میں احادیث کی عدم کتابت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایسا کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور یہ کند ذہنی اور غباوت کی علامت تھی۔

حدیث کے تحمل وادا میں صحابہؓ کے مراتب :

چنانچہ حدیث کے تحمل وادا میں تمام صحابہ کرامؓ برابر نہیں تھے بلکہ ان میں مراتب تھے۔ بعض صحابہ بڑھے ہوئے تھے بعض کچھ کم تھے۔ اس لئے کہ :

۱۔ بعض صحابہ ہر وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتے تھے مگر بعض دیگر مصروفیات کی وجہ سے کم حاضر ہو پاتے تھے اور جو صحابہ دور رہتے تھے ان کو اس کا موقع کم ہی نصیب ہوتا تھا۔

۲۔ صحابہ کرامؓ کی اکثر تعداد احادیث کو زبانی یاد کرتی تھی اور لکھنے کا رواج نہ تھا مگر چند صحابہ احادیث کو ضبط تحریر میں لاتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ میں نے سب سے زیادہ احادیث روایت کی ہیں مجھ سے زیادہ صرف عبداللہ بن عمروؓ کی روایات ہیں اور وہ صرف اس وجہ سے کہ وہ لکھتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا۔ (بخاری کتاب العلم)

۳۔ بعض صحابہ فطری استعداد فہم کی وجہ سے فقہ حدیث میں بڑھے ہوئے تھے چنانچہ وہ ناسخ و منسوخ، عام و خاص، مطلق و مقید اور مجمل و مفسر وغیرہ سے بخوبی واقف تھے مگر بعض فہم حدیث میں اس درجہ کے نہیں تھے، چنانچہ مروی ہے

کہ ایک بار حضرت عمر بن الخطابؓ نے صحابہ کی ایک مجلس میں سوال کیا کہ سورۂ نصر کا شانِ نزول کیا ہے؟ کوئی صحابی صحیح نہیں بتلا پایا۔ حضرت ابن عباسؓ نے — جو اس وقت بھی کم سن تھے — بتلایا کہ هو أجل رسول الله صلى الله عليه وسلم أعلمه له، قال إذا جاء نصر الله والفتح فذلك علامة أجلك فسبح بحمد ربك إلخ (بخاری کتاب التفسیر) (اس سے مراد رسول اللہؐ کی وفات کی خبر ہے جو انھیں تبلائی گئی ہے یعنی جب خدا کی مدد اور فتح آجائے تو وہ تمھاری وفات کی علامت ہے لہٰذا خدا کی تسبیح بیان کرو الخ)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی مجالس:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی صحابۂ کرامؓ کو ہر وقت تعلیم و تربیت اور وعظ و نصیحت سے نوازتے تھے۔ آپؐ کی حیثیت ایک معلم و مربی کی سی تھی آپؐ کی زندگی کا ہر پہلو دعوت و تربیت سے معمور تھا۔ آپؐ ہر وقت اور ہر جگہ تعلیم و تربیت میں مشغول ہوتے۔ آپؐ کے لئے کوئی جگہ یا کوئی وقت مخصوص نہ تھا۔ آپؐ جنگ میں ہوتے تو وہاں بھی معلم و واعظ ہوتے اور لوگوں میں اپنے وعظ سے جوش و ولولہ پیدا کرتے، اگر سفر میں ہوتے تو وہاں بھی مرشد و ہادی ہوتے۔ گھر میں اہل و عیال کے ساتھ ہوتے تو انھیں بھی تعلیم دیتے۔ بازار جاتے تو وہاں لوگ روک کر مسئلہ پوچھ لیا کرتے اور مسجد نبوی میں ہوتے تو وہاں بھی لوگوں کو وعظ و نصیحت سے نوازتے۔

البتہ یہ بات ضرور تھی کہ آپؐ کی اکثر مجلسیں مسجد نبوی ہی میں ہوتی تھیں، جہاں صحابہ نماز کے اوقات میں جمع ہوتے اور آپؐ انھیں درس و تعلیم دیتے تھے، اوقات نماز کے علاوہ بھی جب کوئی اہم معاملہ ہوتا تو آپؐ لوگوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیتے اور ان کے سامنے تقریر فرماتے۔ ایک بار سورج گرہن

ہوا۔ اسی دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند ابراہیم کا انتقال ہوا تھا۔ لوگ کہنے لگے کہ پیغمبر کے بیٹے کی وفات کے سوگ میں سورج گرہن ہوا ہے۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے لوگوں کو مسجد نبوی میں جمع کیا اور تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

إن الشمس والقمر لا ینکسفان لموت أحد ولا لحیاتہ و آیتان من آیات اللہ۔

سورج اور چاند میں کسی کی موت وحیات سے گہن نہیں پڑتا بلکہ وہ دونوں خدا کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔

(ابو داؤد)

اسی طرح حضرت بریرہؓ کو حضرت عائشہؓ کے ہاتھ بیچتے وقت ان کے آقا نے یہ شرط لگائی کہ حق ولایت ہمارا ہی ہوگا۔ حضرت عائشہؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا الولاء لمن اعتق (حق ولاء تو آزاد کرنے والے ہی کا ہوگا) اس کے بعد آپؐ مسجد تشریف لے گئے اور صحابہ کو جمع کر کے تقریر کی اور فرمایا:

ما بال رجال یقول أحدھم اعتق یا فلان والولاء لی وأنما الولاء لمن اعتق۔

ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جن میں کا آدمی کہتا ہے کہ اے فلاں تم آزاد کردو مگر حق ولاء ہمارا ہی ہوگا جبکہ ولاء کا حق آزاد کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے۔

(ابو داؤد)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت کے چند مخصوص طریقے:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک حکیم معلم و مربی تھے اس لئے آپؐ صحابۂ کرامؓ کو قرآن و حدیث کی تعلیمات دیتے وقت متعدد چیزوں کا خاص طور پر لحاظ رکھتے تھے تاکہ تعلیم وتربیت کا مثبت اور محکم اثر ہو اور صحابہ اس سے پورا فائدہ اٹھائیں۔

۱- آپ جب کوئی اہم بات تبلاتے تو اس کا تین بار اعادہ فرماتے تاکہ لوگ ٹھیک سے سمجھ لیں اور اس کو اہم سمجھیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے خطبہ دیا جس میں اصول دین بتلائے پھر تین مرتبہ فرمایا: ھل بلغت (کیا میں نے پورا دین پہنچا دیا ہے) ایک بار آپؐ نے خطبہ دیتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا: التقویٰ ھھنا ہر بار آپؐ اپنے سینے کی طرف اشارہ فرماتے تھے۔

۲- آپ صحابہ کی نگرانی بھی کرتے تھے تاکہ وہ احادیث کو صحیح صحیح اسی طرح یاد کریں جس طرح آپؐ بتلاتے تھے چنانچہ ایک بار آپؐ نے ایک صحابی کو سونے کی دعا بتلائی پھر پوچھا کہ اچھا میں نے کیا کہا؟ اسے دہراؤ صحابی نے آخری فقرہ آمنت بکتابک الذی أنزلت ونبیک الذی أرسلت میں نبیک کے بجائے رسولک کہہ دیا آپؐ نے فرمایا کہ میں نے یہ نہیں کہا۔ وہی کہو جو میں نے کہا تھا۔ (ترمذی) یہی وجہ تھی کہ آپؐ ایک کلمہ کا تین بار اعادہ فرماتے تھے۔

۳- کبھی آپؐ خود ہی صحابہ سے سوال فرما دیتے تھے تاکہ ان کے اذہان کی تشحیذ و تصقیل کر سکیں۔ چنانچہ ایک بار صحابہ سے ایک مجلس میں آپؐ نے فرمایا کہ مومن کی مثال اس درخت کی سی تھی جس کے پتے کبھی نہیں جھڑتے۔ پھر صحابۂ کرامؓ سے پوچھا کہ بتاؤ وہ کون سا درخت ہے؟ صحابہ کے ذہن میں طرح طرح کے درختوں کے نام آئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میرے ذہن میں آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے لیکن میں اپنی صغرسنی کی وجہ سے نہ کہہ سکا پھر صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ آپ ہی بتلائیے۔ آپ نے فرمایا: ھی النخلۃ (وہ کھجور کا درخت ہے)۔

۴- آپ سے کوئی سوال کیا جاتا تو آپؐ اس کا جواب بھی دے دیتے پھر اگر اسی سے متعلق کوئی اور بات ہوتی یا موقع ومحل کے مطابق کوئی شئی قابل ذکر ہوتی تو اس کا بھی ذکر کر دیتے تاکہ سائل اور حاضرین کو نئی بات بھی معلوم ہو جائے مثلاً

ایک دفعہ ایک صحابی آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سمندر کا سفر بہت کرتے ہیں۔ وہاں مار خالص نہیں ملتا اگر اپنے پاس کے پانی سے وضو کریں تو پئیں کیا پھر کیا سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں۔ آپؐ نے جواب دیا:
ھو الطھور ماؤہ والحل میتتہ (اس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے) یعنی پانی کی طہوریت کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتلا دیا کہ اس کا مردار (یعنی مچھلی) بھی حلال ہے۔

۵۔ آپ صحابۂ کرامؓ کو اتنا زیادہ وعظ و نصیحت نہیں کرتے تھے کہ وہ اکتا جائیں چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جب ان کے شاگردوں نے عرض کیا کہ وہ روزانہ درس دیں تو انھوں نے فرمایا:

إنما نتخولکم بالموعظة کما کان رسول اللہ یتخولنا کراھة السامة علینا۔

ہم تمھیں اسی طرح وعظ و نصیحت دیں گے جس طرح ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وقفہ وقفہ سے وعظ و نصیحت کرتے تھے اکتاہٹ کے خوف سے۔

۶۔ آپ بعض باتیں صرف مخصوص صحابۂ کرامؓ کو بتلاتے تھے اس خوف سے کہ دوسرے اس کا غلط مطلب سمجھ کر فتنہ میں مبتلا ہوں گے۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار مجھ سے فرمایا اے معاذ کوئی بھی شخص اگر دل سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پڑھ لے تو اس پر اللہ تعالیٰ دوزخ حرام کر دیتا ہے انھوں نے عرض کیا کہ کیا میں لوگوں کو یہ نہ بتلا دوں تاکہ وہ خوش ہو جائیں آپؐ نے فرمایا لا تبشرھم فیتکلوا (صحیحین) (ان کو اس کی بشارت نہ دو کیونکہ وہ لوگ اسی پر بھروسہ کر لیں گے) اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کو یہ اعلان

کرنے کے لئے بھیجا کہ من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ جو بھی لاالٰہ الااللہ کہہ دے وہ جنت میں داخل ہوگا) راستے میں سب سے پہلے حضرت عمرؓ ملے حضرت ابوہریرہؓ نے یہ حدیث انھیں سنائی وہ انھیں واپس لوٹا لائے اور آپؐ سے عرض کیا کہ ایسا مت کیجئے کیونکہ لوگ اسی پر بھروسہ کرلیں گے ان کو عمل کرنے کے لئے چھوڑ دیجئے آپؐ نے فرمایا فخلّہم (مسلم) (چھوڑ و رہنے دو)۔

معذرت

ماہنامہ برہان دہلی افسوس کہ ان دو ماہ میں وقت پر شائع ہوکر آپ تک نہیں پہونچ سکا۔ اس سے شرمندگی سمجھیں یا پریشان کن حالات کی سرگردگی تصور فرمائیں۔ ازراہ کرم آپ حضرات کسی قسم کی غلط فہمیوں کا شکار نہ بنیں بلکہ یہ جو میں لکھ رہا ہوں، وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ دعا فرمائیں کہ رسالہ برہان اپنی مقررہ تاریخوں پر جلد از جلد بحال ہو۔ مجھے امید ہے کہ ماہ نومبر سے اپنے ان ہی خوشگوار ماحول میں اس کی اشاعت ہوتی رہے گی اور مجھے آپ سے مزید تعاون کی بھی درخواست کا حق ہے۔

عمید الرحمٰن عثمانی

امام ابوزرعہ رازیؒ

(آسیر آدروی، آدری اعظم گڈھ)

کتاب الصحابہ معرفتہ صحابہ میں ابوزرعہ کا علم بڑا وسیع تھا، صحابہ کی عظمت وفضیلت اور مقام ومرتبہ کے سلسلہ میں وہ بہت ہی متشدد تھے اور ان حضرات کی شان میں ادنیٰ گستاخی بھی آپ کے لیے ناقابل برداشت تھی، ایک بار ان سے کہا گیا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف چار ہزار حدیثیں صحیح ہیں، بقیہ سب غلط اور بے بنیاد ہیں تو اُنھوں نے فرمایا کہ کس نے یہ بات کہی ہے؟ خدا کرے اس کے دانت ٹوٹ جائیں یہ کسی زندیق اور بد دین ہی کا قول ہو سکتا ہے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ

هذا قول الزنادقة، ومن يحصي حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم عن مائة الف واربعة عشر الفا من الصحابة ممن روى عنه وسمع منه، قيل يا ابا زرعة هؤلاء اين كانوا؟ وسمعوا منه؟

یہ زندیقوں کا قول ہے، کون ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی متعین تعداد بتا سکتا ہے؟ حضورؐ جب اس دنیا سے تشریف لے گئے اس وقت ایک لاکھ چودہ ہزار صحابہ کرامؓ موجود تھے جنھوں نے حضورؐ سے روایت کی اور آپؐ سے سنا، لوگوں نے کہا کہ وہ لوگ کہاں تھے؟

قال أهل المدينة وأهل مكة ومن بينهما والأعراب ومن شهد معه حجة الوداع[1]

تو انھوں نے فرمایا کہ وہ مدینہ میں تھے مکہ میں تھے، دیہاتوں اور گاؤں میں تھے اور وہ لوگ تھے جو حجۃ الوداع میں آپؐ کے ساتھ شریک حج تھے۔

صحابہ کرامؓ پر تنقید وجرح کرنے والوں پر زندیقیت کا فتویٰ خود خطیب بغدادی نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے اور انھوں نے سندِ متصل سے ابوزرعہ کے اس فتویٰ کو نقل کیا ہے خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ ابوزرعہ نے فرمایا کہ:

إذا رأيت الرجل ينتقص أحداً من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فاعلم أنه زنديق وذلك أن الرسول حق والقرآن حق وما جاء به حق وإنما أدى إلينا ذلك كله الصحابة وهولاء يريدون أن يجرحوا شهودنا ليبطلوا الكتاب والسنة والجرح بهم أولى وهم زنادقة[2]

جب کسی شخص کو دیکھو کہ وہ کسی صحابی رسولؐ کی تنقیص کرتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ بددین ہے اس لیے کہ رسول، قرآن برحق ہیں جو حضورؐ لے کر آئے وہ بھی برحق ہے اور یہ سب باتیں ہم تک صحابہؓ نے پہونچائیں، یہ لوگ ہمارے گواہوں کو مجروح کرکے پورے دین کو بے اعتبار بنا دینا چاہتے ہیں۔
جرح کرنے والے خود جرح کے سزاوار ہیں اور یہ طے ہے کہ وہ بددین ہیں۔

کتاب الصحابہ ابوزرعہ کی ایک محققانہ کتاب ہے، کتاب میں صحابۂ کرامؓ کے مقام و مرتبہ کے علاوہ ان کی تعداد صحابی اور تابعی میں اشتباہات کو بڑی دیدہ وری اور تحقیق سے دور کیا گیا ہے ابن حجرؒ نے اپنی مشہور کتاب "الاصابہ" میں ابوزرعہ کی رائے

---

[1] : التقیید والایضاح شرح مقدمہ ابن الصلاح ص ۳۰۵۔

[2] : الکفایہ للخطیب ص ۹۷ الاصابہ لابن حجر ج ۱ ص ۱۱۔

کو بطور سند اور دلیل کے پیش کیا ہے، مثلاً مسلم بن الحارث التیمی کے حالات میں لکھا ہے:

صحح البخاری وابو حاتم وابو زرعۃ الرازی والترمذی وابن قانع وغیر واحد ان مسلم بن الحارث ھو صحابی[1]	امام بخاری، ابو حاتم، ابو زرعہ رازی اور ترمذی، اور ابن قانع اور بہت سے لوگوں نے تصحیح کی ہے کہ مسلم بن الحارث صحابی ہیں۔

ابو زرعہ رازی صحابہ کے حالات، ان کی شخصیتوں کی معرفت، تعیین و تشخیص میں بڑی دقتِ نظر سے کام لیتے ہیں، حتی الامکان کسی تابعی کو صحابی اور کسی صحابی کو تابعی قرار دیے جانے کے احتمالات کو ختم کر دیتے ہیں، الاصابہ وغیرہ میں جو ابو زرعہ کے اقوال ملتے ہیں مثلاً کسی کے بارے میں کہتے ہیں لیس لہ صحبۃ[2] یا کہیں لہ صحبۃ قدیمۃ[3] یا لا یسمّی وھو صحابی فی الصحابۃ یا بعض شخصیتوں کے متعلق ھو من التابعین ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحابہ کی شناخت میں بڑی دقتِ نظر سے کام لیتے ہیں، اور ایک قطعی حکم لگاتے ہیں، مثلاً ابو عبداللہ الحاکم نیشاپوری نے ام خالد کو تابعیات میں شمار کر دیا ہے[4]، ام خالد کے بارے میں ابن ابی حاتم نے لکھا ہے:

سمعت اباذرعۃ یقول ام خالد بنت خالد بن سعید بن العاص الاکبر اسمھا امۃ صح لھا عن النبی صلی اللہ	ام خالد بنت خالد بن سعید بن العاص الاکبر کا نام امۃ ہے، انھوں نے حضور ﷺ سے کئی حدیثیں روایت کی ہیں، یعنی ان کا

---

[1] :- تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۲۵۔

[2] :- الاصابہ ج ۲ ص ۶۰۔

[3] :- کتاب الجرح والتعدیل ج ۴ ص ۵۴۔

[4] :- معرفۃ علوم الحدیث مطبوعہ حیدرآباد ص ۵۷۔

علیہ وسلم احادیث[۱] صحابیہ ہونا یقینی ہے۔

اس کتاب کا مکمل نسخہ ابھی تک دنیا کے کسی کتب خانے میں دریافت نہیں ہو سکا ہے، دوسری کتابوں میں حوالوں کی وجہ سے اس کتاب کو ابو زرعہ کی تصانیف میں شمار کیا گیا ہے۔

کتاب اسماء الضعفاء

محدثین نے عام طور پر راویان حدیث کے حالات جمع کیے اور بلا امتیاز ثقہ وضعیف ہر طرح کے راویوں کا ذکر کیا، لیکن اسی دور میں بہت سے محدثین نے ضعیف راویوں پر مستقل کتابیں بھی لکھیں جن کو کتاب الضعفاء کہا جاتا ہے، جن میں صرف ضعیف یا مجروح راویوں کا ہی ذکر کیا گیا ہے، ابو زرعہ نے بھی ایک کتاب الضعفاء لکھی ہے جس میں انھوں نے ان راویوں کے بارے میں اپنی تحقیقی رائے کا اظہار کیا ہے اس کتاب میں ۳۸۴ راویوں کا ذکر ہے اس کتاب کا مخطوطہ دریافت کر لیا گیا ہے اور طبع ہو کر عام ہو چکا ہے۔

اجوبۃ ابی زرعۃ علی اسئلۃ البرذعی

(فی الضعفاء) اور اجوبۃ ابی زرعۃ علی اسئلۃ البرذعی (فی الثقات)

یہ دو مستقل کتابیں ہیں، برذعی ابو زرعہ کے مخصوص شاگرد ہیں، ان کا نام ابو عثمان سعید بن عمرو البرذعی ہے، انھوں نے ثقہ اور ضعیف راویوں کے سلسلہ میں اپنے شیخ ابو زرعہ سے بہت سے سوالات کیے، ابو زرعہ نے ان کے تحقیقی جواب دیے ہیں، انھیں جوابات کو دونوں کتابوں میں یکجا کر دیا گیا ہے۔

ابو زرعہ اپنے طویل ترین علمی اسفار کی وجہ سے راویوں کے بارے میں ذاتی طور پر صحیح واقفیت رکھتے ہیں، اس لیے کسی راوی کے بارے میں ان کی رائے ایک خاص

ملہ ۱:- الجرح والتعدیل ج ۴ ص ۲۶۴۔

وزن رکھتی ہے، ضعیف راویوں میں ۸۳۴ راویوں کا ذکر آیا ہے، ان کے بارے میں ابوزرعہ کی رائے اجتہاد اور تجرباتی مشاہدات کی بنیاد پر ہے۔

اسی طرح ثقہ وضعیف راویوں کے بارے میں ابوزرعہ کی یہ دونوں کتابیں قدیم ترین ماخذ ہیں اور ذاتی واقفیت واطلاع اور مستند معلومات کی بنیاد پر ان کی رائے میں وزن ہے، ان دونوں کتابوں کی دریافت سے فن جرح وتعدیل کے ایک امام کی رائے کا اس فن میں اضافہ ہے، کیونکہ ان میں سے بہت سے راویوں کا ذکر جرح وتعدیل کی کتابوں میں پایا جاتا ہے لیکن وہاں ابوزرعہ کی رائے کا اظہار نہیں کیا گیا ہے، ان کتابوں کے ذریعہ ہم ان کے متعلق ابوزرعہ کی رائے معلوم کرسکتے ہیں۔

اسی طرح بہت سے ایسے راوی ہیں جن کے بارے میں جرح وتعدیل کی کتابوں میں ترجمے نہیں پائے جاتے ہیں ان راویوں کا ذکر اور ان کے بارے میں ایک تحقیقی رائے ان کتابوں میں مل جاتی ہیں۔ اسی طرح متداول کتابوں میں ابوزرعہ کی جو رائے نقل کی گئی ہے ان میں کہیں کہیں خلاف واقعہ رائیں نقل کردی گئی ہیں، ان کتابوں سے اس راوی کے بارے میں ابوزرعہ کی حقیقی اور اصل رائے کا پتہ چلتا ہے مثلاً عبدالرحمان بن حماد الشعیثی کے بارے میں متداول کتابوں میں ابوزرعہ کی رائے "لا باس بہ" کے لفظ سے ظاہر کی گئی ہے لیکن برذعی نے ان کا قول "شیخ لیس بذاک" نقل کیا ہے، اسی طرح عبداللہ بن قانع الصائغ کے بارے میں عام کتابوں میں ان کی رائے "لا باس بہ" لکھی جاتی ہے جبکہ برذعی بتاتے ہیں کہ ابوزرعہ کی رائے ان کے بارے میں "منکر الحدیث" ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ابوزرعہ کی یہ دونوں کتابیں اسماء الرجال میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

التفسیر حافظ شمس الدین محمد بن علی داؤدی (متوفی ۹۴۵ھ) نے ایک کتاب طبقات المفسرین لکھی ہے۔ اس میں ابوزرعہ کو ممتاز ترین

مفسرین میں شمار کرایا گیا ہے، ان کی تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تفسیر مستند مفسرین قرآن تابعین و تبع تابعین کے اقوال کی روشنی میں مرتب کی ہے، آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں انھوں نے صرف انہی روایتوں کو لیا ہے جن کی صحت معلوم ہے چاہے وہ مرفوع روایتیں ہوں یا صحابہؓ یا تابعین یا تبع تابعین کے اقوال ہوں اور بطور خاص اس کا اہتمام کیا ہے کہ تفسیروں میں جو ضعیف اور اسرائیلی روایتوں کا انبار لگا دیا گیا ہے ان سے مکمل اجتناب کریں۔

ابوزرعہ کی تفسیر کے وجود کا اب تک علم نہ ہو سکا ہے، البتہ ابن ابی حاتم کی تفسیر کے بعض اجزا قاہرہ کے دارالکتب اور ظاہریہ میں یا مکتبہ محمودیہ مدینہ طیبہ یا جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں پائے جاتے ہیں ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابن ابی حاتم کی تفسیر کا بڑا حصہ ابوزرعہ کی تفسیروں پر مشتمل ہے، اگر ابن ابی حاتم کی تفسیر کے یہ اجزا نہ ہوتے تو شاید ہم کو ابوزرعہ کی تفسیر کا پتہ بھی نہیں چلتا۔

کتاب الجرح والتعدیل

ابوزرعہ کی تصانیف میں کتاب الجرح والتعدیل بھی شامل ہے، ابوزرعہ کی کتاب سے پہلے امام بخاریؒ کی "التاریخ الکبیر" اہل علم اور محدثین میں عام ہو چکی تھی، اسی لیے ابوزرعہ کی اس کتاب پر اعتراض کیا گیا، یہ کتاب امام بخاریؒ کی کتاب کی نقل ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ اسماء الرجال کے فن میں تصنیف کرنے والا کوئی مصنف امام بخاری کی کتاب سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چالیس ہزار افراد پر اظہار رائے میں ہر رائے کو حرف آخر نہیں قرار دیا جا سکتا، حالات، تجربات، مشاہدات اور معلومات کے لحاظ سے اتنے طویل و عریض میدان میں کہیں نہ کہیں خفا ہو ہی سکتا ہے، اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے صاحب نظر کو کسی خاص راوی کے

بارے میں خصوصی اور قطعی معلومات حاصل ہو جائیں تو امام بخاری کی رائے سے وہ اختلاف کر سکتا ہے اور اسے اس کا حق بھی ہے۔

ابو زرعہ کی کتاب کی بھی یہی حیثیت ہے، ابو زرعہ اور ابن ابی حاتم دونوں محدثین کے سامنے امام بخاری کی "التاریخ الکبیر" موجود تھی، ایک ایک راوی کے حالات ان حضرات کے سامنے پیش کیے گئے جہاں جہاں ضرورت محسوس کی گئی وہاں اضافہ کیا گیا، جہاں خلاف واقعہ بات تھی اور ان حضرات کے علم میں حقیقت دوسری تھی وہاں اس کا اظہار کر دیا گیا، اس طرح ابو زرعہ کی کتاب امام بخاری کی کتاب کی روشنی میں ترتیب ضرور دی گئی لیکن اس میں ابو زرعہ نے اپنی خصوصی رائے کا اظہار کر کے کتاب کی اہمیت کو بڑھا دیا اس لیے بخاری کی کتاب کے ساتھ ابو زرعہ کی کتاب کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔

الواح الصنادید

از جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب ۔ شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور

برعظیم پاک وہند کے نامور عالم دین اور دانشور شاہ محمد جعفر پھلواروی مرحوم و مغفور گلشن اقبال کراچی کے قبرستان میں محوِ خواب ابدی ہیں ۔ ان کا ذکر پہلے بھی الواح الصنادید کے ضمن میں آچکا ہے لیکن اُس وقت ان کی قبر پر کتبہ نصب نہیں تھا ۔ اب اُن کے لواحقین نے ان کی قبر پر کتبہ لگوا دیا ہے جس پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

ابن

حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان قادری چشتی پھلواروی

تاریخ وفات ۳ر جمادی الآخر ۱۴۰۲ھ

مطابق ۳۱ر مارچ ۱۹۸۲ء

اسی قبرستان میں نالہ پار حضرت نواب احمد قادری چشتی نقشبندی ابوالعلائی

کی درگاہ ہے۔ ان کے مزار کے سرہانے کی جانب ڈاکٹر اشتیاق احمد قریشی دفن ہیں اور جانب مشرق اندازاً پچیس میٹر کے فاصلے پر ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے اور بشیر الدین صاحب "واقعات دارالحکومت دہلی" کے فرزند شاہد احمد دہلوی کی قبر ہے۔ شاہد احمد کی قبر بڑی تلاش اور محنت کے بعد ملی ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے:

هوالکل

انا للہ وانا الیہ راجعون

شاہد احمد دہلوی

تاریخ وفات

۲۷ رمئی ۱۹۶۷ء مطابق

۱۷ رصفر المظفر ۱۳۸۷ھ

بعمر ۶۱ سال

اسی قبرستان میں شفیق بریلوی کی قبر سے اندازاً پندرہ میٹر جانب شمال مغرب تحریک آزادی کے ایک نامور مجاہد محمد یسین علی خاں کی قبر ہے۔ ان کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت مرقوم ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجاہد تحریک آزادی

محمد یسین علی خاں مرحوم ملیح آبادی

ولد مقصود علی خاں مرحوم ایمن زئی

تاریخ ولادت: ۱۰ ر اگست ۱۸۹۶ء

تاریخ وفات: ۶ ر نومبر ۱۹۷۷ء

کراچی میں شاہراہ قائدین اور طارق روڈ کے اتصال پر جو قبرستان ہے، وہ سوسائٹی کا قبرستان ہے۔ اس قبرستان کے وسط میں پہاڑی کے دامن میں مشہور شاعر اور تاریخ گو عبدالحفیظ سلیم کی آخری آرام گاہ ہے۔ مرحوم علمی اور ادبی حلقوں میں حفیظ ہوشیار پوری کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

حفیظ ہوشیار پوری

پیدائش: ۵ر جنوری ۱۹۱۲ء

وفات: ۱۰ر جنوری ۱۹۷۳ء

سوئیں گے حشر تک کہ سبکدوش ہو گئے

بارِ امانتِ غمِ ہستی اُتار کے

حفیظ

قبرستان سوسائٹی میں ایک بلند ٹیلے پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کے صحن میں چوہدری محمد علی سابق وزیر اعظم پاکستان اور حضرت مفتی محمد حسن امرتسری خلیفۂ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی دفن ہیں، ان کی قبروں کے سرہانے مسجد کی حدود سے باہر، مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کے والد بزرگوار مولانا ظہور الحق مغفور کی قبر ہے۔ اُن کے لوح مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا ظہور الحق رحمۃ اللہ علیہ

وفات شب دوشنبہ ۶ر ذی قعدہ ۱۳۷۴ھ بعمر ۷۰ سال

عزیز الحق غمین شد از وفات والد ماجد
ہم ارشاد و عماد و اعتماد و احتشام الحق
بزرگے زندہ دل بود و بہ علم و اتقا یکتا
علومش جملہ مستحضر دلش در شوق مستغرق
گہے نطق بلیغش منبر و محراب را زینت
گہے طبع لطیفش محفل ارباب را رونق
بہ فیض اشرف علی از ہمہ ماں اشرف
ز صدق حضرت صدیق طبعاً صادق و اصدق
نہ ریزد ہیچ برگے جز بہ حکم خالقِ عالم
نہ میرد ہیچ کس اِلّا بہ امرِ قادرِ مطلق
اسدؔ گر چار سال دیگر اورا زندگی بودے
شدے تاریخ رحلت اسم "مولانا ظہور الحق"

۱۳۷۸

اسد ملتانی

(۱۳۷۸ میں سے اگر ۴ تفریق کر دیئے جائیں تو باقی ۱۳۷۴ بچتے ہیں اور یہی ان کا سال وفات ہے)۔

اسی قبرستان میں مشہور مؤرخ اور دانشور احمد عبداللہ بھی محو خواب ابدی ہیں۔ ان کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ربنا اٰمنا فاغفرلنا وارحمنا وانت خیر الراحمین

سینئر صحافی دانشور مؤرخ اور مصنف

احمد عبداللہ

ولد شیخ غلام رسول

تاریخ پیدائش: جمعہ ۵ر اگست ۱۹۲۱ء

تاریخ وفات: شب جمعہ ۲۹ر ستمبر ۱۹۸۳ء

اسی قبرستان میں نواب معشوق یار جنگ مرحوم کے صاحبزادے محمود حسین خاں کی بھی قبر ہے۔ گو انھوں نے اپنے والد بزرگوار جیسی شہرت نہیں پائی، تاہم ان کی قبر کا کتبہ قابل توجہ ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

محمود حسین خان ایڈوکیٹ

فرزند

نواب معشوق یار جنگ مرحوم

تاریخ وفات: ۷ر ذی الحجہ ۱۳۹۴ھ

مطابق ۲۲ر دسمبر ۱۹۷۴ء

اسی گورستان میں حفیظ ہوشیار پوری کی قبر سے اندازاً بیس میٹر جانب جنوب مشہور مفسر اور عالمِ دین سید طفیل حسن رضوی محوِ خواب ابدی ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

۷۸۶

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ابو النظر حکیم سید طفیل حسن رضوی امروہوی

مفکرِ قرآن

تاریخ پیدائش : ۱۷ ستمبر سنہ ۱۹۰۱ء امروہہ

تاریخ وفات : ۸ اپریل سنہ ۱۹۵۲ء کراچی

(انا للہ وانا الیہ راجعون)

اسی قبرستان کے شمال مشرقی گوشے میں ایک چھتری کے نیچے ہندوستان کے مشہور فلمی اداکار چارلی کی قبر ہے۔ چارلی اپنے دور میں مزاحیہ اداکاری کے لئے مشہور تھا۔ اس کے لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

الحاج نور محمد چارلی

ولد حاجی علی محمد

تاریخ پیدائش : ۷ جنوری سنہ ۱۹۱۱ء

تاریخ وفات ۱۸ رمضان سنہ ۱۴۰۳ھ

مطابق ۳۰ جون سنہ ۱۹۸۳ء

بروز جمعرات

قبرستان سوسائٹی میں شعیب قریشی مرحوم کی آخری آرام گاہ کے سرہانے ایک کمرے میں درگاہ حضرت بو علی شاہ قلندر پانی پتیؒ کے سجادہ نشین شاہ عبدالرشید کی قبر ہے ان کے مزار کے کتبے پر یہ عبارت درج ہے :

۷۸۶

مولانا حافظ قاری شاہ عبدالرشید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

سجادہ نشین آستانۂ عالیہ شاہ بو علی قلندرؒ پانی پتی

رفت از جہاں سوئے جناں ماوائے ما ملجائے ما
یعنی جناب مرشد و مولائے ما عبدالرشید
سجادہ و اولادِ حضرت بو علی پانی پتی
درویش کامل صاحب لطف و عطا عبدالرشید
از ہر ادائے دلبری شان قلندر آشکار
حسن و جمال بوعلی را آئینہ عبدالرشید
اے عازم حج و زیارت بر تو از ما صد سلام
قربانِ راہ مصطفیٰ صد مرحبا عبدالرشید
تا حشر روح پاک تو در کعبہ شد وقف طواف
بخشید ایں رتبہ ترا رب العلا عبدالرشید
اکرم لنا یا مرشدی اَدرِک لنا یا سیّدی
بالمرحمۃ للہ اُنظر حالنا عبدالرشید
بنوشت تاریخ وفاتش عارف اندوہ گیں
ملجائے عالم معدن صدق و صفا عبدالرشید

۱۳۸۱ھ

نثار احمد فاروقی خیرآبادی

۱۹ ذی قعدہ ۱۳۸۲ ہجری
مطابق ۲۳ اپریل ۱۹۶۲ عیسوی

شاہ عبدالرشید کے مزار سے پندرہ میٹر جانب شمال مشرق سید عبدالوحید ابن سید عبدالاحد دہلوی مالک مطبع مجتبائی کی قبر ہے۔ ان کے سنگ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

حسبنا اللہ ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر

سید عبدالوحید

خلف

خان بہادر سید عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی دہلی

تاریخ پیدائش ۲۱ر فروری ۱۹۰۶ء

تاریخ وفات ۴ر اکتوبر ۱۹۶۳ء

بروز جمعہ

شاہ عبدالرشید کی قبر سے اندازاً تیس میٹر جانب شمال ایک بارہ دری کے نیچے مشہور صحافی سردار علی صابری محو خواب ابدی ہیں۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ

فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

العشق ھو اللہ حق حق حق

یہاں تحریک پاکستان کے سرفروش مجاہد برصغیر کے بیباک صحافی

اور سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے صاحب اجازت بزرگ

حضرت سردار علی صابری رحمۃ اللہ علیہ

ولد

شیخ المشائخ شاہ محمد شہزاد علی خاں المعروف (بہ) عبدالعلی پیارے میاں صوفی

آرام فرما ہیں۔ صاحب مرقد کانپور میں ۲۱ر فروری ۱۹۰۱ء کو پیدا ہوئے اور کراچی میں ۲۹ر مارچ ۱۹۸۴ء مطابق ۲۵ر جمادی الثانی ۱۴۰۴ھ کو جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب میں واصل بحق ہوئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

وہ صابریہ چشتیہ مسلک کا پرستار ۔۔۔ اس کو تو فقط رضیٔ مولیٰ ہی تھی درکار
اعزاز بھی حاصل تھا اسے ابن ولی کا ۔۔۔ اور اس کا وظیفہ تھا سدا نادعلی کا

لوح مزار کی پشت کی جانب یہ عبارت منقوش ہے:

پیکر محبت

باوا سردار علی صابری رحمۃ اللہ علیہ

ولادت کانپور	وفات کراچی
۲۱ر فروری ۱۹۰۱ء	۲۹ر مارچ ۱۹۸۴ء
شام ۵ بجکر ۵۴ منٹ	جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب

قطعہ تاریخ وفات

علم و صحافت ادب و معرفت ۔۔۔ دولت سردار علی صابری
صفحۂ تاریخ پر تحریر ہے ۔۔۔ خدمت سردار علی صابری
عزم مسلسل کی ہے اک داستاں ۔۔۔ عظمت سردار علی صابری
جلوہ گہ رحمت غفار ہے ۔۔۔ تربت سردار علی صابری
گوشۂ تربت سے عیاں ہے رئیسؔ ۔۔۔ صولت سردار علی صابری

۱۴۰۴ھ

رئیس امروہوی

تاریخ لوح مزار
چراغ روشن گھر
۱۹۸۵ء

ارشد صابری

تدفین ۲۳ مارچ ۱۹۸۴ء	خطاطی
بعد نماز جمعہ	محمد یامین دہلوی
	(مرصع رقم)

رہے نام اللہ کا

کراچی کے نئے قبرستانوں میں سخی حسن کا قبرستان بہت بڑا قبرستان ہے۔ نارتھ ناظم آباد، نیو کراچی اور فیڈرل بی ایریا سے زیادہ تر میتیں یہیں تدفین کے لئے لائی جاتی ہیں۔ اسی قبرستان میں قاری احمد پیلی بھیتی کی قبر ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے:

یا اللہ یا محمدؐ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ھو الحی القیوم ابداً ابداً ذوالجلال والاکرام برحمتک استغیث

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مولانا حکیم قاری احمد پیلی بھیتی

ولد

سلطان الواعظین مولانا عبدالاحد ولد مولانا وصی احمد محدث سورتی رحمۃ اللہ علیہ

نواسہ

شاہ عبدالکریم خلیفۂ اعظم حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی

تاریخ وفات

۱۳ر جمادی الاول ۱۳۹۲ھ مطابق

۱۷ر مئی ۱۹۷۶ء بروز جمعہ

عمر ۶۵ سال

قبرستان سخی حسن کے شمال مغربی حصے میں لب سڑک بنگال کے نامور سیاسی رہنما اور تحریک آزادی میں صف اول کے مجاہد راغب احسن کی قبر ہے۔ ان کی قبر کچی ہے لیکن اس کے سرہانے ایک پتھر نصب ہے جس پر یہ عبارت مرقوم ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

علامہ راغب احسن

ولد

ریاض الدین احمد

تاریخ ولادت ۱۹۰۵ء

تاریخ وفات ۲۷ر نومبر ۱۹۷۵ء

ہمارے فاضل دوست محمد فرید الحق صاحب ایڈووکیٹ نے علامہ اقبال کے راغب احسن کے نام خطوط کا مجموعہ "اقبال جہان دگر" کے عنوان سے چھاپ دیا ہے۔ ان خطوط کی اشاعت نے سیاسی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا ہے۔

قبرستان سخی حسن کے وسط میں مشہور ماہر تعلیم اور دانشور سید مظفر الدین ندوی کی قبر ہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسلامیات کے ماہر استاذ ادیب اور دانشور

جناب پروفیسر سید مظفر الدین ندوی

ولد

مولوی سید عبد اللہ مرحوم

تاریخ وفات

۱۸ ر رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ

مطابق ۱۸ ر جون ۱۹۸۴ء

انا للہ وانا الیہ راجعون

قبرستان میوہ شاہ کراچی کا سب سے بڑا قبرستان ہے۔ اس قبرستان میں سب سے نمایاں مزار بابا ذہین شاہ تاجی کا ہے۔ ان کے مزار کا گنبد میلوں سے نظر آتا ہے۔ بابا صاحب بڑے اچھے شاعر تھے اور کراچی کے بڑے بڑے ادیب اور ماہرین تعلیم اُن سے بیعت تھے۔ اُن کی قبر کے سرہانے دیوار پر یہ عبارت درج ہے:

بابا ذہین شاہ کہ تھے تاجدار فقر
ان کو ارم نشین و ولایت نشاں لکھو
سالِ وفات تاج ولایت ذہین شاہ
"بابا ذہین شاہ بزرگِ زماں" لکھو

۱۳۹۸ھ

عارف وحق آگاہ مولانا محمد طاسین المعروف بہ اسید بابا ذہین شاہ تاجی

تاریخ وصال ۱۶ر شعبان المعظم ۱۳۹۸ھ
مطابق ۲۳ر جولائی ۱۹۷۸ء

بابا ذہین شاہ اپنے مرشد بابا عبدالکریم یوسف شاہ کے پہلو میں محو استراحت ہیں۔ بابا یوسف شاہ کے مزار کے سرہانے دیوار پر یہ عبارت کندہ ہے:

اللہ		غفار		احد

۱۳۶۶ھ

تربت مقرب ایزد

۱۳۶۶ء

صاحب کرامت چشمۂ نور		چراغ کعبۂ اجلال

۱۳۶۶ھ		۱۳۶۶ھ

نور دربار چشت

۱۳۶۶ھ

تاج نہ بہشت		سعادت دو جہاں پیر و مرشد

۱۳۶۶ھ		۱۳۶۶ھ

حق آگاہ مولانا عبدالکریم المعروف (بہ) سید محمد بابا یوسف شاہ تاجی
تاریخ وصال پاک بابا		یکم ذی الحجہ (کذا) سنہ تیرہ سو چھیاسٹھ
۱۳۶۶		۱۹۴۸ء

بابا عبدالکریم یوسف شاہ ناگپور کے مشہور بزرگ بابا تاج الدینؒ کے مرید اور مجاز تھے۔ ان کے خلیفہ بابا ذہین شاہ سے پاکستان میں اس سلسلے کی داغ بیل پڑی۔ بابا ذہین شاہ "تاج الاولیاء" کے عنوان سے ایک اردو ماہنامہ

اور THE TAJ کے نام سے ایک انگریزی مجلہ شائع کیا کرتے تھے۔ ان دونوں کا موضوع تصوف تھا۔

بابا ذہین شاہ کے مزار کے عقب میں ایک احاطۂ قبور کے اندر مشہور سیاست داں چوہدری خلیق الزماں کی قبر ہے۔ انھوں نے شاہراہ پاکستان کے عنوان سے تحریک آزادی کی دستاویز تیار کی تھی۔ اصل کتاب انگریزی زبان میں تھی، پھر انھوں نے اسے اردو کا جامہ پہنایا۔ چوہدری صاحب کے لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

۷۸۶

قطعہ تاریخ وفات

محسن قوم و ملت

چودھری خلیق الزماں مرحوم و مغفور

پیدائش چنار ۲۵ دسمبر ۱۸۸۹ء

وفات کراچی ۱۸ مئی ۱۹۷۳ء

رفت خلیق الزماں جانبِ قصرِ جناں

مومن ملت نواز محسن اسلامیاں

ہمدم دیرینۂ قائد و بابائے قوم

عاقل و دانائے راز مرجعِ دانشوراں

مصرعِ تاریخ گفت ہاتف راغب نواز

قبر خلیق الزماں جنتِ نام آوراں

۱۹۷۳ء

راغب مرادآبادی

اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء

مصنف: ڈاکٹر محمد اطہر علی

تبصرہ نگار: عبدالرؤف خاں ایم اے (ادوئی کلاں راجستھان)

اورنگ زیب کی عظمت وشوکت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس اولوالعزم شہنشاہ پر اب تک جتنا لکھا گیا ہے شاید ہی کسی سمراٹ، سلطان یا کسی دیگر مغل حکمران پر لکھا گیا ہو۔ ڈاکٹر محمد اطہر علی کا تحقیقی مقالہ
'THE MUGHAL NOBILITY UNDER AURANGZEB'
بھی اسی سلسلہ کی طلائی کڑی ہے۔ جسے موصوف نے ۱۹۶۱ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پیش کر کے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ یہ گرانقدر مقالہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ۱۹۶۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ مقالہ کی افادیت کے پیش نظر ترقی اردو بیورو وزارتِ تعلیم حکومت ہند نے باشتراک انڈین کاؤنسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، اسے "اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء" کے نام سے، جناب امین الدین صاحب سے اردو میں ترجمہ کروایا اور جنوری۔ مارچ ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔ اصل مقالہ سے، سرجدوناتھ سرکار اور دوسرے مورخین کے، اورنگ زیب پر عائد کردہ الزامات کی تردید ہو جاتی ہے۔ بہ ایں سبب اسے قومی اتحاد وہم آہنگی

کے تناظر میں اردو میں منتقل کرنا یقیناً قابلِ ستائش کام تھا۔ لیکن اصل مقالہ جتنا وقیع اور بلند پایہ نیز منطقی و تحقیقی ہے ترجمہ اس معیار کو نہ پہونچ سکا۔ چنانچہ تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے کارپردازانِ ترقی اردو بیورو کی توجہ ترجمہ کے سلسلہ میں چند امور کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو درجِ ذیل ہیں:

مُعنوَنِ بالا تصنیف میں بعض تاریخی مصطلحات، کتابیات اور مقامات و رجال کے ناموں کا املاء بیشتر صفحات پر غلط ثبت ہوا ہے۔ ممکن ہے ایسا کاتب کی کم سوادی کے سبب ہوا ہو۔ بہر حال ص۳۴ پر اورنگ زیب کے میرِ عسکر عاقل خاں رازی کو دو دفعہ "عاقل خاں راضی" تحریر فرمایا ہے۔ یہ وہی عاقل خاں رازی ہے جس نے شہزادہ اورنگ زیب کو، جبکہ اُس کی طبیعت اپنی پرستارِ خاص زین آبادی کو عالمِ شباب میں انتقال کر جانے کے سبب، نہایت مضمحل اور نڈھال تھی۔ فی البدیہہ حسب ذیل شعر ؎

عشق چہ آساں نمود آہ چہ دشوار بود
ہجر چہ دشوار بود یار چہ آساں گرفت

سنا کر شہزادہ کی مصاحبتِ خاص حاصل کرلی تھی۔ فنِ موسیقی کی مشہور کتاب راگ درپن کے مصنف اور معروف شاعر ناصر علی سرہندی کے ممدوح امیر فقیر اللہ سیف خان بن تربیت خاں کو ص۲۵ پر اور ایک دوسرے امیر سیف خاں بن سیف الدین محمود" کو ص۳۵۵ نیز لفظ "سیف" کو دیگر صفحات پر کم از کم تیرہ دفعہ "صیف خاں" لکھا ہے۔ ممکن ہے فاضل مترجم کے نزدیک مذکورہ دونوں امراء کی عمرِ گرانمایہ صیف وشتا (موسم گرما و سرما) میں خورش و پوشش کی احتیاج ہی میں صرف ہوئی ہو ؎

عمرِ گرانمایہ دریں صرف شد   تا چہ خورم صیف چہ پوشم شتا

ملا عوض وجیہ عہد شاہجہانی میں مفتی لشکر اور دور عالمگیری میں محتسب عسکر مقرر کیے گئے تھے۔ ملائے مرحوم جیسا متورع محتسب شاید ہی کوئی دوسرا ہوا ہو۔ مرتبین فتاوی الهندیہ المعروف بہ فتاویٰ عالمگیریہ میں بھی آپ کا شمار ہے۔ بہر کیف ان باتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے، زیر نظر تصنیف کے ص ۱۳۶ نیز ۲۸۹ پر ہمیں "عوض" اور "وجیہ" "عیوض" اور "وجیح" لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ عیوض یائے مجہول اور وجیح حائے حطی سے نہیں لکھنا چاہئے۔

اکبر آباد کا قلعہ دار رعد انداز خاں، جو ستنامیوں کی شورش کو فرو کرنے کے صلہ میں شجاعت خاں کہلایا، اورنگ زیب کا نہایت معتمد منصب دار تھا۔ چنانچہ شیواجی کو پہلے انہی کی تحویل میں نظر بند کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ خیر فاضل مترجم کو "رعد انداز خاں" کے بارے میں یہ باتیں مستحضر نہ بھی ہوں تو کوئی فرق واقع نہیں ہوتا؛ لیکن 'انداز' جو انداختن مصدر سے مشتق ہے اور رعد کے سابقہ کے ساتھ 'برق انداز' کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور اسی ترکیب پر 'تیر انداز' وغیرہ بنتے ہیں۔ اسی رعد انداز کو ص ۲۰۷ نیز ۲۳۲ پر 'ردانداز' ارقام فرمایا ہے۔ گویا شجاعت خاں کی تمام رعد اندازی بیک جنبش قلم مسترد کر دی گئی۔ رعد انداز خاں چونکہ اکبر آباد کا قلعہ دار تھا چنانچہ اس تاریخی شہر کی مناسبت سے یہاں یہ عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ اسے ص ۲۴۷ پر قوسین میں آگرہ آباد تحریر فرمایا ہے۔ اگر اسی خوبصورت ترکیب پر ہمارے ملک کے چند دیگر شہروں کو قیاس کر لیا جائے تو پھر شاہجہان آباد "دہلی آباد" اور عظیم آباد "پٹنہ آباد" کہلائے گا بہر حال "آگرہ" اور "اکبر آباد" الفاظ کا یہ حسین امتزاج پہلی دفعہ نظر سے گزرا۔ تاریخ سے معمولی شغف رکھنے والا طالب علم شائستہ خاں کی قد آور شخصیت سے واقف اور اردو زبان کا مبتدی بھی اس لفظ کے املا سے آگاہ ہے لیکن ہماری نگاہ، کتاب کے ص ۱۸۷ پر سائستہ خاں، اور ص ۲۰۵ پر

"شائشتہ خاں" سے دوچار ہوتی ہے۔ ممکن ہے یہ تصحیف ہو۔

شہزادہ عالیجاہ داراشکوہ کو ص ۲۳۴ پر "دارہ شکوہ" اور ان کے فرزند سلیمان شکوہ کو صـ۲۴۱ پر "سلمان شکوہ" نیز دارا کے استاذِ محترم شیخ میرک ہروی کو صـ۲۷ پر "ہاروی" بنا دیا ہے۔ وقائع دکن کے مصنف نعمت خان عالی کا شمار عالمگیری عہد کے ممتاز شعراء میں بھی ہوتا ہے۔ یہ محاصرۂ قلعۂ گولکنڈہ میں، جو آٹھ ماہ تک مسلسل جاری رہا تھا، از اول تا آخر شریک تھے۔ فاضل مترجم نے ان کی مذکورہ بالا تاریخی تصنیف کو صـ۲۴۱ پر "دافعات" اور موصوف کے نام کو "نعمت خانِ علی" یا نعمت خاں علی تحریر فرمایا ہے۔ اورنگ زیب کے درجۂ اول کے منصب دار اور "میر بخشی" عزیز الدین بہرہ مند خاں کو ص ۴۷، نیز دیگر صفحات پر مکرر سہ کرر "بہرامند خاں" بنا دیا ہے۔ شکر ہے کہ اِسے "گراں گوش خاں" نہیں لکھا کیونکہ بہرا اُس شخص کو کہتے ہیں جسے اونچا سنائی دے۔ ورنہ سب جانتے ہیں کہ ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے جلیل القدر خلیفہ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ سے کون واقف نہیں؟ فیروز شاہ تغلق کی تخت نشینی اور تمام تر فیروزمندیاں آپؒ ہی کی دعاؤں اور توجہات کی رہین منت تھیں۔ مترجم موصوف نے انہی بزرگوار محترم کا اسم گرامی "ناصر الدین" (ص ۲۴۷) رقم فرمایا ہے۔ دیگر بہت سے امراء کے نام بھی صحیح طور پر ضبط تحریر میں نہیں آسکے ہیں مثلاً: مکرمت خاں ص ۲۷۳ کے علاوہ دوسری دو جگہ "مکرمات خاں" بایزید ص ۱۰۶ پر "بایذید" ایزد بخش ص ۱۳۸ پر "ایذد بخش" یزدی ص ۲۶۴ پر یذدی، ہزبر خاں ص ۲۸۰ پر "ہذبر خاں" علی مردان ص ۱۰۷ پر "علی مرادن" شمس الدین خویشگی

کو ص ۲۶۵ نیز دیگر صفحات پر کم از کم آٹھ دفعہ "شمش الدین خیشگی" مرزا لہراسپ کو ص ۲۶۲ پر "لہراست" مفتخر خاں کو ص ۲۶۳ پر "مفتخار خاں" اور ص ۲۹۶ پر "مفتحر خاں" قباد خاں میر آخور کو ص ۲۶۵ پر "میر آخر" کر دیا ہے میر آخور داروغۂ اصطبل یا سردارِ طویلہ کو کہتے تھے جو ایک اہم عہدہ تھا۔ اسی طرح فیروزؔ کو جابجا "فروز" فدائی خاں کو دو دفعہ خدائی خاں اور کیقباد کو ص ۶۵ پر "کیکباد" ارقام فرمایا ہے اور نوبت بہ این جا رسید کہ رشید خاں کو ص ۲۲۴ پر "رسید خاں" ممکن ہے خانِ موصوف آمد و خرچ کی رسیدات کے "داروغہ" رہے ہوں۔ صاحبِ رقعاتِ حسن یعنی سید ابو الحسن (۱۶۶۶ء) کو ص ۳۲۴ پر "سید عبد الحسن" لکھا ہے۔ مترجم موصوف نے عالم اسلام کے مستند ترین عالم دین حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ العالی کا اسم گرامی تو ضرور پڑھا اور سنا ہوگا۔ اس مناسبت سے ہی اسے درست لکھا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے مشاہیر بھی اس نام کے ہو گذرے ہیں نیز ابو الحسن اور عبد الحسن کے معنی میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خیر آج کل اردو سے ناواقف لوگ مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کو بھی "عبد الکلام" ہی بولنے لگے ہیں۔ فی الحقیقت تاریخ کی کتابوں کے مترجمین کو بقول محترم پروفیسر محمد اسلم صاحب، پنجاب یونیورسٹی لاہور "رجال و اماکن کا علم ہونا بھی ضروری ہے اور جب تک مترجم تاریخ سے واقف نہ ہو اس وقت تک وہ اس کام کو ہاتھ نہ لگائے" (ماہنامہ برہان دہلی۔ فروری ۱۹۸۱ء) رجال و شخصیات کا حال قارئین نے ملاحظہ فرمالیا۔ اب ایک نظر امصار و مقامات پر بھی ڈال لی جائے۔

اورنگ زیب کے قابل ترین کمانڈر مرزا راجہ جے سنگھ کچھواہہ اور شیواجی کے مابین ۱۶۶۵ء میں بمقام "پرندر" مشہور صلح ہوئی تھی جس کے بعد ہی شیواجی مغل دربار میں آگرہ حاضر ہوا تھا۔ پرندر کی اس صلح سے بچہ بچہ واقف ہے لیکن اس مقام کا

نام ص ۱۰۲ پر "پورا ندھر" اور ص ۱۵۹ پر "پورن دھر" لکھا ہوا ملتا ہے جس سے اشتباہ ہوتا ہے کہ یہ کسی مقام کا نام نہ ہوکر فرد کا نام ہے۔ برادرانِ وطن میں بہت سے لوگوں کے نام "پورن دھر" ہیں۔ شہنشاہ اورنگ زیب اور شجاع کے درمیان ۱۶۵۹ء میں کھجوا کے میدان میں شدید جنگ واقع ہوئی تھی۔ اسے کاتب کی نوکِ قلم نے "کچھوا" یعنی سنگِ پشت بنا دیا ہے (ص ۱۸۲)۔ کھجوا کی مناسبت سے بطور جملہ معترضہ یہاں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اسی جنگ میں جودھپور کے راجہ جسونت سنگھ نے، جسے اورنگ زیب نے میمنہ کی کمان سپرد کی تھی، لڑائی سے ایک رات قبل شجاع سے سازباز کرلی مگر شہنشاہ نے اس کی اس غداری پر عفو و تحمل کا ثبوت دیتے ہوئے کوئی باز پرس نہ کی البتہ چونکہ جے سنگھ کی وساطت سے اورنگ زیب اس کی گذشتہ تقصیرات کو معاف کرچکا تھا چنانچہ اس کی اس سازش اور غداری کے سلسلہ میں جے سنگھ کو جو کچھ لکھا اس کا ایک قابلِ توجہ (Remarkable) فقرہ یہ ہے: "انچہ او کرد شاید ہیچ کم ذات پاسپاہیئے نہ کند چہ جائے راجپوت از خانوادۂ کلاں۔" قزوین مضافاتِ ایران میں ایک شہر کا نام ہے یہاں کے باشندے کو ازروئے صفتِ نسبتی قزوینی کہا جاتا ہے مگر یہ لفظ صـ۱۲۴ کے حاشیہ ۳ پر "قضونی" لکھا ہوا ہے غالباً یہ بادشاہ نامہ کے مصنف محمد امین معروف بہ امینائے قزوینی کے لئے بطور اختصار یہ تحریر فرمایا ہے۔ مغل عہد حکومت میں حصار فیروزہ کی جاگیر اسی شہزادہ کو تفویض ہوتی تھی جسے تخت و تاج کا وارث خیال کیا جاتا تھا گو یہ بات دیگر ہے کہ اس امر کا فیصلہ اکثر میدانِ جنگ ہی میں ہوتا تھا تاہم حصار کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔ یہ آج کل ہریانہ میں ہے۔ اسے صـ۱۳۳ پر "حسار" لکھا ہے۔ مغل تاریخ میں خصوصاً جہانگیری عہد سے ساداتِ بارہہ کا کردار بہت نمایاں رہا ہے۔ ان میں بعض شخصیات تاریخ ساز ہو گذری ہیں مثلاً

صاحب سیف و القلم نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید بخاری جنھیں مجدد الف ثانیؒ "سیادت پناہ" کہکر مخاطب فرماتے تھے اور جنھوں نے جہانگیر کو تخت نشین کرنے میں نمایاں رول ادا کیا تھا یہ جہانگیر کے میر بخشی بھی تھے، نیز سید حسن علی خاں قطب الملک اور ان کے برادر خورد امیر الامراء سید حسین علی خاں فوجدار ہنڈون وبیانہ وغیرہ۔ یہ دونوں بھائی "سید برادران" یا "بادشاہ گر" کے نام سے بھی تاریخ میں معروف ہیں۔ بہر حال یہ لوگ سادات بارہہ اس لئے کہلاتے ہیں کہ ان کے اجداد کو یا تو بارہ گاؤں جاگیر میں عطا ہوئے تھے یا وہ بارہ بستیوں میں سکونت پذیر تھے۔ چنانچہ "بارہ" کثرت استعمال کے سبب "بارہہ" ہو گیا۔ سادات بارہہ سے اورنگ زیب بھی محتاط رہتا تھا۔ اسی بارہہ کو تقریباً بیس جگہ "بارہا" لکھا ہے جس کی ابتدا ص ۱۴۱ سے ہوتی ہے اور یہ سلسلہ ص ۴۴۳ تک جاری رہتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ "بارہا" کسی مقام سے منسوب نہ ہو کر محض تابع فعل ہے جو "کئی بار، بہت دفعہ اور اکثر" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ٹھٹہ یا ٹھٹھ (سندھ) کے باشندہ کو ٹھٹوی کہا جاتا ہے۔ لیکن فاضل مترجم نے عبد الرشید صاحب فرہنگ رشیدی کو ص ۴۴۶ پر "ٹاڈی" بنا دیا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل ٹھٹھ خاندانِ سومرہ کا دار الحکومت تھا اور جلال الدین محمد خوارزم شاہ نے چنگیز خاں سے شکست کھا کر ۶۲۱ھ میں اسی ٹھٹھ میں آکر مستقل قیام کیا تھا نیز ملک طغی جس نے سلطان محمد تغلق سے بغاوت کی تھی، یہیں کا حاکم تھا۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فاضل معاصر مخدوم معین الدین بھی ٹھٹوی ہی تھے۔

مدھیہ پردیش کے شہر اجین کو ص ۱۰۹ پر "اوجین" راجستھان کے انڈسٹریل شہر کوٹہ کو ص ۱۳۱ پر "کوٹا" مہاراشٹر کے شہر شولاپور کو ص ۳۲ پر "شعلاپور" پرگنہ کدری کو ص ۷ ح ۱ پر "کتری" داکن کھیڑا کو ص ۱۷۸ پر "داکن کیڑہ"

اور اراکان (آسام) کو صفحہ ۲۳ پر "آراکان" ارقام فرمایا ہے۔

صاحبِ مقالہ ڈاکٹر محمد اطہر علی صاحب نے جن تصانیف سے مراجعت فرمائی ہے فاضل ترجمہ نگار نے ان میں سے کئی تصنیفات اور ان کے مصنفین کے ناموں کا اندراج درست نہیں فرمایا۔ مثال کے طور پر موصوف ہی کے ہمنام محمد امین الدین خاں عالمگیری کی مشہور تصنیف "معلومات الآفاق" کو جابجا "معلومات الافاق" لکھا ہے اس کی شروعات صفحہ ۱۱۷ سے ہوتی ہے اور ایک دوسری تصنیف خلاصۃ السیاق کو متعدد صفحات پر "خلاصیۃ السیاق" اس کی ابتدا بھی صفحہ ۱۱۷ سے ہی ہوئی ہے۔ میر جملہ کے فتح آسام اور کوچ بہار کے حالات پر مشتمل تاریخی تصنیف "فتحیہ عبریہ" اور اس کے مؤلف شہاب الدین طالش سے کم از کم اورنگ زیب پر تحقیق کرنے والے ریسرچ اسکالرز ضرور واقف ہیں لیکن زیر تبصرہ کتاب کے صفحہ ۳۴ پر مترجم موصوف نے طالش کو "تالش" اور اُن کی تصنیف کو "فتح عبریہ" تحریر فرمایا ہے۔ فتحیہ عبریہ کا اول حصہ "تاریخ ملوک آسام کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ فاضل مترجم نے اسے "تاریخ ملوک آشام" بنا دیا ہے۔ دُرد آشام، خون آشام وغیرہ تراکیب تو رائج ہیں مگر "ملوک آشام" کی نادر ترکیب پہلی دفعہ دیکھنے میں آئی۔ آشام، آشامیدن (پینا) کا حاصل مصدر ہے۔ ہفت گلشن محمد شاہی المعروف بہ تذکرۃ السلاطین چغتائی مؤلفہ محمد ہادی کامور خاں کافی مشہور تصنیف ہے جس میں تیموریہ خاندان کے ۱۷۲۵ء تک کے حالات ملتے ہیں۔ اسی معروف تاریخی تصنیف کو صفحہ ۱۱ پر "تذکرۃ السلاطینِ چغط" نیز صفحہ ۳۴۱ پر "تذکرۃ السلاطین چغتا" لکھا گیا ہے۔ اردو ادب کی مشہور و معروف ادیب محترمہ عصمت چغتائی کا نام آج کل اردو حلقوں میں نوکِ زبان ہے لیکن فاضل مترجم شاید انھیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ امام المتاخرین شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی ۱۷۶۲ء) کے سیاسی مکتوبات کو محترم المقام پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے مرتب فرمایا ہے۔

اس وقیع کتاب کو ص ۳۴۵ پر "سیاست مکتوبات" اور جناب لال رام صاحب کی تالیف "تحفۃ الہند" مطبوعہ ۱۳۴۸ھ کو ص ۳۴۹ پر "تحفت الہند" نیز انشائے زبدۃ العرائض کو ص ۳۴۴ پر "... زبدۃ ..." تحریر کیا ہے۔ تاریخ فیروز شاہی مصنفہ ضیاء الدین برنی سے شاید ہی کوئی طالب علم ناواقف ہو لیکن اسے ص ۲۱۰ پر "تاریخ فروز شاہی"۔ کویراج شیامل داس کے ہندی زبان میں لکھے گئے مشہور اتہاس "ویرونود" (بیربنود) کو ص ۱۲۷ پر "دریوونود" اور مسالک الابصار فی ممالک الامصار کو مضحکہ خیز حد تک "مسالک الاثبار فی ممالک امثار" (ص ۶۵) تحریر فرمایا ہے۔ اسی طرح ص ۳۴۶ پر "پرچہ جات" (Purchas) کو "پرکاس" اور ص ۱۰۶ پر "پرکاش" (روشنی) لکھا ہے۔ اچھا ہوا کہ اسے "پرخاش" نہیں لکھا ص ۳۴۶ پر ہی "Purchas His Pilgrimes" کا ترجمہ "پرکاس کی سیاحت" کیا ہے جو نہایت معنی خیز ہے۔ اب تک چینی سیاح فاہیان و ہوان شوانگ، عراقی سیاح سلیمان سیرافی عرف سلیمان سوداگر، ایرانی سیاح بزرگ بن شہریار اور مشہور سیاح ابن بطوطہ اور مارکوپولو وغیرہ کے ناموں سے تو راقم الحروف کسی قدر شناسا تھا لیکن "پرکاس کی سیاحت" فقرہ پڑھنے سے معلوم ہوا کہ عہد اورنگ زیب میں "پرکاس" نام کا بھی کوئی سیاح ہو گذرا ہے۔ شاہ جہاں نامہ (عمل صالح) کے مصنف محمد صالح کنبو کو ص ۳۴۰ پر "کمبھو" بروزن "شمبھو" ثبت کیا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اردو ادب کی مشہور و معروف شخصیت مولانا امتیاز علی خاں عرشی رامپوری مرحوم کو ص ۳۴۱ پر "عرش" بنا دیا ہے۔ مولانا نے مرحوم غالبیات کے تنہا ور اساطین اربعہ میں سے ایک تھے۔ بقیہ تین بقول جناب دوارکا داس شعلہ، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر مختار الدین احمد اور گرامی قدر مالک رام صاحب ہیں۔ دعا ہے کہ مؤخر الذکر بزرگ کو اللہ تعالیٰ اردو زبان و ادب کی خدمت کے لئے تادیر زندہ و سلامت رکھے۔ موصوف کا پایہ اسلامیات میں بھی کافی بلند ہے۔

علم تاریخ کی بعض معروف اصطلاحات کو بھی غلط لکھا گیا ہے، مثلاً "احدی" جو اکبر کے زمانہ سے مغلوں کے یہاں ایک مخصوص فوجی عہدہ تھا، تو تقریباً نو دفعہ "اہدی" یا "آہدیوں" اور "ایدیوں" لکھا ہوا ملتا ہے جس کی شروعات ص ۲۰ سے ہوتی ہے اور ص ۱۴۲ تک جاری رہتی ہے۔ دراصل لفظ احدی "احد" اور یائے نسبت سے مرکب ہے جو آج کل بہ سکون حائے حطی کاہل اور سست آدمی کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ اس کی جمع اہدیوں (احدیوں) نہ ہوکر آحاد ہونی چاہیئے۔ ان فوجیوں کا افسر اعلیٰ بخشی الآحاد کہلاتا تھا۔ ایک اور اصطلاح چتر تورغ یا طورغ کو ص ۲۰۶ پر "چھتر طوق" اور اسی صفحہ پر تومان تورغ یا طومان طورغ کو "طومان طوق" تسوید فرمایا ہے گویا مغل امراء پر بادشاہ کی طرف سے نہ صرف چتر وغیرہ ہی سایہ فگن ہوتے تھے بلکہ طوق بھی ان کی گردن کا پھندا بننے کے لئے منتظر رہتا تھا۔ اصل میں طوق اُس بھاری حلقہ کو کہتے ہیں جو مجرموں کے گلے میں ڈالا جاتا ہے تاکہ اس کی وجہ سے وہ اپنی گردن نہ اٹھا سکیں۔ اِسے طورغ سے کوئی نسبت نہیں ؏

"کوئی نسبت بھی ہے ان آنکھوں سے پیمانے کو"

طورغ ترکی لفظ تورغ کا معرب ہے جو فوج کے علم یا نشان کو کہتے ہیں، اسی طرح طومان بھی ترکی لفظ تومان یا تمن کا بدل ہے جو گروہ خصوصاً دس ہزار آدمیوں کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور چتر ہندی لفظ "چھتر" کا معرب ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی شہزادہ سلیم اور مان بائی بنت راجہ بھگوان داس کی شادی کی تقریب کے سلسلہ میں اپنی ایک مشہور نظم میں فرماتے ہیں ؎

اُدھر راجہ کی نور دیدہ گھر میں حجلہ آرا تھی
اِدھر شہزادہ پر چترِ عروسی سایہ گستر تھا

علامہ کی اس نظم کا آخری شعر تو زبان زد عوام و خواص ہے ؎

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

مشہور یوروپین سیاح ٹیورنیر (Tavernier) جسے جہاں گرد لوگوں کا شہزادہ کہا جاتا ہے، ۱۶۴۰ء میں یہاں آیا تھا اور کم و بیش پچیس سال تک ہندوستان میں قیام کیا، بڑے بڑے امرا خصوصاً شائستہ خاں اور میر جملہ سے اس کے دوستانہ مراسم تھے، اسی ٹیورنیر کو ص ۲۲۴ پر "ٹیومرنیر" لکھا ہے۔ فرانکوئیس پلیسرٹ جو ۱۶۲۰ء میں ولندیزی فیکٹری کے گماشتہ کی حیثیت سے ہندوستان آیا۔ اس کی تصنیف 'ریمنسٹرنیٹی' اس کے سات سالہ قیام ہندوستان کے تجربات کی عمدہ دستاویز ہے جس کے بعض بیانات نہایت دلچسپ ہیں۔ اسے ص ۴۸ نیز ص ۲۵۱ پر پلیمارٹ اور ص ۲۵۲ پر پیلیرٹ لکھا ہے۔ انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر کے مصنف مورلینڈ کو ص ۱۰۶ پر "مولینڈ" اور ص ۱۴۰ پر "مورلین" بنا دیا ہے۔ فریر (Fhayer) کی تاریخی تصنیف 'A New Account of the East India and Persia' کا ترجمہ ص ۱۴۲ پر "مشرقی ہندوستان اور ایران پر ایک نئی نذر" کے عنوان سے کیا ہے گویا مشرقی ہندوستان اور ایران کی دلوی پر ایک نئی پیشکش اور بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔ یہاں 'نذر' کی بجائے 'نظر' ہونا چاہیے۔ یوں بھی Account کا ترجمہ نظر نہیں ہوتا۔ سرگذشت وغیرہ لکھنا مناسب تھا۔ فریر کو ص ۱۶۶ پر "فرامنر" اور حاشیہ ۵ میں 'فرائر' لکھا ہے۔ بعض اداروں کے نام میں بھی کاتب نے تصحیف اور بے جا تصرف سے کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر پیش لفظ سے پہلے صفحہ پر "انڈین کاؤنسل آف ہسٹاریکل ریسرچ" کو "انڈین کارنسل آف ہسٹاریکل" انڈیا آکنس کو ص ۳۳۹ پر انڈیا آوفس اور انگلینڈ کی مشہور زمانہ یونیورسٹی کیمبرج کو

ص ۳۴۷ پر "کمیرج" بنادیا ہے نیز مولانا آزاد لائبریری علی گڈھ کے "سبحان اللہ کلیکشن" کو ص ۳۴۳ پر "سجان اللہ" بناتے ہوئے قومی یکجہتی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ کاتب جناب محمد ہارون صاحب بھرتپوری سے درخواست ہے کہ وہ اس جذبہ کو اپنے وطن مالوف بھرتپور میں بھی پروان چڑھائیں تو بہتر ہے۔

برادرانِ وطن کے بہت سے نام سے بھی صحیح املا کے ساتھ ارقام نہیں فرمائے گئے مثلاً: شیخ الاسلام بن قاضی عبدالوہاب کے ملازم اور بعد ازاں جودھپور کے حاکم الیسرداس ناگر صاحب فتوحاتِ عالمگیری کے نام ص ۱۲، ۴۸ نیز دوسرے کئی صفحات پر "ایشرداس" اور ص ۳۳۸ ح ۱ پر "اسیرداس" لکھا ہے۔ داس (غلام) تقریباً اسیر ہی ہوتا ہے۔ بہرسو اردو کا معمولی طالب علم بھی اسے شاید ہی "ایشر" لکھنے کی غلطی کرے اور اکبری عہد کے معروف جرنیل ابنیر کے راجہ مان سنگھ کچھواہہ کو ص ۱۶۶ پر "کچھاوا" اور ص ۲۷۹ پر "کچھاداہا" مہاجہ مہا سنگھ بھدوریہ کو ص ۲۸۳ پر "ماہاسنگھ" "کشن سنگھ تنوتر (कंवर) کو ص ۱۸۵ پر "تونوئر" تلنگ راؤ کو ص ۳۰۶ پر "تینلگ راؤ" جمیت سنگھ کو ص ۳۴۴ پر "جیت سنگھ" اور اورنگ زیب کے مشہور کروڑی رسکداس کو ص ۱۳۴ پر "سکداس" تحریر فرمایا ہے۔ یہ وہی رسکداس ہے جسے اورنگ زیب نے اپنے آٹھویں سنِ جلوس میں عاملین پرگنہ کو احکام شاہی پر کاربند ہونے کے لئے ایک فرمان جاری کیا تھا۔ مورخ ایس۔ آر پھڑکے اور پرماتماسرن کو علی الترتیب ایس۔ آر۔ بھڈکے اور پرماتماسرن (ص ۱۷۵، ۳۴۹) اور راج سنگھ کو ص ۱۰۰ پر "واج سنگھ" تحریر کیا ہے ع

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ص ۲۵۷ پر لفظ "نوادردول" کو "نوادردون" اور ص ۲۵۹ پر "نوادِرول" یعنی نادر کی جمع الجمع ثبت کیا ہے۔ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ص ۲۲۲ پر پہلی ہی سطر میں

"تجار" کو بھی جمع الجمع کے صیغہ میں "تجاروں" لکھا ہوا دیکھتے ہیں۔ دیباچہ میں ص ۷، ۸
پر لفظ "مشکور" کا استعمال بھی برمحل نہیں ہوا ہے۔ یہ لفظ چار دفعہ شکرگذار کے
معنی میں استعمال کیا ہے۔ یعنی "جناب بدرالدین طیب جی کا مشکور ہوں،.... ڈاکٹر
ستیش چندر کا بہت مشکور و ممنون ہوں،.... مہاراج کمار.... کا بے حد مشکور
ہوں،.... مسز سعیدہ انصاری کا اُن کے تعاون کے لئے مشکور ہوں۔" گو راقم الحروف
اردو زبان و ادب کا طالب علم نہیں تاہم اس لفظ کے استعمال کے سلسلے میں اتنا عرض
ہے کہ مشکور کی نسبت اُس شخص کی طرف کی جاتی ہے جس نے احسان کیا ہو نہ کہ جس پر
احسان ہوا ہے چنانچہ مذکورہ فقرات میں 'شکرگذار' استعمال ہونا چاہئے تھا نہ کہ
'مشکور'۔ عوام الناس اسے ممنون کے معنی میں اسی طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح
راشی کو 'مرتشی' اور مخالص کو 'خالص' کے معنی میں۔ اتنا شکر ہے کہ مندرجہ بالا ایک
فقرہ میں "حد" صحیح لکھا ہوا ہے ورنہ ص ۲۴۲ کے ح ۲ میں 'ہدبندی' لکھا ہوا ملتا ہے۔
متوفی کے بجائے 'فوتی' کا استعمال بھی جابجا دیکھنے کو ملتا ہے جو فصیح نہیں کہا جا سکتا۔
کچھ فقرے بھی ثقالت سے پُر ہیں۔ ص ۸۸ پر "حکومت حکمت کی عملی" لکھا ہوا ہے جسے
"حکومت کی حکمت عملی" ہونا چاہئے تھا اور ص ۱۱۱ پر "کارسار خزانہ" کو کاسار خزانہ
اکثر مقامات پر محسوس ہوتا ہے کہ ترجمہ سلیس و بامحاورہ نہ ہو کر محض لفظی ہے اور کئی
جگہ یہ خیال بھی گذرتا ہے کہ اصل مقالہ کے بعض فقرات کا ترجمہ محذوف ہے۔ چونکہ
خاکسار کے پاس ڈاکٹر محمد اطہر علی صاحب کی اصل تصنیف موجود نہیں ورنہ مقابلہ
کر کے دیکھ لیا جاتا۔ بیورو کی شائع کردہ تاریخ جہانگیر اور تاریخ شاہ جہاں کے
اکثر صفحات میں یہ نقص راہ پا گیا ہے جسے ممکن ہے طبع ثانی میں دور کر دیا گیا
ہو۔

مندرجہ بالا امور کے علاوہ زیر نظر کتاب میں بہت سے عام اور روزمرہ

بول چال کے الفاظ بھی غلط املا کے ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثلاً صـ۲۶ اور دوسرے صفحات پر خانزادگان یا خان زادوں کو ذال معجمہ سے تحریر کیا ہے۔ محروسہ صـ۲۰ پر "معروسہ" ہمعصر صـ۲۷ پر "ہم عصر" منافرت صـ۳۶ پر "منافرفت" منہا صـ۵۱ پر "منھا" حصول الاعشاریہ صـ۶۵ پر "اصول الشاریہ" سوم یا سویم صـ۷۶ پر "صوم" مستثنیٰ صـ۷۸-۸۲ پر "مستثنی" موافقت صـ۹۰ پر "موائقت" تصحیح صـ۹۵ پر "تقیح" عمادالملک صـ۱۰۵ پر "عماد الملک" جائیداد صـ۱۰۷ پر "جایداد" دائرہ صـ۱۰۸ پر "دائر" انقطاع صـ۱۲۳ پر "انقطا" حوالگی صـ۱۲۵ پر "حوال گی" مزارعان صـ۱۳۴ پر "مزارعیان" واقعہ ذیل صـ۱۳۶ پر "واقعے ذیل" بالمقطع صـ۱۶۱ پر بالمقطہ موروثی صـ۱۴۳ پر "موروثی" مشتعل صـ۱۴۸ پر "مشتعل" لکھا ہوا ہے۔ صـ۱۵۳ پر یہ فقرہ "محنتی وکیل دلسوز کی کوششوں کے باوجود" محل نظر ہے۔ صـ۱۵۹ پر تنازعات کو "تنا زاعات" اور توجیہ کو صـ۱۶۴ نیز صـ۲۴۱ پر "توزیع" تحریر فرمایا ہے۔ جارحانہ صـ۱۶۷ پر "جارہانہ" پیپا صـ۱۶۹-۷۲ پر "پیپہ" استفتاء صـ۱۷۱ پر "استغفار" رونما صـ۱۷۵ پر "رونماں" جرأت صـ۱۷۲ پر "جرئت" عائشہ بانو صـ۲۰۹ پر "عائشہ بانوں" مصالحت صـ۱۷۹ پر "مطالحت" تشخص مآب صـ۲۰۵ "تشخیص مآب" مبذول صـ۲۲۱ پر "مبزول" تجارتی مزاج صـ۲۲۸ پر "تجارتی مزاد" تجدید صـ۲۳۶ پر "تجویز" ملاحی صـ۲۳۷ پر "ملاہی" خدم وحشم صـ۲۵۱ پر "قدم و حشم" لابدی صـ۲۵۵ پر "لابد" ماخذ صـ۲۳۰ پر "اخذ" ایک حصہ صـ۲۴۳ پر "احصہ" برأت صـ۲۴۱ پر "برآت" اور اسی صفحہ کی سطر ۲۴ پر "برات" داروغہ صـ۲۱۴ پر "دادوغہ" اسی صفحہ پر صحیفہ "صیحفہ" آغا خورد صـ۲۳۲ پر "آغا خرد" نفعیت صـ۳۴۱ پر "نفعت" ہبہ صـ۳۴۳ پر "جبہ" "سترہویں صدی" صـ۶۷-۸ پر "ستروین صدی" اور پنج ماہہ، ہشت ماہہ صـ۴ پر ـــ ماہا" نیز شش ماہانہ کو صـ۷۹ پر "ششت ماہانہ" تحریر فرمایا ہے۔ ان الفاظ کے علاوہ بیسیوں اور

الفاظ بھی غلط لکھے ہوئے مثلاً "شیعیوں" کو ص ۳۸ نیز ۵۸ پر "شعیوں" اور ۱۷ پر شیعہ کو "شعیہ" ص ۲۰ پر عالمگیری کو "عالم گری" وغیرہ لکھا ہے۔ بہر کیف اس قسم کی اغلاط کا احاطہ دشوار ہے۔

ترقی اردو بیورو کی شائع کردہ کتاب تاریخ شاہ جہاں کی اغلاط کی نشاندہی کرتے ہوئے پروفیسر محمد اسلم صاحب نے فرمایا تھا کہ "تاریخ شاہ جہاں کی طباعت ڈاکٹر سید اعجاز حسین (مترجم) صاحب اور اُن سے بھی بڑھ کر ترقی اردو بورڈ کے لئے باعثِ بدنامی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترقی اردو بورڈ اردو کے تنزل کے لئے کوشاں ہے۔" (برہان دہلی بابت فروری ۱۹۸۱ء) راقم الحروف "اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء" کی نسبت اتنا سخت ریمارک کرنے کی جسارت تو نہیں کر سکتا البتہ اتنی گذارش ضرور ہے کہ اردو بڑی نازک اور لچونتی زبان ہے لہٰذا اردو داں حلقوں کا فرض ہے کہ اس کی نزاکت کو برقرار رکھنے کی سعیٔ مشکور کی جائے اور الٹا سیدھا لکھ کر اس کے خوشنما چہرہ پر لاجوردی نقاب (ماتی جامہ) نہ ڈالا جائے۔ ورنہ اگر اسی طرح لاتعداد لایعنی اغلاط کے ساتھ ترقی اردو بورڈ کتابوں کی طباعت کراتا رہا تو روحِ غالب سے معذرت کے ساتھ ہمیں یہ عرض کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ ؎

یوں ہی گر "لکھتا" رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا اِس "ریختہ" کو تم کہ "ویراں ہو گئی"

ایک خاص اعلان

محترمی سلام مسنون - مزاج گرامی!

بعنوان شاندار نمبر مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ ان لوگوں اور ان مخلصین و مریدین احباب کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی کی وفات کے بعد سے برابر شاندار نمبر نکالنے کے سلسلے میں یہ اعلان اپنے اس رسالہ برہان میں برابر آرہا ہے مگر مجھے افسوس ہے کہ اب تک میں اس کے مواد کے ذخیرہ کو اکٹھا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آپ پہلی فرصت میں مضامین بھیجیں بہت سے مضامین اور اس کے اجزاء کافی تعداد میں جمع ہو چکے ہیں اور نئے سال کے آغاز میں اس کو منظر عام پر لانے کا اللہ کے فضل و کرم سے پورا قصد کر لیا ہے۔ آپ لوگ زیادہ سے زیادہ اس کے اخراجات کے لئے چندہ اس انداز میں بھیجیں کہ آپ کی خریداری اور ممبری میں پیشگی رقم جمع کی جا سکے اور ایک طرح سے اس کی علمی خدمت اور مدد بھی ہو جائے گی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات گرامی سے میں امید رکھتا ہوں کہ آپ جلد از جلد تعاون فرمائیں گے۔

نوٹ: جن فرموں میں متفرق مساجد اور ٹرسٹوں کے جو بھی امدادی فنڈ قائم کیے گئے ہوں اس سے اس ادارہ ندوۃ المصنفین کی مدد فرمائیں۔ یہ آپ کے ثواب دارین میں داخل ہونے کا ایک اہم مقصد ثابت ہوگا۔

شکریہ

صاحبزادہ عمید الرحمن عثمانی

بُرہان

مدیر مسئول : عمید الرحمٰن عثمانی

جلد ۹۸	ربیع الاول ۱۴۰۷ھ مطابق نومبر ۱۹۸۶ء	شمارہ ۵

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار
جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

نظرات

دہلی کی راجدھانی، جس نے بے شمار انقلابات دیکھے، دنیا کی مشہور اور بے مثال خوں ریزیوں کے دور سے گذری، بدامنی کے گہوارے کی حیثیت سے تاریخ میں جگہ بنائی، گذشتہ پانچ چھ برسوں سے ایک بار پھر تاریخ کو دہرانے کا رجحان ظاہر کر رہی ہے۔ اور پرانی دہلی کے ان علاقوں سے لیکر جہاں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے گہوارے دہلی کے لوگوں، یہاں کے ہندو مسلمان سنتوں اور صوفیوں نے بسائے تھے اور بادشاہوں اور کمانڈروں نے لوریاں سنائی تھیں، نئی دہلی کی پر تعیش کالونیوں تک جہاں دولتمندوں نے پرانے شہر کی دم گھونٹنے والی فضا، اور بھیڑ بھاڑ سے پناہ کے لئے امن کے گوشوں کے طور پر عالیشان کوٹھیاں تعمیر کی تھیں، اور کالونیاں بسائی تھیں، اب بدنظمی، خون ریزی اور موت کے ہیبت ناک سائے ہیں، ایک بے یقین مستقبل سے خائف نظر آرہے ہیں۔

اسی دہلی میں تیمور کے خون آشام فوجیوں نے لوٹ مار اور تیغ ستم کے ذریعہ یہاں کے ہندو مسلمانوں کے خون کو سڑکوں پر بہایا لیکن زلزلے کے ایک تباہ کن جھٹکے کی طرح چاروں طرف تاراجی، ویرانی اور ہلاکتوں کے آثار چھوڑ کر یہ فوج گذر گئی، یہاں تک کہ صاحب قران تیمور کے جانشینوں نے اپنے جد امجد کے گناہوں کی تلافی کے طور پر دہلی کے مہکتے گلستان اور طلسماتی شہر میں اس طرح تبدیل کیا کہ آج تک لال قلعہ اور

جامع مسجد کی عمارتیں، ہیرے کے نگینوں کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں تیمور کے ان جانشین مغل بادشاہوں نے اسی دہلی میں بیٹھ کر جسے ان کے دادا نے قتل عام اور لوٹ مار کے ذریعہ ..... منہدم اور مسمار کر دیا تھا۔ ہندوستان کی تعمیر و تشخص کا وہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ کہ ایک ایسی سرزمین کو جو ہمیشہ رجواڑوں کی بے شمار سلطنتوں میں بٹی رہی تھی، ایک ملک، ایک قوم اور ایک مشترکہ تہذیب کے تصور سے مالا مال کیا۔ اور قندھار سے لیکر راس کماری تک کے پورے علاقے کو یک رنگی اور اتحاد کے شیرازہ میں اس طرح باندھ دیا کہ آج بہت کم لوگوں میں یہ احساس باقی رہ گیا ہے کہ جس ملک کی سالمیت، اتحاد اور تحفظ کی وہ بات کرتے ہیں اس کا تمام تر نقشہ مغل بادشاہوں ہی کا بنایا ہوا ہے، جس میں اورنگ زیب نے سترھویں صدی کے آخر میں ۲۵ برس کی جانفشانی کے بعد رنگ بھر کر مکمل کیا تھا۔

اسی اورنگ زیب کے جانشین، جس نے ۹۰ برس کی عمر میں میدان جنگ میں تلواروں اور نیزوں کی جھنکار اور توپوں کے دھماکوں کے درمیان جان دی، محمد شاہ جیسے ہوئے جنھوں نے تاریخ میں رنگیلے بادشاہ کی حیثیت سے اپنا نام لکھوایا۔ اسی محمد شاہ کے دور حکومت میں، مغلوں کی شامت اعمال نادر شاہ کے حکم پر ایسے قتل عام کی صورت میں ظاہر ہوئی کہ آٹھ پہر میں اس زمانے میں ایک لاکھ کے قریب دہلی کے باشندے ہلاک ہوئے اور پورا شہر آباد اور شاندار عمارتوں میں لگائی ہوئی آگ، اور دھویں کے مرغولوں سے جہنم کا نقشہ پیش کرنے لگا۔ نادر شاہ تو ایک لاکھ باشندوں کے، یہاں کے ہندو مسلمانوں کے خون کا دھارا، یہاں کی گلیوں اور سڑکوں پر بہا کر، تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرے سمیت مغل بادشاہوں کی پشتوں کی جمع کی ہوئی دولت کے ساتھ ایران واپس ہو گیا لیکن دہلی اس کی لگائی ہوئی مہلک ضرب سے

پھر آخر تک جان بر نہ ہوسکی، اور ایسی بدامنی، طوائف الملوکی اور شورش کا گہوارہ بن گئی کہ اس کے بادشاہ مفلوج و معطل اور بے دست و پا ہوکر رہ گئے اور اس کے مشاہیر اور صاحب فن افراد تلاش معاش میں سارے ملک میں سرگرداں، اور حیران و پریشان گھومتے نظر آئے۔

دہلی کی قسمت ــــ نادر شاہ کے حملے کے بعد ایسی بگڑی کہ یہ شہر جو کبھی ساری دنیا کا سب سے بڑا آباد، پر رونق شہر تھا اور ماہرین فن کے بے مثال جمگھٹوں کے لحاظ سے ساری دنیا کے ملکوں کے لئے قابلِ رشک بنا ہوا تھا، خانہ جنگیوں، آئے دن کی بغاوتوں، اور شورشوں کی آماج گاہ بن کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کے قتل عام کے بعد، جس کے سامنے تیمور اور نادر شاہ کے حملوں کی دہشت ناک یاد بھی لوگوں کے حافظے سے فراموش ہوگئی، یہاں انگریزی راج قائم ہوگیا، مجبور و معذور تاجدار اور مغل خاندان کے آخری چشم و چراغ ظل اللہ بہادر شاہ ظفر انگریزوں کی قید میں، جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیے گئے۔ اور دہلی کو پوری ایک صدی کی شورشوں، بدنظمی اور بدامنی سے نجات پا کر امن و سکون کے دن دیکھنے نصیب ہوئے۔

انگریزوں کے دور میں ہندوستان کے ہر شعبۂ زندگی میں انقلاب رونما ہوا، یہاں کا نظام سلطنت بدلا، پرانا جاگیرداری نظام تبدیل ہوا، یہاں کی سیاست حکمرانوں اور فوجی کمانڈروں کے بجائے عوام کے ہاتھ میں آئی اور بغاوت اور مسلح جدوجہد کی جگہ عوام کی سیاسی جدوجہد نے لے لی، تلواروں اور بندوقوں کے بجائے سیاسی اقتدار اور حکمرانی کے فیصلے لوگوں کی رائے اور ہاتھوں کے شمار کے ذریعہ کیے جانے کا نیا جمہوری نظام ابھر آیا۔ ساری پرانی دنیا دیکھتے دیکھتے بدل گئی اور اس کی جگہ ایک بالکل نئی دنیا سارے ملک اور راجدھانی دہلی میں پیدا ہوگئی انگریزوں

کے اصل حریف مغل بادشاہ تھے، جن کی مرکزی حیثیت کو ختم کرنے کے لئے انھوں نے ایک طرف ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی دیسی ریاستوں کو، جو خود مختار ہونے کے باوجود مغل دربار سے ذہنی وابستگی ضرور رکھتی تھیں، ختم کیا اور مغل بادشاہوں کو بے دست و پا بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، لیکن وہ ان کی شان و شوکت و عظمت کے نہ صرف قائل بلکہ مرعوب بھی تھے، اس مرعوبیت کا اظہار ان کی طرف سے نئی دہلی کی راجدھانی کی تعمیر میں پوری طرح ہوا، انھوں نے وائسریگل لاج کو جو اب راشٹرپتی بھون کہلاتا ہے دراصل لال قلعہ کی اس زمانے کی شان و شوکت کو ماند کرنے کے لئے تعمیر کیا اور اسے پرشکوہ اور شاندار بنانے میں اپنی صلاحیت اور مہارت کا پورا زور صرف کر دیا۔

انھوں نے نئی دہلی کی راجدھانی کو ایسی فراخدلی، اور عظیم الشان پیمانہ پر تعمیر کیا کہ وائسریگل لاج، پارلیمنٹ اور اس سے ملحق عمارتوں کی شان و شکوہ، خوبصورتی اور عظمت کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی لیکن وہ لال قلعہ کی عظمت و شکوہ کی بلندیوں کو چھونے میں۔ اس زمانے کی عام رائے کے مطابق ناکام رہے، بہر حال انھوں نے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کے نوّے ۹۰ برسوں میں اپنے اعلیٰ انتظام اور نظم و نسق کی بہتر سے بہتر صلاحیتوں کو صرف کر کے راجدھانی دہلی کو اس کی کھوئی ہوئی عظمت، اور رونق سے مالا مال کر دیا اور دہلی والوں نے ایک صدی کا یہ طویل عرصہ پوری طرح یکسوئی، دل جمعی، امن و سکون اور شورشوں سے مکمل نجات کی نعمتوں کے ساتھ گذارا۔

لیکن دہلی کی تعمیر میں خرابی کی جو صورت اس کی آبادی کے اول دن سے مضمر چلی آتی ہے، اور بار بار آباد ہو کر بار بار اجڑنے کی جو تقدیر اس نے اول روز سے لکھوائی ہے .... اس نے ۱۹۴۷ء میں، ملک کی آزادی کے خوش بختی کے سال میں، ایک بار خاک و خون میں لوٹنے اور قتل و غارت کی ایسی آزمائش

سے گذرنے پر مجبور کر دیا جو اس سے پہلے کی خوں ریزیوں کے مقابلہ میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے مثال تھی۔ اس دور میں مسلمانوں کا اتنا خون وہاں بہا، اور ان کے خانماں برباد ہونے کے ایسے مظاہروں سے دہلی کا سامنا ہوا کہ جامع مسجد دہلی میں دو ہفتوں تک کوئی نماز اس لئے قائم نہ ہو سکی کہ وہاں لاکھوں پناہ گزینوں کے ہجوم سے تل دھرنے کی جگہ نہ رہ گئی تھی، اب کی بار یہ خوں ریزی، یہ بدامنی، شورش اور قتل و غارت کی یہ حالت صرف دہلی تک محدود نہ تھی بلکہ تقسیم ملک کے نفسیاتی اور اشتعال انگیز ردعمل کی وجہ سے سارا شمالی ہند اس طرح دھڑ دھڑ جل رہا تھا کہ بلا مبالغہ ہزاروں کی تعداد میں، پاکستان جانے والے مسلمانوں کے قافلے، آس پاس اور دور دراز کی بستیوں سے اجڑ کر دہلی میں پہونچتے اور یہاں کے پناہ گزینوں کے کیمپوں کے سمندر میں ندی نالوں کی طرح مل جاتے۔

اس نئے انقلاب کی بدولت دہلی ایک بار پھر اس طرح اُجڑی کہ نہ صرف اس کی شکل بلکہ اس کا کردار بھی تبدیل ہو کر رہ گیا۔ یہاں کے ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کے ساتھ، ان کی تہذیبی انفرادیت بھی اس نئے انقلاب کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہتی چلی گئی۔ اس انقلاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ صرف چار مہینے کی شورش، بدامنی، بدنظمی اور قتل و غارت کے دور کے بعد، بیسویں صدی کی سب سے بڑی سب سے زیادہ ہتم بالشان اور عظیم المرتبت گاندھی جی کی جان کی بھینٹ لے کر یہاں امن و سکون کی فضا قائم ہوئی، تو دہلی کا شہر عملی طور پر پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کی اکثریت کے طفیل ایک پنجابی شہر ہو کر رہ گیا تھا جہاں پنجابی تہذیب کی چھاپ ہر شعبۂ زندگی پر نظر آنے لگی۔

دہلی کی اس نیم غیر متوازن سماجی زندگی میں برہمی اور خلفشار کا دوسرا دور

۱۹۷۵ء میں شروع ہوا جبکہ یہاں کے لوگوں خصوصاً مسلمانوں کو ایک بار پھر ایمرجنسی کی سختیوں اور تباہ کاریوں کا شکار ہونا پڑا۔ اور ترکمان گیٹ اور دوسرے علاقوں میں ان کی تاراجی اور خانہ بربادیوں کے دردناک واقعات پیش آئے، پھر اس کے بعد ۱۹۸۰ء میں فرقہ وارانہ فسادات کے ایک نئے سلسلہ سے انھیں دوچار ہونا پڑا۔

۱۹۸۰ء کے بعد سے پرانی دہلی کے وہ علاقے، جہاں ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے مسلمانوں کی بچی کھچی آبادی جوں توں کرکے اپنی زندگی بسر کر رہی تھی، فرقہ وارانہ فسادات کی زد میں رہے ہیں، ان فسادات کی بنیاد فراش خانہ اور رودگران محلوں میں واقع ہریجن بستی اور آس پاس کے مسلم محلوں کے نوجوانوں کے درمیان تکرار اور جھگڑوں سے پڑی، جو جلد ہی ویسے ہی ہریجن مسلم فساد میں تبدیل ہو گئی، جس طرح مرادآباد، اور دوسری جگہوں میں تبدیل ہوئی تھی، پھر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، ان فسادات میں مندر مسجد کے جھگڑوں، نعروں اور جلوسوں، باجوں اور سنکھوں اور ترشولوں کے عناصر شامل ہوتے گئے، اور اب نوبت یہ آگئی ہے کہ جامع مسجد، حوض قاضی، ٹیا محل، لال کنواں، اور فراش خانہ کے محلے ہندو مسلم فسادات کے ایسے حساس مرکز بن گئے ہیں، اور کشیدگی کی شدت سے اتنے گرم ہو گئے ہیں کہ ذرا سی ٹھیس سے وہاں دھڑ دھڑ آگ جلنے لگتی ہے، نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کرفیو، پولیس گشت، اور کاروبار کا تعطل وہاں روزانہ کی زندگی کا ایک حصہ بن گیا ہے، اور اس کا تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ دہلی ایڈمنسٹریشن نے بھی اسے زندگی کے ایک معمول کی صورت میں قبول کر لیا ہے، اس لئے وہاں تنازعہ کو مکمل طور پر ختم کر دینے کا کوئی منصوبہ بظاہر زیر غور نہیں ہے۔

نئی دہلی کی وہ کالونیاں جو آدھی صدی سے زیادہ مدت تک امن وسکون کا گہوارہ اور عیش کوشی کی جنت سمجھی جارہی تھیں، سنہ ۱۹۸۴ء کے ہندو سکھ فسادات کے بعد، جو سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کے قتل کے ردعمل میں شروع ہوئے تھے، اب سب سے زیادہ غیر محفوظ اور غیر یقینی صورت حال کا شکار نظر آتی ہیں، قصہ مختصر یہ دارالامن دہلی ایک بار پھر بدنظمی، فتنہ وفساد، شورش اور بدامنی کے شکنجہ میں پھنس گیا ہے، اور ہندوستان کا دل کہلانے والی دلّی ایک بار پھر خوں ریزی، لوٹ مار، آتش زنی اور تشدد کے دور دورے سے بے حال نظر آتی ہے۔
اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دہشت ناک خیال یہ ہے کہ جب بھی دہلی اپنی رونق آبادی اور خوش حالی کے بامِ عروج پر پہونچی ہے، کسی نہ کسی آفتِ ناگہانی کا شکار ہوکر بدحال اور ویران ہوگئی ہے، اس لئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں اس کا یہی انجام قریب نہ ہو۔

صحابۂ کرامؓ کی تحصیل حدیث کی کیفیات

جناب مولوی محمد رضی الاسلام صاحب ندوی، ندوۃ العلماء لکھنؤ

صحابۂ کرامؓ کے تحصیل حدیث کی کیفیات

کتب حدیث کا مطالعہ کرنے سے ہمارے سامنے صحابۂ کرامؓ کے تحصیل حدیث کی مختلف کیفیات سامنے آتی ہیں:

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات:

اگر کوئی واقعہ پیش آتا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود رہتے تو آپ اس کا حکم بتلادیتے تھے۔ جو لوگ اس وقت موجود رہتے ان کے ذریعہ دیگر صحابہ کو بھی معلوم ہو جاتا۔ اگر حاضرین کی تعداد زیادہ ہوتی تو جلد ہی اس واقعہ کی خبر پھیل جاتی لیکن اگر لوگ کم ہوتے تو ان کو لوگوں میں منادی کرنے کے لئے بھیجتے تھے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن ان کے پاس تشریف لائے وہ ایک شال اوڑھے ہوئے تھیں جس میں کچھ تصاویر تھیں۔ اسے دیکھ کر آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا، پھر آپؐ نے اس شال کو لیا اور پھاڑ ڈالا، پھر فرمایا:

إن أشد الناس عذابا يوم القيامة الذين يشبهون خلق الله عزوجل۔ (مسلم)

قیامت میں سب سے زیادہ عذاب ان لوگوں پر ہوگا جو خدا کی مخلوقات کی تصاویر بناتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے پاس سے گزرے جو غلہ بیچ رہا تھا آپؐ نے اس سے پوچھا کیسے بیچ رہے ہو؟ اس نے

بتلایا، پھر آپؐ نے اس سے کہا کہ اس میں ہاتھ ڈالو اس نے ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اندر بھیگا غلہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: لیس منا من غشنا (جو ہمیں دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں) (مسلم، احمد)

اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی صحابی کو غلطی کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو اس کو تنبیہ کر دیتے تھے اور اس کی اصلاح فرما دیتے تھے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ روایت کرتے ہیں کہ غزوۂ خیبر میں جنگ کے بعد کچھ کہنے لگے کہ فلاں شہید ہے فلاں شہید ہے حتیٰ کہ ایک آدمی کے پاس پہنچے اور اس کے بارے میں بھی کہا فلاں شہید ہے۔ آپؐ کو معلوم ہوا تو فرمایا:

کلا إنی رأیتہ فی النار فی بردۃ غلھا أو عباءۃ۔	ہرگز نہیں اسے میں نے دوزخ میں دیکھا ہے مال غنیمت میں سے ایک چادر چوری کرنے کی وجہ سے۔

پھر فرمایا:

إذھب فناد فی الناس إنہ لا یدخل الجنۃ إلا المومنون۔	جاؤ لوگوں میں اعلان کر دو کہ جنت میں صرف مومنین ہی جائیں گے۔

چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے اعلان کیا (احمد)

ایک بار ایک شخص نے جلدی جلدی بغیر تعدیل ارکان کے نماز ادا کی تو آپؐ نے اس کو ٹوکا اور فرمایا:

إذھب فصل فإنک لم تصل	جاؤ پھر سے نماز پڑھو تمھاری نماز نہیں ہوئی۔

ایک مرتبہ صحابی جلدی جلدی وضو کر رہے تھے اس طرح کہ ان کی ایڑیاں خشک رہ گئیں، آپؐ نے فرمایا:

اسبغوا الوضوء، ویل للأعقاب	پورا وضو کرو۔ خشک رہ جانے والی ایڑیوں

من النار۔ پر جہنم کا عذاب ہوگا۔

اسی طرح اگر آپ پر قرآن کی آیات نازل ہوتیں تو آپ ان کی تشریح کرتے، ان کے مجمل کی تفصیل کرتے، عام کو خاص کرتے ناسخ و منسوخ بتلاتے، مبہم کو متعین کرتے مثلاً غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کی تفسیر میں حضرت عدی بن حاتم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: الیہود مغضوب علیہم والنصاری ضلال (ترمذی) (یعنی مغضوب علیہم سے مراد یہودی اور ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں) حافظوا علی الصلوات والصلاۃ الوسطی کی تفسیر میں آپ نے فرمایا: الصلاۃ الوسطی ھی العصر (ترمذی) یعنی صلوۃ وسطیٰ سے مراد عصر کی نماز ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ: میں آپ نے فرمایا: الحمد للہ رب العالمین ھی السبع المثانی (بخاری) یعنی الحمد للہ... سبع مثانی ہے۔

۲۔ سوالات و جوابات:

تحصیل حدیث کا ایک طریقہ "سوالات و جوابات" کی شکل میں ہوتا تھا۔ اس کی تین صورتیں تھیں:

ا۔ کبھی اللہ تعالیٰ کسی فرشتے کو بھیجتا تاکہ وہ حضرات صحابہ کے سامنے انسانی شکل و صورت میں جاکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کرے اور اس طرح صحابۂ کرامؓ کو دینی تعلیمات اور احکامات معلوم ہوں۔ حدیث جبرئیل اس سلسلے میں بہت مشہور ہے۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب سے مروی ہے کہ ہم ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص آیا جس کے کپڑے انتہائی سفید تھے، بال انتہائی کالے تھے۔ اس پر سفر کے آثار بھی نہیں تھے اور نہ ہی ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا تھا، وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

بیٹھ گیا اس کے بعد آپؐ سے اسلام، ایمان، احسان، قیامت اور علامات قیامت کے متعلق سوالات کیے اور آپ نے جوابات دیے اس کے بعد چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد آپؐ نے مجھ سے پوچھا جانتے ہو یہ کون تھے؟ میں نے کہا اللہ ورسولہ أعلم فرمایا: إنہ جبرئیل أتاکم یعلمکم دینکم (یہ جبرئیل تھے جو تمھیں دین سکھانے آئے تھے) (مسلم)

۲۔ کبھی خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرامؓ سے سوال کر دیا کرتے تھے اور پھر خود ہی اس کا جواب دے دیا کرتے تھے چنانچہ حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک گدھے پر سوار تھا میرے اور آپ کے درمیان کجاوہ کے علاوہ کوئی چیز حائل نہ تھی۔ آپؐ نے فرمایا: اے معاذ جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر اور بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ ورسولہ أعلم آپؐ نے فرمایا: اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور بندوں کا حق اللہ پر یہ ہے کہ جو لوگ شرک نہ کریں انھیں عذاب نہ دے (متفق علیہ)

۳۔ البتہ بیشتر مواقع پر خود صحابۂ کرامؓ اپنے مسائل اور پیش آنے والے واقعات کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سوالات کا جواب دیتے تھے۔

ابتداء میں اگرچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کو زیادہ سوالات کرنے سے منع کر دیا تھا اور خود قرآن شریف میں کثرت سوال سے نہی وارد ہے
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ
(اے مومنو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوالات نہ کرو کہ اگر وہ ظاہر ہو جائیں تو تم کو برا لگے) اسی لئے حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

ونہینا فی القرآن ان نسأل النبی صلے اللہ علیہ وسلم فکان یعجبنا أن یجیئ رجل من أھل البادیۃ العاقل فیسأله ونحن نسمع (بخاری کتاب الایمان)

ہمیں قرآن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کرنے سے منع کر دیا گیا تھا لہٰذا ہماری خواہش یہ ہوتی تھی کہ کوئی عقلمند دیہاتی آئے اور آپ سے سوالات کرے اور ہم سنیں۔

مگر ایسا دراصل بے تکے سوالات پر پابندی لگانے کی غرض سے تھا ورنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود صحابۂ کرامؓ کو سوالات کرنے پر اکساتے تھے۔ ایک بار سردی کے زمانے میں ایک صحابی زخمی ہوئے پھر انھیں احتلام ہو گیا۔ لوگوں نے انھیں نہلانے پر مجبور کیا جس کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو فرمایا:

قتلوہ قتلھم اللہ ألم یکن شفاء العی السوال (ابو داؤد)

ان لوگوں نے اس کو مار ڈالا (خدا انھیں غارت کرے) کیا ناواقفیت کا علاج سوال نہیں تھا۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ اپنے مسائل میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کے سوالات میں بعض شخصی زندگی سے متعلق ہوتے تھے۔ مگر بعض ایسے ہوتے تھے جو عام طور پر انسانوں کو پیش آتے ہیں۔ ان سوالات میں صحابۂ کرامؓ ذرا بھی نہ شرماتے تھے اور فوراً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کر لیتے تھے تاکہ اطمینان حاصل ہو جائے۔ اگر کوئی صحابیؓ کسی وجہ سے ہچکچاہٹ محسوس کرتا تو وہ دوسرے صحابی کو حکم دیتا کہ وہ آپؐ سے دریافت کر لے۔ حضرت علیؓ اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ مجھے مذی بہت آتی تھی میں اس کے حکم کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے میں شرم محسوس کرتا تھا کیونکہ آپؐ کی

صاحبزادی ۔۔۔ حضرت فاطمہ ۔۔۔ میرے نکاح میں تھیں اس لئے میں نے حضرت مقداد بن اسودؓ کو حکم دیا کہ وہ آپؐ سے معلوم کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا:
یغسل ذکرہ ویتوضاء۔ اگر کسی شخص کو یہ پیش آئے تو وہ عضو تناسل کو دھوئے اور وضو کرے۔ (مسلم، احمد)

حضرت عقبہ بن الحارثؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اگر کوئی شخص کسی عورت سے شادی کرلے پھر بعد میں معلوم ہو کر وہ اس کی رضاعی بہن ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا کیف وقد قیل؟ (اب کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کہا جا چکا)۔

حضرت علی بن طلقؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے یا کسی دوسرے آدمی نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ میں نماز پڑھ رہا تھا اسی حالت میں ران کھجلانے لگا کہ اچانک میرا ہاتھ عضو تناسل سے مس ہو گیا اس کا کیا حکم ہے (کیا وضو ٹوٹ جائگا گا؟) آپؐ نے فرمایا "ھل ھو الا بضعۃ منہ" (وہ تو جسم ہی کا ایک حصہ ہے)

اسی طرح صحابہ کرامؓ کو عبادات وعقائد، معاملات اور دیگر اشیاء کے متعلق سوالات کرنے میں بھی حیا لاحق نہ ہوتی تھی بلکہ اگر کسی صحابی کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث دوسرے صحابی کے واسطے سے پہنچتی تھی تو وہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسب فیض کی کوشش کرتا تھا اور آپؐ ہی کی زبانی سننے کا متمنی ہوتا تھا۔ حضرت ضمام بن ثعلبہؓ کی وہ حدیث تو بہت مشہور ہے جس میں ہے کہ وہ اپنی قوم کے نمائندوں کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور آپؐ سے کئی سوالات کیے تھے (بخاری کتاب العلم)

آپؐ سے اگر کوئی صحابی سوال کرتا یا کوئی مسئلہ پوچھتا اور آپ کو اس کا حکم نہ معلوم ہوتا تو وحی الہٰی کا انتظار کرتے پھر وحی سے معلوم ہو جانے کے بعد بتلاتے۔ حضرت سہیل

بن سعدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک انصاری آئے اور عرض کیا یا رسول اللہؐ آپ کا کیا خیال ہے اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی آدمی کو خلوت میں دیکھے تو اسے قتل کر دے یا کیا کرے؟ آپ نے فرمایا کہ تہمت لگانے والے پر حد قذف جاری ہوگی یا وہ بیّنہ پیش کرے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی والذین یرمون ازواجہم .... الآیۃ تب آنحضرتؐ نے ان کو بلایا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے اور تمہاری بیویوں کے معاملہ میں فیصلہ ہو گیا (بخاری کتاب اللعان)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کرنے اور مسائل معلوم کرنے میں صحابیات بھی پیچھے نہ تھیں ان کو بھی اگر کوئی اشکال ہوتا تو فوراً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیا کرتی تھیں حتیٰ کہ انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہمارے لئے ایک دن خاص کر دیجئے چنانچہ آپؐ نے ایسا ہی کیا۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے کہ اے عورتو خوب صدقہ کیا کرو اور خوب استغفار کیا کرو کیونکہ میں نے جہنم میں تمہاری تعداد زیادہ دیکھی ہے۔ ایک صحابیہ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! ایسا کیوں ہے؟ آپؐ نے فرمایا کیونکہ تم لعن طعن بہت کرتی ہو، میں نے تم سے زیادہ کسی ناقص العقل اور ناقص الدین کو نہیں دیکھا ہے جو عقلمندوں پر غالب آجاتی ہو۔ انھوں نے پھر سوال کیا یا رسول اللہؐ! نقصان عقل اور نقصان دین سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ نقصان عقل تو یہ کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہوتی ہے اور نقصان دین کہ عورت اپنے مخصوص عذر (حیض ونفاس) کی وجہ سے کئی کئی دن نماز اور روزوں سے رکی رہتی ہے۔

صحابیات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے مخصوص سوالات کرنے میں بھی نہ جھجکتی تھیں۔ اسی وجہ سے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: بہترین عورتیں انصاری

عورتیں ہیں کیونکہ انھیں دین کے معاملے میں سوالات کرنے سے حیا مانع نہیں ہوتی ہے"۔
حضرت ام سلیمؓ نے ایک بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ خواب میں اگر عورت بھی وہی کچھ دیکھے جو مرد دیکھتا ہے تو کیا وہ غسل کرے گی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اگر تری محسوس ہو۔ حضرت عائشہؓ نے سوال کیا کیا عورت بھی یہ سب دیکھتی ہے؟ فرمایا کیوں نہیں پھر بچہ مشابہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟

اسی طرح اگر کسی معاملے میں دو صحابہ کے درمیان نزاع ہو جاتا تو وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح بات معلوم کرنے کے لئے رجوع کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بار ہشام بن حکیم بن حزام کو سورۂ فرقان میں کچھ ایسے حروف پڑھتے ہوئے سنا جو مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتلائے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ قرارت تم کو کس نے تبلائی ہے؟ انھوں نے کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے، میں نے کہا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو ایسا نہیں پڑھایا ہے۔ پھر میں ان کا ہاتھ پکڑ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا اور عرض کیا کہ آپؐ نے مجھ کو سورۂ فرقان پڑھائی ہے۔ میں نے ان سے سنا وہ اس میں کچھ حروف پڑھا رہے ہیں۔ آنحضرتؐ نے ہشام سے فرمایا پڑھو، انھوں نے پڑھا تو فرمایا: ھکذا انزلت (اسی طرح نازل ہوئی ہے) پھر مجھ سے کہا پڑھو میں نے پڑھا تو فرمایا: ھکذا انزلت، ان القرآن انزل علی سبعۃ احرف فاقرأوا ماتیسر (احمد) (اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ دراصل قرآن سات طریقوں سے نازل ہوا ہے لہذا جس طرح سہولت ہو اسی طرح پڑھو)

۲۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کا مشاہدہ:

تحصیل حدیث کی تیسری صورت یہ تھی کہ صحابۂ کرامؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے افعال و اعمال کا مشاہدہ کرتے تھے پھر ان پر عمل کرنے اور اپنی زندگیوں میں جاری و ساری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے "أوتر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من أول اللیل و آخرہ ووسطہ فانتھی وترہ إلی السحر (احمد) رسول اکرمؐ نے ایک بار اول لیل میں وتر پڑھی ایک بار آخر لیل میں ایک بار وسط لیل میں یہاں تک کہ ایک بار سحر سے پہلے پہلے تک وتر کی نماز پڑھی)

حضرت سالم اپنے والد حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں: أنہ رأی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم و أبا بکر و عمر یمشون أمام الجنازۃ (احمد، ابوداؤد) انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر و حضرت عمرؓ کو جنازہ کے آگے آگے چلتے ہوئے دیکھا ہے) حضرت علیؓ بن ابی طالب سے روایت ہے کہ ایک بار ہم لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے ہی جا رہے تھے کہ آپؐ نے اشارہ سے ہم لوگوں کو کھڑے رہنے کا حکم دیا اور خود چلے گئے پھر جب واپس آئے تو آپؐ کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا۔ نماز پڑھانے کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ نماز پڑھاتے وقت مجھے یاد آگیا تھا کہ میں جنبی ہوں۔ اگر تم میں سے کسی کو ریاح محسوس ہو یا میری طرح کی حالت پیش آئے تو وہ چلا جائے اور حاجت پوری کرنے کے بعد آکر نماز پڑھے (احمد، ابوداؤد)

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریرات کا مشاہدہ:

تحصیل حدیث کا ایک طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریرات کا مشاہدہ تھا۔ تقریر کی تعریف محدثین یوں کرتے ہیں کہ کوئی صحابی آنحضرتؐ کی موجودگی میں کچھ کرے یا کہے اور آنحضرتؐ اس کو منع نہ کریں اور خاموش رہیں" ومعنی التقریر أنہ فعل أحد أو قال شیئاً فی حضرتہ صلے اللہ علیہ وسلم ولم ینکرہ ولم ینھہ

عن ذلك بل سكت وقرّر (مقدمہ مشکوٰۃ مولانا عبدالحق محدث دہلوی)

ایک بار آنحضرتؐ نے چند صحابہ کو ایک جگہ بھیجا اور فرمایا: لا يصلّين احدكم العصر الا في قريظة (تم لوگ عصر کی نماز بنی قریظہ میں پہنچ کر پڑھنا) رسول اکرمؐ کے اس فرمان سے بعض صحابہ نے نہی کو حقیقت پر محمول کیا چنانچہ انھوں نے عصر کی نماز مغرب کے بعد تک مؤخر کی اور بنی قریظہ ہی میں جا کر ادا کی اور بعض صحابہ یہ سمجھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ تھا کہ ہم لوگ عصر تک بنی قریظہ پہنچ جائیں چنانچہ انھوں نے عصر کے وقت ہی نماز پڑھ لی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان کے اس معاملے کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے "تقریر" فرمائی اور کسی کی تنکیر نہیں کی (صحیحین)

اسی طرح آپؐ کی خدمت میں ایک مرتبہ گوہ کا گوشت پیش کیا گیا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے تو کھالیا مگر آپ نے نہیں کھایا صحابہ نے پوچھا کہ کیا اس کا گوشت حرام ہے؟ آپؐ نے فرمایا: لا ولكنه ليس في ارض قومي فأجدني اعافه (نہیں بلکہ یہ میرے وطن میں نہیں پایا جاتا ہے اس کے لیے میری طبیعت کراہت کرتی ہے)

۵۔ دیگر صحابہ کرامؓ کا واسطہ:

صحابہ کرامؓ تحصیل سنت یوں بھی کرتے تھے کہ اگر کسی ضرورت سے کسی دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر نہ ہو سکتے تھے تو ان صحابہ سے حاصل کر لیتے تھے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں شریک ہوتے تھے اور آپ کے افعال و اقوال کا مشاہدہ کرتے تھے۔

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں:

ليس كل ما نحدثكم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، سمعناه (عنه) ولكن كان يحدث بعضنا بعضاً۔

ہم جو کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں وہ آپؐ سے سنا نہیں ہے بلکہ ہم میں سے بعض بعض کے واسطے سے حدیث

ولا یتھم بعضنا بعضا

(المحدث الفاصل)

بیان کرتا تھا اور کوئی کسی کو متہم نہ کرتا تھا۔

حضرت براء بن العازبؓ فرماتے ہیں:

لیس کلنا کان یسمع حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، کانت لنا ضیعۃ واشغال ولکن الناس لم یکونوا یکذبون یومئذ فیحدث الشاھد الغائب

(المحدث الفاصل بین الراوی الواعی)

ہم میں سے تمام لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث نہیں سنتے تھے۔ ہماری زمینیں تھیں اور بہت سے کام تھے لیکن لوگ اس زمانے میں جھوٹ نہیں بولتے تھے چنانچہ شاہد غائب کو حدیث سنا دیتا تھا۔

انھیں سے ایک دوسری روایت ہے۔ فرماتے ہیں:

ما کل الحدیث سمعناہ عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کان یحدثنا أصحابنا وکنا مشتغلین فی رعایۃ الإبل واصحاب الرسول کانوا یطلبون مایفوتھم سماعہ من رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فیسمعونہ من أقرانھم

(معرفۃ علوم الحدیث)

تمام احادیث ہم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی ہیں۔ ہم سے صحابہ حدیث بیان کرتے تھے اور ہم اونٹ چرانے میں مشغول رہتے تھے۔ ہم اصحاب رسول اگر کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سن پاتے تھے تو اپنے رفقاء سے حاصل کر لیتے تھے۔

۴۔ وفود:

تلقیٔ حدیث کا ایک ذریعہ وہ وفود تھے جو اپنے قبائل کے نمائندے بن کر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد جب کوئی بڑی سیاسی قوت اسلام کے

مزاحم نہ رہ گئی اور اسلام کا بول بالا ہوگیا تو وفود کا تانتا بندھ گیا حتیٰ کہ اسلامی تاریخ میں اس سال کو عام الوفود سے یاد کیا جاتا ہے۔ پورے عرب اور اس کے باہر سے بھی بہت سے وفود آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے اسلامی احکام وتعلیمات حاصل کرتے تھے اور اس کے بعد اپنی قوم میں جا کر لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دیتے۔ ان میں سے وفد بنی تمیم، وفد بنی سعد، وفد نجیب، وفد بنی عامر، وفد بنی زبید، وفد عبدالقیس، وفد اہل یمن، وفد مزینہ بہت مشہور ہیں۔ حضرت ضمام بن ثعلبہؓ کا واقعہ کتب حدیث میں بہت آتا ہے وہ وفد بنی سعد کے ساتھ آئے تھے۔

۷۔ ازواج مطہرات:

تحصیل حدیث کا ایک ذریعہ ازواج مطہرات کی ذات تھی ازواج مطہرات کی وجہ سے ہم کو وہ بہت سے داخلی اور گھریلو مسائل معلوم ہوئے کہ اگر وہ نہ ہوتیں تو ہرگز نہ معلوم ہوسکتے تھے۔ حیض ونفاس، غسل وجماع کے سلسلہ میں تقریباً جملہ معلومات ۔۔۔۔ صرف ازواج مطہرات ہی کے ذریعہ حاصل ہوئی ہیں۔

اگر صحابیات کسی مسئلہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرم محسوس کرتیں تو ازواج مطہرات ہی کو وسیلہ بنا لیتی تھیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابیہ کو بہت دم آتا تھا: انھوں نے حضرت ام سلمہؓ سے مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا لتنظر عدۃ اللیالی والایام التی کانت تحیضھن من الشھر الخ (یعنی مہینہ کے جن دنوں میں اسے پہلے حیض آتا تھا اس کا اعتبار کرے گی)

ایک صحابی نے حالت صوم میں اپنی بیوی کو بوسہ دیا پھر بعد میں بہت خوفزدہ ہوا چنانچہ اپنی بیوی کو اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجا وہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے پاس گئیں اور ان سے مسئلہ معلوم کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی حالت صوم میں بوسہ دیتے ہیں۔ صحابیہ نے واپس آ کر شوہر کو بتلایا مگر وہ اور بھی خوفزدہ ہوئے، کہنے لگے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کیسے ہو سکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے بہت کچھ جائز کر رکھا ہے چنانچہ انھیں دوبارہ بھیجا وہ پھر واپس گئیں اس وقت وہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی موجود تھے۔ آپؐ نے ام سلمہؓ سے ان کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے تفصیلات بتلائیں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آ گیا۔ آپؐ نے فرمایا:
واللہ إنی لأتقاکم للہ وأعلمکم بحدودہ (یعنی میں تم میں سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کے حدود سے واقفیت رکھنے والا ہوں پھر جب میں یہ سب کرتا ہوں تو تم لوگ کیوں نہیں کرتے)۔

اسی طرح اگر کوئی صحابیہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مسئلہ دریافت کرتیں اور اس کا جواب صراحتہً دینا آپؐ پسند نہ کرتے تو ازواج میں سے کسی کو حکم دیتے اور وہ ان کو سمجھا دیتیں۔ ایک صحابیہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ میں حیض سے کیسے پاک ہوں جبکہ دم استحاضہ آرہا ہو۔ آپؐ نے فرمایا: خذی فرصۃ ممسکۃ تتوضئی بہا (یعنی خوشبو میں بسایا ہوا ایک روئی کا ٹکڑا لے لو اور اس سے طہارت حاصل کرو) انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ اس سے کیسے طہارت حاصل کروں؟ آپؐ نے پھر وہی فرمایا مگر وہ نہ سمجھیں تو آپؐ نے حضرت عائشہؓ کو اشارہ کیا کہ انھیں سمجھا دیں۔ انھوں نے ان کو سمجھا دیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ روئی کا ایک صاف ٹکڑا لو اور اس سے دم کے اثر کو پونچھ دو (متفق علیہ)

۸۔ کتابت:

صحابہ کرامؓ کے تحصیل حدیث کا ایک اہم ذریعہ کتابت تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے شروع میں کتابت حدیث سے منع کر دیا تھا مگر بعد میں اجازت دیدی۔ اس سے ہم یہاں بحث نہیں کریں گے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں صحابۂ کرام نے حدیث کے بہت سے مجموعے تیار کر لئے تھے ۔ یہ موضوع بحث سے خارج ہے۔ یہاں ہم صرف اس موضوع پر بحث کرنا چاہتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام نے متعدد بار تحریری شکل میں احادیث حاصل کی ہیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طویل خطبہ دیا تھا اور اسلام کے جو اصولی احکام بیان فرمائے تھے۔ یمن کے ایک صحابی حضرت ابوشاہ کی خواہش پر آپؐ نے وہ خطبہ لکھ کر ان کے حوالے کرنے کا حکم دیا (بخاری کتاب العلم) صلح حدیبیہ کے بعد ۶ھ میں آپؐ نے جزیرۂ عرب کے رؤسا و ملوک اور روم وایران کے شہنشاہوں اور سلاطین کے نام خطوط ارسال کئے تھے (طبقات ابن سعد) ایک بار آپؐ نے چند صحابہ کو ایک سریہ میں بھیجا اور ان کو ایک خط بھی دیا اور فرمایا کہ اس کو فلاں جگہ پہنچ کر کھولنا، آپ نے زکوٰۃ کے احکام، مختلف چیزوں پر زکوٰۃ اور اس کی شرحیں لکھوا کر، مختلف امراء کو بھیجی تھیں اور وہ حضرت ابوبکرؓ اور کئی دیگر صحابہ کے پاس موجود تھیں (دارقطنی کتاب الزکوٰۃ) حضرت عمرو بن حزمؓ کو یمن کا گورنر مقرر کرتے وقت آپؐ نے صدقات، دیات اور فرائض وسنن کے متعلق ایک تحریر لکھوا کر حوالے کی (جامع بیان العلم) آپؐ نے اپنی وفات سے کچھ دن قبل قبیلۂ جہینہ کی طرف یہ لکھوا کر بھیجا تھا: لا تنتفعوا من المیتۃ باھاب ولا عصب (الاملاء) (مُردار کی کھال اور پٹھے سے انتفاع نہ کرو)۔ حضرت وائل بن حجرؓ جب بارگاہ نبوی سے رخصت ہو کر اپنے وطن حضرموت جانے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر ان کو ایک تحریر لکھوا کر دی جس میں نماز، روزہ، سود اور شراب کے متعلق احکامات تھے۔ آپؐ نے اہل یمن کو جو مسئلے لکھوا کر بھیجے تھے ان میں مس قرآن،

عتق رقبہ اور طلاق کے مسائل تھے (دارمی) حضرت معاذؓ نے یمن سے سبزیوں کی زکوٰۃ کے متعلق دریافت کیا تو آپؐ نے تحریری جواب دیا کہ سبزیوں پر زکوٰۃ نہیں (دارقطنی) فتح مکہ کے بعد عام الوفود میں وفد تجیب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف چیزوں کے متعلق سوالات کئے اور آپؐ نے اُن کے سارے سوالات کے جوابات لکھوا کر دیے (زاد المعاد)

ہم نے یہاں صرف چند احادیث بطور مثال ذکر کی ہیں ورنہ آپؐ نے وقتاً فوقتاً جو تحریری احکام، خطوط، صلحنامے و دعوت نامے لکھوائے ہیں ان کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے۔

تحصیل حدیث میں صحابہ کرامؓ کی جانفشانیاں :

صحابہ کرامؓ کے تحصیل حدیث کے یہ چند طریقے تھے ورنہ انھوں نے اور بھی متعدد طریقوں سے اور بڑی ہی جانفشانیوں اور جد وجہد سے احادیث حاصل کیں اور صرف یہی نہیں بلکہ انھیں اپنی زندگیوں پر منطبق کیا، اپنی زندگیوں کو احادیث کے سانچے میں ڈھالا اور اسی کے رنگ میں رنگ گئے۔ صحابہ کرامؓ احادیث کی زندہ اور چلتی پھرتی کتابیں تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھی سنا اور آپؐ کو جیسا کرتے دیکھا سب کو اپنی زندگیوں پر جاری و ساری کیا اور اپنے مابعد کے لوگوں کے لئے احادیث کا ایک ایسا عظیم ذخیرہ ہر طرح کی تحریفات سے محفوظ صورت میں پیش کیا جو انسانی زندگی کے ہر گوشے اور ہر زمان و مکان کے لئے پیش کیا جاسکتا ہے۔

امام ابوزرعہ رازیؒ

جناب اسیر ادروی۔ ادری (اعظم گڑھ)

بیان خطأ البخاری فی تاریخہ اسی سلسلہ کی یہ دوسری کتاب ہے کتاب میں ابوزرعہ نے التاریخ الکبیر میں جو غلطیاں اور اوہام تھے یا بعض تراجم میں نقص تھا یا اسماء وکُنیٰ کے تلفظ یا روایت میں یا ان کے مقام ومرتبہ میں جو افراط وتفریط آ گئی تھی ان خامیوں کو دور کیا گیا ہے خود ابوزرعہ کا اس سلسلہ میں بیان ہے، ابوعلی صالح بن محمد الحافظ کہتے ہیں

قال لی ابوزرعة یا ابا علی نظرت فی کتاب محمد بن اسماعیل هذا اسماء الرجال فاذا فیه خطأ کثیر فقلت له بلیته انه رجل کل من کان یقدم علیه من العراق من اهل بخاری نظر فی کتبهم فاذا رأی اسماء لا یعرفه ولیس عنده کتبه وهم لا یضبطون و تکون کتبهم غیر منقوطة فیضمه فی کتابه خطأ والا فما رأیت خراسانیا افهم منه لولا نسانه وفی ذلك الکتاب اسماء

ابوزرعہ نے مجھ سے کہا کہ میں نے امام بخاری کی کتاب دیکھی تو مجھے اس میں بہت سی غلطیاں نظر آئیں تو میں نے ان سے کہا کہ خود مجھے بھی اس کا تجربہ ہے کوئی بھی عراق وغیرہ سے آتا تو وہ ان کی کتابوں کو دیکھتے اور جب ان میں کوئی ایسا نام نظر آتا جس کے بارے میں ان کو علم نہ ہوتا تو اس کو لکھ لیتے جب کہ ان کی کتابوں میں نقطے نہیں دیے جاتے تھے اس لیے غلطیوں کا امکان اور بڑھ جاتا تھا یہ بات اپنی جگہ ضرور ہے کہ ان نہ میں فطین کوئی خراسانی نہیں ہے، لیکن اس کو

لا تعرف ولم يبين من روى عنهم وعمن
رووا وأى شئ رووا فيتعجب الانسان
فيه،

قال، سألني خالد بن احمد ابو الهيثم ان
انظر له شيئاً في هذا الكتاب فاصحح له
فنظرت فغيرت اشياء اخطأ فيه وصحف
ورأيت محمد بن اسماعيل ببغداد يقرأ
عليهم هذا الكتاب فقال، وابراهيم بن
شعيب روى عنه ابن وهب فقلت له،
انما هو ابراهيم بن شعيث ثم قلت له
انت تنظر في كتب الناس فاذا مر بك
اسم لا تعرفه اخذته والخطأ فيه من
غيرك لانهم كانوا لا يضبطون له

کیا گیا جائے کہ اس کتاب میں بہت سے غیر معروف
نام ہیں اور ان کا صحیح تعارف نہیں کیونکہ یہ نہیں
بتایا گیا کہ کس سے اس نے روایت کی یا کن
لوگوں نے اس سے روایت کی اور کیا روایت
کی ہے یہ صورت حال دیکھ قاری متحیر ہو جاتا
ہے کہ راوی کی تعیین کیسے کرے۔

ابو زرعہ نے کہا کہ خالد بن احمد ابو الہیثم نے مجھ
سے کہا کہ میں اس کتاب پر ایک نظر ڈالوں اور
جو غلطیاں ہیں اس کو درست کر دوں تو میں
نے اس کتاب کا مطالعہ کیا اور جہاں ا ں
جہاں ضرورت محسوس ہوئی ترمیم کر دی
اور غلطیوں کی تصحیح کر دی میں نے خود
بخاری کو بغداد میں دیکھا کہ وہ اپنی کتاب
سنا رہے تھے اور کہا ابراہیم بن شعیب
روی عنہ ابن وہب، تو میں نے ان
سے کہا کہ وہ ابراہیم بن شعیب نہیں
ابراہیم بن شعیث ہے۔
پھر میں نے ان سے کہا کہ آپ دوسروں
کی کتاب دیکھتے ہیں ان میں جو نام نیا ملتا
ہے تو اس کو آپ لے لیتے ہیں حالانکہ ان کی
کتاب میں وہ نام غلط لکھا ہوا ہوتا ہے اس

لہ: موضح اوہام الجمع والتفریق ج ۱ ص ۷

لیے آپ کی کتاب میں بھی ویسا ہی درج
ہوجاتا ہے اس لئے دوسروں کی غلطی آپ
کی کتاب میں داخل ہوجاتی ہے۔

اس تفصیل سے صحیح صورت حال ظاہر ہوجاتی ہے کہ ابوزرعہ کی یہ کتاب بہت سی ان غلطیوں سے پردہ اٹھا دیتی ہے جو دوسری کتابوں کے غلط اندراجات کی وجہ سے بخاری کی کتاب میں نقل ہوجانے کی وجہ سے پڑا ہوا ہے، اس لیے ابوزرعہ کی یہ کتاب اپنی افادیت کے لحاظ سے بہت اہم اور مفید ہے اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیئے صحیح راہنما اور دلیلِ راہ، کتاب کا مقصد امام بخاری رح پر اعتراض کرنا نہیں بلکہ دوسروں کی غلطیاں جو اس کتاب میں آگئی ہیں ان کا ازالہ مقصود ہے۔

دوسری تصنیفات کتاب نوائد الرازیین، کتاب الفوائد، کتاب الفضائل اور کتاب اعلام النبوۃ یا دلائل النبوۃ بھی ابوزرعہ کی تصانیف میں شامل ہیں، حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ابوزرعہ کی دلائل النبوۃ کا ذکر کیا ہے[1] اور اس حدیث کو بیان کیا ہے جو ابوزرعہ نے شبِ معراج میں حضورؐ کے مشاہدات کے سلسلہ میں نقل کیا ہے، دلائل النبوۃ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے متعلق صحیح روایتوں کو جمع کیا گیا ہے جیسے انشقاق قمر یا بعض صحابہ کے ہاتھ کی چھڑی تاریک رات میں روشنی دینے لگی تھی، یا جو پیشگوئیاں حضورؐ نے فرمائی ہیں اس سلسلہ میں ابوزرعہ کے نزدیک جو صحیح روایتیں تھیں ان کو پیش کیا ہے اور جو روایت ضعیف معلوم ہوئی اس کو ترک کر دیا۔ ابوزرعہ کی کتابوں میں کتاب السیر، کتاب المختصر، کتاب الزہد، کتاب الاطعمہ، کتاب الصوم، کتاب الادب، کتاب الوضوء کتاب الشفعہ، کتاب الافراد اور کتاب العلل کے نام ہیں، ان کا سراغ اجوبتہ ابی زرعۃ علی اسئلۃ البرذعی، کتاب علل الحدیث، الاصابہ، تقدمہ الجرح والتعدیل کے اندر ان کتابوں کے حوالے سے ملتا ہے ورنہ کسی کتب خانے میں ان میں سے کسی کا وجود نہیں ملتا اور سب ناپید ہیں۔

---

[1] البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۴ ص ۲۵۹-۲۶۰

خصوصیات و امتیازات و فضل و کمال

ہمارے اسلاف میں علماء و محدثین کی قوت حافظہ کے حیرتناک واقعات تاریخوں میں محفوظ ہیں، یہ افسانوی داستانیں نہیں بلکہ ان حضرات کو امتحان و آزمائش کے مرحلوں سے بھی گذرنا پڑا ہے اور جب یہ واقعہ ناقابل انکار شہادت بن کر ظاہر ہوا تو تاریخ نے ان ہیبتناک قوت حفظ کے مالک افراد کو اپنے اوراق میں ثبت کر کے خلعت دوام بخش دیا امام ابوزرعہ کا بھی شمار انہیں حضرات میں ہے، خود ان کا اپنا بیان ہے:

ان فی بیتی ما کتبتہ منذ خمسین سنۃ ولم اطالعہ منذ کتبتہ وانی اعلم فی ای کتاب ھو، فی ای ورقۃ ھو، فی ای صحفۃ ھو فی ای سطر ھو۔[1]

میرے گھر میں وہ تمام مخطوطے ہیں جو میں نے پچاس سال سے لکھے ہیں میں نے پھر ان کو دیکھا نہیں، لیکن میں بتا سکتا ہوں کہ فلاں حدیث فلاں کتاب فلاں ورق فلاں صفحہ اور فلاں سطر میں ہے۔

مشہور محدث ابوبکر ابن شیبہ کا قول ہے:

ما رأیت احدًا احفظ من ابی زرعۃ الرازی۔[2]

میں نے ابوزرعہ رازی سے زیادہ قوت حفظ کا مالک کسی کو نہیں دیکھا۔

دوسرے مشہور فقیہ و محدث اسحاق بن راہویہ کا بیان ہے:

کل حدیث لا یعرفہ ابوزرعۃ فلیس لہ اصل۔[3]

ابوزرعہ جس حدیث کو نہ جانیں تو سمجھ لو کہ اس کی کوئی اصل نہیں

---

[1] تاریخ بغداد (خطیب بغدادی) ج ۱۰ ص ۳۳۲ تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۳۳۔

[2] ایضاً ج ۱۰ ص ۳۳۱۔

[3] ایضاً ” ص ۳۳۲۔

امام احمد بن حنبل جو ابو زرعہ کے شیخ ہیں ان کا بیان ہے:

هذا الفتى اليمني (ابا زرعة) قد حفظ ستمائة الف [۱] ابو زرعہ کو چھ لاکھ حدیثیں یاد ہیں۔

ابو بکر محمد بن عمر الطرازی الحافظ فرماتے ہیں:

لم يكن في هذه الامة احفظ من ابي زرعة كان يحفظ سبعمائة الف حديث وكان يحفظ مائة واربعين الفا في التفسير والقراءات [۲]

اس امت میں ابو زرعہ سے زیادہ قوت حفظ کا کوئی مالک نہیں۔ سات لاکھ حدیثیں ان کو یاد ہیں، ایک لاکھ چالیس ہزار حدیثیں تو صرف تفسیر اور قراءتوں سے متعلق ہیں۔

ابو زرعہ کے علم و فضل کی شہادت کے لئے صرف ایک واقعہ کافی ہے، اس کے راوی نیساپور کے محدث حافظ حدیث حضرت مکی بن عبدان ہیں۔ ان کا بیان ہے:

سمعت مسلماً يقول عرضت كتابي هذا على ابي زرعة الرازي فكل ما اشار ان له علة تركته وكل ما قال انه صحيح وليس له علة خرجته [۳]

میں نے امام مسلم سے سنا، وہ کہتے تھے کہ میں نے صحیح مسلم کو ابو زرعہ رازی کے سامنے پیش کیا، جس حدیث میں انھوں نے علت بتائی میں نے اس کو قلم زد کر دیا اور جس کے بارے میں کہا کہ یہ صحیح ہے اور اس میں کوئی علۃ نہیں تو میں نے اس کو اپنی جگہ باقی رکھا۔

---

[۱] تاریخ بغداد جلد ۱۰ ص ۳۲۲۔

[۲] تہذیب الکمال ص ۳۴۲۔

[۳] تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۳۴۲۔

مشاہیر اہل علم اور جلیل القدر محدثین کی مجلسوں میں ابوزرعہ کا کیا مقام و مرتبہ تھا اس کی وضاحت کے لئے حضرت امام احمد بن حنبل کا واقعہ کافی ہے۔ امام صاحب کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن احمد بن حنبل کا بیان ہے کہ حضرت ابوزرعہ جب بغداد آتے تھے تو ہمارے یہاں قیام کرتے تھے اور جب تک وہ قیام کرتے والد صاحب (امام احمد بن حنبل) معمول کے مطابق جو نوافل پڑھا کرتے تھے ان کے آنے کی وجہ سے ترک کر دیتے تھے اور ان اوقات میں ان سے مذاکرۂ حدیث میں مصروف رہتے تھے یعنی ابوزرعہ سے مذاکرہ کو نفل نمازوں پر ترجیح دیتے تھے، ابوزرعہ کے شیخ اور استاذ ہوتے ہوئے بھی امام احمد کو جن حدیثوں کی صحت میں توقف تھا ابوزرعہ سے استصواب کے بعد ان کی صحت کو تسلیم کیا اور ان کا تردد دور ہوا[1]

امام بخاری سے بالمشافہ گفتگو کر کے ان کی کتاب "التاریخ الکبیر" میں جو غلطیاں دخل پاگئی تھیں۔ ان کی نشان دہی کی اور امام بخاری نے اس کو تسلیم کر کے ابوزرعہ کے کمال علم و فضل کا اعتراف کیا[2]

ابوزرعہ کا مسلک فقہی مسلک کے لحاظ سے شہر رے میں امام اعظم ابوحنیفہ کا مسلک رائج تھا، امام ابوزرعہ الرازی بھی اپنے شہر کے اہل علم کے طریقے کے مطابق حنفی المسلک تھے، ابوزرعہ کا بیان ہے:

کان اهل الرّی قد افتتنوا بابی حنیفة وکنا احداثا[3]	تمام اہل رے حنفی المسلک تھے یہ ہماری نوجوانی کا زمانہ تھا۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ [2] موضح اوہام الجمع والتفریق ج ۱ ص ۷ [3] تہذیب الکمال للمزی ورقہ ۲۴۴۔

انھوں نے امام ابوحنیفہ کی کتابوں کو بڑے اہتمام سے یاد بھی کرلیا تھا اور یہ کتابیں ان کے نوک زبان تھیں[۱] پھر مصر میں انھوں نے امام شافعی کی کتابوں کی نقل حاصل کی، طلب حدیث کے سلسلے میں امام احمد بن حنبل سے مسلسل ملاقات و استفادہ کا سلسلہ جاری رہا، اس طرح تین فقہی مسلک ان کی نگاہوں کے سامنے پوری تفصیل سے آچکے تھے، لیکن ان کی کتابوں سے کسی خاص مسلک کی ترجیح واضح طور پر نہیں ملتی جن لوگوں نے ان کو حنبلی الرائے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ صرف قیاسات پر مبنی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ابوزرعہ اور ان کے معاصرین امام بخاری امام مسلم وغیرہ فقیہ الحدیث تھے، علم حدیث سے کثرتِ شغف کی بنا پر وہ سنت نبوی کے مزاج داں ہو چکے تھے۔ ان کے سامنے روایات و احادیث کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ ان کا اخاذ ذہن و دماغ خود مسائل کا استنباط کرلیتا تھا اور ان کو درجۂ اجتہاد حاصل تھا، ایسے تمام محدثین کسی خاص فقہی مسلک کے پابند نہیں تھے بلکہ بحیثیت مجتہد انھوں نے جس مسئلہ کو ترجیح دی وہی ان کا مسلک تھا ان کو ائمہ اربعہ میں سے کسی خاص فقہی مسلک کے گروہ میں شامل کرنا صحیح نہیں ہے۔

ان کے زہد و تقویٰ کے بارے میں ان کے دوست اور شریک درس اور ہم وطن مشہور محدث امام ابوحاتم رازی بیان فرماتے ہیں:

ازھد من رأیت اربعۃ آدم بن ابی ایاس وثابت بن محمد الزاھد وابوزرعۃ واحمد بن حنبل[۲]	میں نے چار افراد کو سب سے زیادہ زاہد پایا، آدم بن ابی ایاس، ثابت بن محمد زاہد اور ابوزرعہ اور امام احمد بن حنبل۔

---

[۱] اجوبۃ ابی زرعۃ علی اسئلۃ البرذعی ص ۳۶۔

[۲] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۷۵۔

وفات حضرت ابوزرعہ کی پوری زندگی تحصیل علم حدیث اور اس کی خدمت میں صرف ہوئی۔ کئی لاکھ حدیثیں اپنے ہاتھ سے نقل کیں، راویوں کے حالات کی جستجو کر کے ان کے بارے میں صحیح رائے قائم کی، اور اپنے علم وفضل کی یادگار دو درجن تصانیف چھوڑیں اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کے سلسلہ میں اپنی رایوں کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا جو تحقیق وتنقید کی راہ پر چلنے والوں کے لئے منارۂ نور ہیں۔ قابل رشک اور پاکیزہ زندگی کے شب وروز گذر رہے تھے کہ وقت موعود آگیا زبان پر ذکر الٰہی جاری تھا۔ ابو حاتم رازی کا بیان ہے کہ آخری وقت ان کی زبان پر تھا اللھم انی اشتاق الی رویتک فان قال لی بای عمل اشتقت الیّ ؟ قلت برحمتک یارب[1]، علم حدیث کے ذوق، شوق اور سنت نبویہ سے والہانہ شیفتگی ووارفتگی کا یہ نتیجہ تھا کہ نزع کے عالم میں بھی انھوں نے ایک حدیث ہی بیان کی، واقعہ یہ ہوا کہ آخری وقت میں علماء ومحدثین موجود تھے لیکن لقنوا موتاکم لا الٰہ الا اللہ کے بموجب فرط ادب کی وجہ سے تلقین نہیں کر رہے تھے تو محدثین نے آپس میں کہا کہ آؤ ہم لوگ حدیث کا مذاکرہ کریں لیکن اس میں بھی وہ ناکام رہے کیونکہ کوئی محدث سند سے آگے کچھ نہیں کہہ پاتا تھا، تب ابوزرعہ نے فرمایا حدثنا بندار حدثنا ابوعاصم حدثنا عبد الحمید بن جعفر عن صالح بن ابی ایوب عن کثیر بن مرۃ الحضرمی عن معاذ بن جبل قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان اخر کلامہ لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ،

حدیث تمام ہوئی اور ان کی روح عالم قدس کو پرواز کر گئی، انا للہ وانا الیہ راجعون، یہ دوشنبہ کا دن تھا اور ذی الحجہ ۲۶۴ھ کی کوئی تاریخ، رحمہ اللہ۔

(ختم)

---

[1] تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۳۴۶۔

عربی ادب میں ہندوستانی فضا

مولوی سید محمد ضیاء الدین شمسی طہرانی لکچرار شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ عربی زبان میں ادب کا تصور اس قدر وسیع ہے کہ اس کا تعین مشکل ہے۔ تاریخ ادب عربی کے مصنف استاذ احمد حسن زیات کے نزدیک بھی ادب کا اطلاق شعر وسخن کے علاوہ ان تمام تصانیف پر ہوتا ہے جو کسی علمی یا ادبی شعبے میں تحقیق کا نتیجہ ہوں۔ عربی زبان کا ادب دنیا کی تمام دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ مالا مال ہے کیونکہ اسلام پھیلنے کے بعد عربی زبان صرف ایک ہی قوم کی زبان نہ رہی بلکہ ان تمام اقوام عالم کی زبان بھی بن گئی جو وقتاً فوقتاً اسلام کی دعوت قبول کرتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِس زبان نے یونانیوں، ایرانیوں، یہودیوں، ہندیوں اور حبشیوں کے قدیم علوم وفنون اور ادبی روایات کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ عربوں کے ادب پر ہندوستان کا کس قدر اثر ہوا تھا اس کا ابھی تک کوئی معقول جائزہ نہیں لیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور مستشرق ڈاکٹر نکلسن نے اپنی سہل انگاری کی بنا پر یہ رائے قائم کر لی کہ عربوں کے ادب پر علم ادب، علم نجوم اور علم طب میں یونانیوں کے علوم کی بہ نسبت ہندی علوم کا بہت کم اثر ہوا (تاریخ ادب عربی از ڈاکٹر نکلسن) اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو ہندوستانی علوم کا اثر عربوں کے ادب پر یونانی علوم سے

کسی طرح کم نہیں۔ عربی ادب میں ہندوستانی فضا کی نشاندہی کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ سردست اس موضوع کے مختلف اور بے حساب گوشوں میں سے صرف ایک گوشے پر مختصر طور پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

عرب و ہند کے تعلقات کا سلسلہ ماقبل تاریخ کے عہد سے ملتا ہے۔ مصر اور عرب میں پائی جانے والی بہت سی اشیاء اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ان ممالک میں تجارت کا سلسلہ تین ہزار سال قبل مسیح سے قائم تھا۔ ہندوستانی جہاز جو معمولی بادبانوں اور بے شمار ملاحوں کے ذریعہ چلتے تھے ہندوستانی مال مثلاً گرم مسالے، موٹی روئی، ریشم، ململ اور جواہرات وعنبر لے کر عرب اور عراق جاتے تھے۔ وادیٔ سندھ یعنی موہنجو دارو کے لوگ عربوں سے قریبی تعلقات رکھتے تھے۔

عرب تاجروں کا بھی ہندوستان میں آنا جانا تاریخی حقیقت ہے۔ تاریخی طور پر ثابت ...... ہے کہ ایک عرب ملاح ہی نے واسکوڈی گاما کو ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے میں مدد دی تھی اور احمد بن ماجد بھی عرب ملاح ہی تھا جس نے ۱۴۹۸ء میں مالندی (مشرقی افریقہ) سے کالی کٹ تک پہنچنے میں واسکوڈی گاما کی رہنمائی کی تھی۔

یہ تجارتی تعلقات ہی کا نتیجہ تھا کہ عرب میں قدیم زمانے سے ہندوستان کی بہت سی چیزیں کثرت سے استعمال ہوتی تھیں اور عربوں کی زندگی میں ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اس کا اندازہ عرب شعراء کے کلام سے بھی ہوتا ہے جنھوں نے اشعار میں ہندوستان کی بہت سی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ اس ذکر سے عربی ادب میں ہندوستانی فضا کا تصور ابھرنے لگتا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

ہندی تلوار

قدیم زمانے سے ہندوستان کی تلواریں عربوں کی بہادری میں چار چاند لگاتی

ہیں۔ عربی میں ہندی تلوار کے کئی نام ہیں: سیف، ہند، ہندی، مہنّد، ہندوانی، سندوانی اور قلعی۔ شریف ادریسی نے نزہتہ المشتاق میں لکھا ہے کہ "جنوبی ہندوستان کے بلاد سفال اور بلادِ زنج میں لوہے کی کانیں ہیں مگر یہاں کے باشندے کچا لوہا فروخت کرتے ہیں اور ہندوستان کے لوگ اس کی تلواریں بناتے ہیں۔"

(نزہتہ المشتاق ص ۲ مطبوعہ علی گڑھ) عربی شاعری میں ہندی تلوار کا ذکر اس کثرت سے آیا ہے جس کثرت سے خود ہندی تلوار استعمال ہوتی تھی۔ زُہیر بن ابی سُلمی نے کہا ہے ؎

کالهندوانی لا یخزیك مشهدُهٗ
وَسطَ السیوف اذا ماتضرب البُهَمُ

یعنی دوسری تلواروں کے درمیان میں ہندی تلوار تم کو میدان جنگ میں ناکام نہیں کرسکتی ہے جبکہ اسلحہ بند لشکر میں جنگ ہو۔

ہندی نیزے

ہندی تلواروں کی طرح عرب میں ہندی نیزے بھی بہت مشہور تھے جو عام طور سے عمّان سے لےکر بحرین تک کے علاقے میں تیار کیئے جاتے تھے جسے خط کہتے تھے۔ اس کے لئے سندھ، گجرات اور بھروچ سے بانس اور بید آتے تھے پھر ان کو یہاں نیزے کی شکل دی جاتی تھی۔ خطّی اور سمہری نیزے ہندوستانی لکڑی کے ہی بنتے تھے، ابنِ منظور دمشقی نے لسان العرب میں لکھا ہے:

وقد کثرمجیئها فی اشعارها

یعنی اشعار عرب میں اس کا ذکر بہت کثرت سے آیا ہے۔ ابوزبید طائی نے کہا ہے ؎

مُسنَفاتٌ کانّهن قَنَاالهند
لطول الوجیف جدب المرودُ

یعنی چارہ ڈھونڈھنے والے کے دیر کرنے کی وجہ سے اونٹنیاں اس طرح جکڑی ہوئی تھیں جیسے ہندوستان کے بانس باندھے ہوئے ہیں۔

مُشک

یہ ہندوستان کی مشہور خوشبو ہے جو یہاں سے عرب جاتی تھی۔ امرا القیس کہتا ہے ؎

إذا قامتا تضوّعَ المسكُ منهما
نسيم الصَّبا جاءت بريّا القرنفل

یعنی جب وہ دونوں کھڑی ہوتی ہیں تو ان سے مشک کی خوشبو اس طرح پھیلتی ہے جیسے نسیم صبح لونگ کی خوشبو لے کر آتی ہے۔

یہاں قرنفل بھی کرن پھول کا معرب ہے اس کا ذکر بھی عربی ادبیات میں کثرت سے آیا ہے۔

عود

عود (اگر) ہندوستان کی مشہور لکڑی اور عربوں کی مرغوب ترین خوشبو ہے۔ اس کو عودِ ہندی، عودِ صنفی، عودِ قماری، عودِ مندلی اور عودِ کلبی کے مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ نابغہ شیبانی کہتا ہے ؎

قد عَبِقَ العبيرُ بها و مِسكٌ
يُخالِطهُ مِنَ الهندي عودُ

یعنی اس کے جسم پر زعفرانی خوشبو اور عود ہندی میں مخلوط مشک لپٹا ہوا ہے۔

کافور

یہ ہندی لفظ کپور کا معرب ہے۔ اس کا استعمال عربی زبان میں کئی طرح سے ہوا ہے۔ یوں تو کافور عرب کے ہر بڑے بازار میں فروخت ہوتا تھا لیکن

دارین جس طرح مُشک کی بہت بڑی منڈی تھی اسی طرح کافور کا بازار بھی تھا۔
نابغہ شیبانی کہتا ہے ؎

کَاَنَّ رُضَابَ المِسْكِ فوق لثاتها
وکافور دارِیٍّ وراحًا تصفّقُ

یعنی محبوبہ کے مسوڑھوں کے اوپر دارین کا کافور اور شراب دونوں مچل رہی ہیں۔

زنجبیل

یہ ہندی لفظ جنجابیر کا معرّب ہے جس کے معنی سونٹھ کے ہیں۔ عرب کے لوگ اسے خشک اور تر دونوں طرح استعمال کرتے تھے اور یہ اُن میں بہت ہی مشہور تھی۔ لسان العرب میں لکھا ہے کہ عرب سونٹھ کی خوشبو کی تعریف کرتے ہیں اور وہ ان کو بہت ہی مرغوب ہے (والعرب تصف الزنجبیل بالطیب وھو مستطاب عندھم جدًا)۔ اعشیٰ نے کہا ہے ؎

كأنَّ القرنفل والزنجبيل
باتا بفیھا داریًا مشودًا

یعنی محبوبہ کے لعابِ دہن کی لطافت ونکہت کا حال یہ ہے کہ جیسے اس کے مُنہ کے اندر شہد کے ساتھ لونگ اور سونٹھ نے مُشک داری میں رات گذاری ہے۔

ایک اور شاعر نے بھی کہا ہے:

وزنجبیلُ عاتقٌ مُطیبٌ

یعنی سونٹھ ملی ہوئی پُرانی خوشگوار شراب.

عجب اتفاق ہے کہ قرآن مجید میں بھی جنّت کی تعریف میں اس

جنت نشان ملک کی تین خوشبوؤں کا ذکر ضرور ہے یعنی مسک، زنجبیل اور کافور۔

(باقی آئندہ)

ملّا صدرا کا رسالہ "وحدۃ الوجود"

(ایک تعارف)

جناب غلام یحییٰ انجم صاحب، شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

صاحب اعیان الشیعہ کے قول کے مطابق جن چار عبقری شخصیتوں کو علوم و فنون کا ہمالہ بطور خاص فلسفہ وکلام کا ستون سمجھا جاتا ہے ان میں معلم ثانی ابو نصر فارابی (متوفی ۳۳۰ھ تقریباً) شیخ رئیس ابن سینا (۳۷۲-۴۲۷ھ) خواجہ نصیر الدین طوسی (۵۹۷-۶۷۳ھ) کے بعد چوتھے مُلّا صدرا محمد بن ابراہیم صدر الدین شیرازی ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اگر غلو کا خوف نہ ہوتا تو یقیناً کہہ دیا جاتا کہ علمی اعتبار سے ملّا صدرا کی حیثیت مذکورۃ الصدر حضرات سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے خاص کر مکاشفہ اور عرفان و وجدان کے معاملہ میں ان کا کوئی ہمسر نہیں[1] چنانچہ ان کی عبقریت کے اعتراف میں قوم نے انھیں "صدر المتالہین" اور "صدر المحققین" کا خطاب دیا ہے۔

---

[1] محسن امین اعیان الشیعہ ۴۵/۱۰۰-

اس جلیل القدر شخصیت کی سن ولادت تقریباً ۹۸۰ھ ہے کیونکہ انھوں نے ۱۰۵۰ھ میں ساتویں بار حج سے واپسی میں ستر سال کی عمر پاکر وفات پائی۔

علمی نشوونما کے متعلق اتنا ملتا ہے کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے پدر بزرگوار ابراہیم بن یحییٰ الشیرازی القوامی سے حاصل کی جس کی تکمیل اصفہان جاکر ان دو نابغۂ روزگار شخصیتوں سے کی، جن کا سکہ معقولات کی دنیا میں اب بھی رائج ہے۔ یعنی شیخ بہاء الدین محمد العاملی (۹۵۳ - ۱۰۳۱ھ) اور میر باقر داماد (متوفی ۱۰۴۰ھ) ہیں جو نظریۂ حدوث دہر کے بانی ہیں اور جن کی شان میں اختلاف کرنے کے باوجود ملا محمود (متوفی ۱۰۶۲ھ) جیسے فلسفیٔ اعظم ہندوستان شمس بازغہ میں فرماتے ہیں:

"خیرۃ اللہ الیقین بالمھرۃ الیقین مع توغلہ فی سیاحۃ ارض الحقیقۃ وتورطہ سباحۃ یم الحکمۃ وجوعتہ فی اعماق شری الملک باقدام انظارہ الغائرۃ وعروجہ عن اطباق سماء الملکوت بقوادم افکارہ السافرۃ"[1]

انھی مؤخر الذکر استاد کی صحبت میں ملا صدرا نے عمر کا بیشتر حصہ گذارا اور انھیں کی روش پر چل کر اہل علم وفضل میں اس طرح شہرتِ دوام حاصل کی کہ آپ کے بارے میں کہا جانے لگا:

انہ اجلّ فلاسفۃ العصر الاموی شاناً واعظمھم خطراً حتی لقد بلغ من دقۃ البحث وعمق

---

[1] ملا محمود۔ شمس بازغہ ص ۲۵۳۔

تفکیر و طرافۃ التحقیق مبلغاً فی منزلۃ تالی
بعد منزلۃ کل من ارسطو و ابن سینا"[1]

جس ذروہ فضل و کمال پر موصوف فائز تھے متاخرین میں سے کسی کی ان تک رسائی ممکن نہ ہوسکی اور متقدمین میں سے کم ہی اس مرتبہ سے بہرہ ور ہوئے ہیں۔ صاحب روضات لکھتے ہیں:

کان فائقاً علی سائر من تقدم من الحکماء
الباذخین والعلماء الراسخین الی زمن مولانا
الخواجہ نصیر الدین منقحا اساس الاشراق
بما لا مزید علیہ ومفتحا ابواب الفضیحۃ
علی طریقۃ المشاء الرواق"[2]

اسی قول کی روشنی میں فلاسفہ متقدمین و متاخرین دونوں کے درمیان ان کی شخصیت روز روشن کی طرح نمایاں نظر آتی ہے۔

اس عبقریٔ روزگار نے اپنے وقت عزیز کا بیشتر حصہ درس و افادہ کے علاوہ کتب و رسائل کی تصنیف میں بھی صرف کیا جن کی تعداد بعض سوانح نگاروں کے قول کے مطابق ۳۳ بتائی جاتی ہے، ان میں شرح ہدایت الحکمۃ "صدرا" کے نام سے مدارس عربیہ کے منتہی طلبہ کے نصاب میں مشمول ہے۔ دوسری کتاب "اسفار اربعہ" ہے جو شیخ کی "شفاء" محقق طوسی کی "تجرید" امام رازی کی "محصّل" میر باقر داماد کے "افق المبین" کے دوش بدوش فلسفہ کی منتخب ادبیات عالیہ میں

---

[1] دائرۃ المعارف الاسلامیہ (۳۶/۱۴) مطبوعہ تہران۔
[2] خوانساری۔ روضات الجنات ص ۳۳۱۔

شمار ہوتی ہے چنانچہ اس کتاب کی عظمت کے بارے میں محقق شیخ محمد حسین الاصفہانی (متوفی ۱۳۶۱ھ) فرماتے ہیں:

"لو اعلم احداً یفہم اسرار کتاب الاسفار لشددت الیہ الرحال للتلمذ علیہ وان کان فی اقصی الدیار" [۱]

تیسری اہم تصنیف شیخ الاشراق شہاب الدین مقتول (۵۵۰ - ۵۸۶ھ) کی "حکمۃ الاشراق" جو علامہ قطب الدین شیرازی (۶۳۴ - ۷۱۰ھ) نے شرح لکھی تھی اس کا حاشیہ ہے جو حکمت اشراق کے موضوع پر حرف آخر سمجھا جاتا ہے۔

مذہب وتصوف جس کا خاص اور اہم موضوع "وحدت الوجود" ہے ملا صدرا نے اسی کی تعلیم دی ہے اور اسی موضوع کے تحت متعدد رسالے لکھے ہیں۔ انہی میں سے ایک رسالہ "وحدت الوجود" جو خوش قسمتی سے مولانا آزاد لائبریری کے یونیورسٹی کلکشن میں فارسیہ ومذہب وتصوف ۲۴۹ نمبر کے تحت محمد محسن عباسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا محفوظ ہے جس پر سن کتابت ۱۲۱۸ھ مندرج ہے۔ رسالہ زیادہ طویل وضخیم نہیں ہے مگر اس ایجاز و اختصار میں مَا قَلَّ دَلَّ کی شان پیدا ہے۔ ذیل میں مطالب مبحوثہ کا خلاصہ دیا جارہا ہے جس سے اس کی اہمیت ہویدا ہوگی۔ رسالہ کی ابتدا اس حقیقت حقہ سے ہوتی ہے جو کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور تمام علمی وحکمی سرگرمیوں کی غایت الغایات ہے یعنی صانع عالم کے وجود پر یقین جسے زبان شرع میں ایمان باللہ کہتے ہیں۔ مصنف رسالہ فرماتے ہیں:

---

[۱] محسن امین اعیان الشیعہ ص (۵/۴۰۰)

"بداں وفقک اللہ تعالیٰ کہ جمیع عقلاً اتفاق دارند برایں کہ عالم
موجود را صانعی ثابت و متحقق است۔"

پھر نظریۂ وحدت الوجود کے اثبات میں مصنف نے عقلی و برہانی دلائل بھی دیے ہیں اور اس عقیدہ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے قرآنی شواہد سے بھی استشہاد کیا ہے لیکن اس باب میں زیادہ اہم اول الذکر ہے یعنی نظریۂ وحدۃ الوجود کا عقلی و برہانی دلائل سے اثبات۔ مصنف نے توطیہ مقصد کے لئے اس سے پہلے ایک خاص طویل تمہید دی ہے جس کے دو جز ہیں۔ پہلا جز تین افادات پر مشتمل ہے۔

(۱) افادۂ اول کا کہنا ہے کہ ایمان باللہ ایک کائناتی حقیقت ہے جس پر جملہ عقلائے روزگار کا اتفاق ہے اور یہ عقیدہ ان کے قلوب میں اس درجہ راسخ ہے کہ بداہت کی حد تک پہونچ گیا ہے یعنی انتہائی بدیہی (A. PRIORI) ہے جیسی یہ ~~حقیقت~~ کہ کل اپنے جز سے بڑا ہوتا ہے۔

(۲) افادۂ دوم کا کہنا ہے کہ اس عقیدہ کی ہمہ گیری کے باوجود باری تعالیٰ کی کنہ و حقیقت ہنوز پردۂ خفا میں ہے اور

راز ایں پردہ نہاں است و نہاں خواہد بود

(۳) افادۂ سوم ایک تاریخی توجیہ ہے جو مفکرین عہد اسلام کی جماعت بندی سے متعلق ہے اس کی رو سے حصول معرفت باری کے دو طریقے ہیں: استدلال یا کشف و شہود ـــــ پھر طالب معرفت یا کسی نبی کا پیرو ہوگا یا انبیاء و مرسلین کی اتباع سے بے نیاز ہوگا اس کے نتیجے میں مفکرین کی چار جماعتیں ظہور میں آئیں۔

۱- پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو جو استدلال سے کام لیتے تھے

متکلمین کہلائے۔

۲۔ لیکن اتباع رسول کے باوجود جو حضرات ریاضت ومجاہدہ اور کشف وشہود پر اعتماد کرتے تھے صوفیائے کرام کہلائے۔

۳۔ اتباع رسول سے بے نیاز ہوکر جن لوگوں نے نظر واستدلال سے کام لیا وہ حکمار مشائین کہلائے۔

۴۔ اور اگر موخرالذکر نے مجاہدہ پر بھروسہ کیا وہ حکمار اشراقین کہلائے۔

ظاہر ہے یہ وہی تقسیم ہے جو حاجی خلیفہ (۱۰۶۷ھ) نے کشف الظنون میں "حکمۃ الاشراق" کے تحت دی ہے اس لئے یا تو مصنف کی خوشہ چینی کی ہے یا حاجی خلیفہ نے مصنف سے استفادہ کیا پھر دونوں کسی تیسرے مشترک ماخذ کے رہین منت ہیں۔

دوسرے جزء کے افادات میں مرکزی حیثیت "وجود مطلق" کے تصور کی ہے کیونکہ نظریہ وحدت الوجود کا سنگ بنیاد یہی تصور ہے۔ وجود مطلق کے تصور کا سرمایہ کیا ہے اور کس طرح اس نے ارتقار کی منازل طے کیے اور پھر کس طرح یہ اسلامی فکر میں داخل ہوا بالخصوص اندلس کی فکری سرگرمیوں میں جن کے گرامی منزلت نمائندے شیخ اکبر تھے جو اسلامی فکر میں اس عقیدے کے بادی یا علی الاقل ممثل اعظم سمجھے جاتے ہیں۔ ان امور کی تفصیل ایک تفصیلی جائزے کی مقتضی ہے مگر چونکہ اس عاجز کی عرضداشت کا مقصد صرف اس رسالہ کا تعارف کرانا ہے اس لئے دوسری تفصیلات سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

بہر حال مصنف نے اس پوری بحث کا آغاز "وجود" کے مختلف مفاہیم ومصادیق کے ذکر سے کیا ہے انھوں نے وجود کے صرف دو مصداق بتائے ہیں:

۱۔ معنی مصدری جس کا مفہوم "بودن" یا "شدن" ہے یعنی ہونا۔

۲۔ دوسرا مفہوم وہ امر ہے جس کی بنا پر کوئی موجود موجود ہوتا ہے۔

اس معنی میں وجود واجب کا بھی ہوتا ہے اور ممکن کا بھی۔ لیکن واجب تعالیٰ میں یہ وجود عین ذات باری ہوتا ہے مگر ممکن میں اس کے بارے میں اختلاف ہے اس طرح حسب تصریح شرح مواقف (الموقف الثانی المرصد الاول بمقصد ثالث) اس باب میں تین مذاہب ہیں امام ابوالحسن الاشعری (۲۷۰ — ۳۳۴ھ) اور معتزلہ میں سے ابوالحسین البصری (متوفی ۴۳۶ھ) کا کہنا ہے کہ وجود واجب اور ممکن دونوں میں ماہیت (یا ذات) کا عین ہوتا ہے مگر حکماء کہتے ہیں کہ واجب میں تو عین ماہیت ہوتا ہے مگر ممکن میں غیر ماہیت۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ واجب اور ممکن دونوں میں وجود و ماہیت ایک دوسرے کے غیر ہوتے ہیں اور وجود ماہیت پر زائد ہوتا ہے مگر مصنفِ رسالہ نے ان مذاہبِ ثلاثہ میں سے صرف دو مذہبوں کو بیان کیا ہے۔

زاں بعد انھوں نے "اسم اللہ" کے مسمّیٰ کو متعین کیا ہے کہ اللہ عَلَم ہے ذات واجب الوجود کے لئے جو جمیع صفاتِ عالیہ سے متصف اور تمام سمات نقص وحدوث سے منزّہ ہے۔

اس کے بعد اس ذات پاک کے باب میں جو اللہ کا مسمّیٰ ہے تین مذاہب بیان کیۓ ہیں، متکلمین کا، حکماء کا، اور صوفیاء کرام کا۔ متکلمین کہتے ہیں کہ وہ ذات نمبر ۱ حقیقی جزئی ہے۔ نمبر ۲ خارج اور ذہن دونوں میں بسیط ہے اور نمبر ۳ اس کی صفات اس پر زائد ہیں (یہاں مصنف رسالہ وحدۃ الوجود نے جمہور علمائے علم کلام سے اختلاف کیا ہے کیونکہ جب کہ معتزلہ وغیرہ صفات کو غیر ذات مانتے ہیں اشاعرہ "لاعین" و "لاغیر" کہتے ہیں)

حکمار کا بھی یہی مسلک ہے مگر وہ صفات کو عین ذات گردانتے ہیں لیکن صوفیار کرام کا مسلک جو تفصیل چاہتا ہے مصنف نے اس باب میں ان کے تین فریق گردانتے ہیں اور اس تفریق کا منشار واجب کے ساتھ ممکن کا اعتبار ہے چنانچہ:

ایک فریق متکلمین وحکمار کی طرح واجب تعالیٰ کو بھی جزئی حقیقی سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ جمہور اہل شریعت کی طرح ممکن کو بھی حقیقی سمجھتا ہے نیز انھیں کی طرح واجب اور ممکن کو ایک دوسرے کا مغائر ومبائن۔ دوسرا فریق بھی واجب تعالیٰ کو جزئی حقیقی سمجھتا ہے مگر ممکن کو موجود نفس الامری نہیں سمجھتا بلکہ سراب کی طرح واہمہ محض گردانتا ہے یا بالفاظ دیگر:

ذات واجب نے صور متعددہ اور اشکال مختلفہ میں خود کو ظاہر کیا ہے پس خارج ہو یا ذہن دونوں میں صرف وہی ذات موجود ہے۔ سب دوسرے موجودات جنھیں عرف عام میں ممکنات کہا جاتا ہے سو وہ معدوم محض ہیں اور ان کی موجودیت محض وہمی وخیالی ہے۔

لیکن اس تقدیر پر شریعت ہو یا قانون ملکی (PUBLIC LWA) دونوں کے اوامر ونواہی باطل قرار پاتے ہیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی موجود ہی نہیں تو پھر وہ کسے حکم دے رہا ہے کہ نماز پڑھ یا نیک کام کر اور کسے منع کر رہا ہے کہ برے کام نہ کر اور کسی کو قتل نہ کر۔

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اس لئے ایک تیسرا فریق کھڑا ہوا اور اس نے کلی وجزئی اور عینیت وغیریت کے امتیازہی کو ختم کر دیا ان کے نزدیک واجب تعالیٰ شانہ جزئی حقیقی نہیں ہے

بلکہ وجود مطلق ہے لابشرط شیئ یعنی اس میں کوئی قید وتقیید نہیں ہے، رہے وہ موجودات جنھیں عرف عام میں ممکنات سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ دوسرے فریق صوفیار کی طرح وہمی وخیالی نہیں ہیں بلکہ وہ بھی واقع میں موجود ہیں مگر اسی واجب تعالیٰ کے اسی وجود (وجود مطلق) کے ساتھ۔

اسی طرح تمام موجودات (با عرف عام کے ممکنات) عین باری تعالیٰ ہیں اور اسی کے وجود کے ساتھ موجود ہیں اور وجود مطلق لابشرط شیئ ہے۔

اس نئے مذہب کے اختراع کے ساتھ انھوں نے اس معاشرتی اشکال کو مندفع کردیا جو دوسرے فریق کے یہاں ممکنات کو اوہام وخیالات سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے نیکی وبدی کا امتیاز ہی مٹ رہا تھا اور اباحت مطلقہ کی ترویج واشاعت کا راستہ صاف ہو رہا تھا۔

اس لئے انھوں نے اس وجود مطلق لابشرط شیئ کے ظہور کے لئے دو مرتبے اختراع کیے۔

۱۔ مرتبہ اطلاق جس میں وہ جملہ قیود وشرائط سے خالی اور متعالی ہے، اس مرتبہ میں وہ وجود مطلق معبود ہے، اور

۲۔ مرتبہ تقیید جس میں وہ تعینات وتشخصات سے متصف ہوتا ہے یہاں وہ عابد وبندہ ہے اور معبود حقیقی کے جملہ اوامر ونواہی کے بجالانے کے لئے مکلف ہے اس طرح انبیاء ورسل کی بعثت وارسال اور کتب مقدسہ الٰہیہ کے نزول وانزال کی ضرورت وافادیت بھی اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔

وحدت الوجود یا PRNTHEISM کی اس توجیہ کی رو سے عابد ومعبود اور آمر ومامور میں واجب تعالیٰ مرتبہ اطلاق میں وجود مطلق سے متصف ہے مگر ممکنات مرتبہ تقیید میں اس سے متصف ہیں۔

مصنف فرماتے ہیں کہ:۔

"مخفی نہ رہے کہ اس عینیت میں وجود کا شعور بڑے سخت مجاہدہ اور ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔"

"وایں عینیت مخفی می ماند و بعد مجاہدہ و ریاضت منکشف می شود۔"

اس کے بعد وہ وحدت شہود کی حقیقت بتاتے ہیں یہ ایک مخصوص کیفیت کا نام ہے جس کے نتیجے میں دل میں ایک نور پیدا ہوتا ہے۔ اس نور کے بریق ولمعان میں عرش سے لے کر فرش تک جملہ ماسوائے باری تعالیٰ اس طرح چھپ جاتے ہیں جس طرح سورج کی روشنی میں دوسرے ستارے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں حالانکہ درحقیقت وہ موجود ہوتے ہیں اسی طرح ماسوائے باری تعالیٰ جملہ ممکنات موجودہ حقیقتاً موجود ہیں مگر وحدت الوجود کی رو سے عارف کی نظر میں نابود محض ہو جاتے ہیں۔ اور اسے صرف ذات باری تعالیٰ شانہ ہی کا شعور باقی رہ جاتا ہے۔

یہ تمہید تھی جسے مصنف علامؒ نے نظریۂ وحدت الوجود کی عقلی توجیہ کے لئے قائم کیا تھا انھوں نے اس طول طویل تمہید کا خلاصہ آخر میں بدیں طور دیا ہے

اللہ علم ہے ذات واجب الوجود کے لئے۔ اور اس ذات کے بارے میں اختلاف ہے۔

۱۔ حکماء و متکلمین کے نزدیک یہ ذات مستجمع الصفات جزئی حقیقی ہے اور جملہ موجودات حقیقۃً موجود ہیں اور واجب تعالیٰ سے مبائن و مغائر ہیں۔

۲۔ صوفیاء کرام کے اس باب میں دو گروہ ہیں:

(الف) ایک گروہ واجب تعالیٰ کو جزئی حقیقی قرار دیتا ہے اور موجودیت کو صرف اسی ذات واجب تعالیٰ میں منحصر گردانتا ہے رہے ممکنات تو وہ واہم محض

ہیں اور ان کا وجود اعتباری ہے۔

(ب) دوسرے گروہ کے نزدیک واجب الوجود کی حقیقت وجود مطلق ہے جو نہ عام ہے نہ خاص اور تمام شرائط وقیود سے منزہ ومتعال ہے۔ رہے ممکنات (یا عالم خارجی) تو وہ بھی اسی وجود مطلق کے ساتھ موجود ہیں (مگر مرتبہ تقیید میں) اس طرح واجب وممکن مِنْ وجہٍ عینِ یکدیگر ہیں اور مِن وجہٍ ایک دوسرے کے غیر ومبائن۔

مصنف اسی توجیہ کو اختیار کرتے ہیں کیونکہ یہ جامع شریعت وطریقت ہے اور سرِ مو جادۂ مستقیم سے متجاوز نہیں ہے۔

اس خلاصہ مقال کے بعد انھوں نے نفس مسئلہ یعنی نظریۂ وحدت الوجود کے اثبات کو لیا ہے مگر یہاں انھوں نے منطقی ثبوت کے بجائے تمثیل سے کام لیا ہے اور واجب تعالیٰ کو وجود مطلق ثابت کرنے کے لئے موجودات کے مراتب وجود کی صف بندی (CLASS-FICATION) کی ہے اس کے لئے انھوں نے پہلے اشیار منورہ کے اشراق و درخشانی کی صف بندی کی ہے کہ ان اشیار منورہ کی نورانیت میں تین مرتبے ہیں:

مرتبہ اول: جبکہ روشن چیز اسی نور سے منور ہو جو اپنے علاوہ کسی غیر سے حاصل کیا ہو جیسے وجود زمین کہ وہ اس نور سے روشن ہوتی ہے جسے وہ سورج سے حاصل کرتی ہے یہ حضوریت کا ادنیٰ مرتبہ ہے۔

ظاہر ہے کہ اس مرتبہ میں شئے منور سے نور کا انفکاک ذہناً وخارجاً جائز وواقع ہے ہم یہ بھی تصور کر سکتے ہیں کہ زمین موجود ہو مگر اندھیری یعنی روشنی معدوم ہو اور واقعتاً بھی ایسا ہوتا ہے رات کے وقت زمین موجود ہوتی ہے مگر اندھیری اور نور سے خالی۔

مرتبۂ دوم: شئے منور ایسے نور سے روشن ہو جو خود اس کی ذات کا مقتضیٰ ہو، کسی غیر سے حاصل و مستفاد نہ ہو بایں ہمہ وہ شئے عین نور نہیں ہوتی۔

اس کی مثال خود سورج ہے کہ اس کی روشنی خود اس کی ذات کا مقتضیٰ ہے بایں ہمہ سورج اور شئے ہے اور اس کی روشنی شئے دیگر۔

اس طرح یہ نور آفتاب خارج میں آفتاب سے جدا اور منفک نہیں ہو سکتا مگر چونکہ نور آفتاب کا غیر ہے اس لئے ایک کا تصور دوسرے کے بغیر ممکن ہے یا بالفاظ دیگر ذہناً نور کا آفتاب سے انفکاک ممکن ہے اگرچہ خارج میں یہ جائز نہیں ہے۔

مرتبۂ سوم: شئے منور خود اپنے ہی نور سے روشن ہو اور اپنی نورانیت میں کسی اور چیز کی محتاج نہ ہو اس کی مثال خود نور کی ذات ہے کہ اپنی ذات ہی کی بنا پر منور ہے اور لوگوں کی آنکھوں میں ظاہر و عیاں ہے اور اپنے ظہور کے لئے کسی دوسرے نور کا جو اس کے کسی غیر سے حاصل ہو محتاج نہیں ہے۔

اس نور کا انفکاک خود سے نہ خارجاً جائز و ممکن ہے اور نہ ذہناً کیونکہ وہ اپنی ذات سے منفک نہیں ہو سکتی۔

ان مراتب سہ گانہ کا ایک مرتبہ پھر گوشوارہ دیتے ہیں۔

مرتبۂ اول میں وہ روشن چیز منور بالغیر ہوتی ہے جیسا کہ زمین جو سورج کے نور سے منور ہے۔ یہاں تین چیزیں ہیں زمین، روشنی اور آفتاب اور تینوں باہم متغائر ہیں۔

مرتبۂ دوم میں وہ روشن چیز منور بالذات ہوتی ہے مگر جس نور سے وہ منور ہوتی ہے وہ خود جیسا کہ آفتاب منور بالذات ہوتا ہے مگر وہ نور غیر سے حاصل ہوتا ہے یعنی نور سے اس مرتبہ میں دو چیزیں ہوتی ہیں آفتاب اور نور جو دونوں باہم متغائر و

مباین ہیں۔

مرتبہ سوم میں وہ روشن چیز منور بالذات ہوتی ہے مگر جس کے نور سے وہ منور ہوتی ہے وہ خود اس کی ذات ہی ہوتی ہے جیسے خود نور کہ روشن ہے اپنی ہی ذات سے۔ اس مرتبہ میں وہ صرف ایک ہی چیز ہوتی ہے یعنی نور۔

اور یہ مرتبہ افضل ترین مرتبہ نورانیت ہے۔

اسی تمثیل کی بنیاد پر مصنف نے موجودات کی صف بندی کی ہے۔

مرتبۂ اول میں موجود اس وجود سے متصف ہوتا ہے جو اسے موجد سے حاصل ہوتا ہے اس مرتبہ میں تین چیزیں ہیں موجود، وجود، اور موجد۔ اسی مرتبہ میں موجود .... اپنے وجود سے خارجاً نیز ذہناً منفک اور جدا ہوسکتا ہے۔

مرتبۂ اوسط میں موجود اس وجود سے متصف ہوتا ہے جو اس کی ذات کا مقتضیٰ ہوتا ہے جس طرح متکلمین کے نزدیک واجب تعالیٰ جو بذات خود مقتضیٰ وجود ہے۔ اس مرتبہ میں صرف دو چیزیں ہوتی ہیں موجود مقتضیٰ اور وجود جو اس موجود حقیقی (واجب الوجود) کا مقتضیٰ ہے ان دونوں میں خارجاً انفکاک ناممکن ہے اگرچہ ذہناً ممکن ہے۔

مرتبۂ اعلیٰ میں موجود اس وجود سے متصف ہوتا ہے جو خود ذات موجود کا عین ہوتا ہے یہ وجود نہ اس موجود اعلیٰ کا غیر ہے اور نہ اس کے غیر سے مستفاد ہے اس لئے اس مرتبہ میں نور کی طرح ایک ہی چیز ہے یعنی وجود مطلق اور اسی طرح یہاں بھی وجود مطلق کا خود اپنے وجود سے انفکاک خارج اور ذہن دونوں میں محال اور ناقابل انفکاک ہے اور یہ موجودیت کا افضل ترین مرتبہ ہے مصنف فرماتے ہیں کہ عقل حاکم ہے کہ واجب تعالیٰ اعلیٰ مراتب وجود کے ساتھ متصف ہو اور موجودیت

کا اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ وہ بنفسہٖ وبذاتہٖ موجود ہو یعنی اپنی ہی ذات کے ساتھ موجود ہو اور دوسری اشیاء کی موجودیت اسی کی محتاج ہو۔

اور موجود بنفسہٖ وجود مطلق ہے جس کی تفصیل اوپر گذری۔

پس واجب تعالیٰ عینِ وجود مطلق ہے جو مرتبۂ اطلاق میں معبود اور مرتبۂ تقیید و تنزل میں عابد ہے۔

آخر میں اس تمام استدلال کا خلاصہ بدیں طور بیان کرتے ہیں:

چاہیئے کہ واجب تعالیٰ اتم و افضل ترین مراتب وجود سے متصف ہو مگر وہ اتم و افضل ترین مرتبۂ موجودیت صرف وہ وجود ہے جو بنفسہٖ وبذاتہ موجود ہے، جو اپنی موجویت میں کسی دوسری شئے کا محتاج نہیں ہے۔ پس حقیقت واجب نہیں ہے مگر وجود مطلق جو موجود بنفسہٖ ہے اور باقی جملہ اشیاء اسی سے موجود ہوتی ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ واجب الوجود وجود مطلق ہے جو بنفسہٖ موجود ہے اور باقی دوسری اشیاء اسی وجود سے موجود ہیں جیسا کہ نور جو بنفسہ روشن ہوتا ہے اور تمام دوسری اشیاء اسی سے روشن ہوتی ہیں۔

اپنے موقف کو زیادہ مستحکم بنانے کے لئے مصنف نے رسالہ کا اختتام شواہد قرآنی سے کیا ہے مگر ان کی تفسیر و تاویل میں اہل شریعت سے اختلاف ہو سکتا ہے اس لئے ان کے بیان سے صرف نظر کرنا ہی مستحسن ہوگا۔

آخر میں میں صاحب اعیان الشیعہ کے اس تبصرے کو نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے انھوں نے مصنف کی فلسفیانہ کتابوں کو دینی اور دینی کتابوں کو فلسفیانہ کہا ہے فرماتے ہیں:

"نحق ان تعد کتبہ الفلسفیۃ کتبا دینیۃ
ونعد کتبہ الدینیۃ کتبا فلسفیۃ۔"

اور یہ واقعہ ہے کہ اس کڑی کمان کو زہ کرنا جس میں نہ تو شریعت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے پائے اور نہ حکیمانہ تحقیق میں کوئی کوتاہی رہنے پائے اپنی جگہ ایک اہم علمی و دینی کارنامہ ہے جس کے لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے۔

در کفِ جامِ شریعت در کف سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

تاریخِ اسلام
خلافتِ راشدہ و بنی اُمیّہ

از جناب عبد الرؤف صاحب ایم اے

گذشتہ دنوں جناب خورشید احمد فارق پروفیسر عربی دہلی یونیورسٹی کی تصنیف موسوم بہ "تاریخ اسلام - خلافتِ راشدہ و بنی امیہ" کے مطالعہ کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ مذکورہ تصنیف "جو کم و بیش پچاس پچپن مؤرخینِ متقدمین و متاخرین کے اوریجنل originals مصادر و مراجع کو کھنگال کر نظر گاہ عام پر لائی گئی ہے" کی تصریحات کے ضمن میں فاضل مصنف نے وضاحت کرتے ہوئے صحیح طرح پر فرمایا ہے کہ "کتاب میں ہماری بعض تصریحات قاری کو روایتی ڈگر سے ہٹی ہوئی ملیں گی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی (حق اور انصاف کی بات کہو چاہے صاحبِ معاملہ تمہارا رشتے دار ہی کیوں نہ ہو) کے حکیمانہ قول پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔" مگر کتاب کا از ابتدا تا انتہا مطالعہ کرنے پر اپنی کم نظری کے باوصف محسوس ہوا کہ نہ صرف 'بعض' بلکہ بیشتر تصریحات کے سلسلہ میں اس حکیمانہ قول سے صرف نظر کرتے ہوئے تصویر کے صرف ایک ہی رُخ کو نمایاں کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ سطورِ ذیل کے پڑھنے سے قارئین پر خاکسار کا یہ تاثر واضح ہو جائے گا۔

فاضل پروفیسر صاحب مذکورہ تصنیف کے صفہ ۳ پر خلیفہ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ کے وظیفہ کی بابت فرماتے ہیں : خلیفہ ہوکر ابوبکر صدیق رضؓ کی ذمہ داریاں اتنی بڑھیں کہ انہیں تجارت چھوڑنا پڑی۔ اس کی تلافی انھوں نے بیت المال سے کی جس طرح رسول اللہؐ خالصہ املاک سے اپنے متعلقین کی ضروریات رفع کرتے تھے اسی طرح ابوبکر صدیق رضؓ نقد، جنس، کپڑا، اونٹ، غلام غرضیکہ جس چیز کی بھی ضرورت ہوتی بیت المال سے لے لیتے تھے ....." یہی تاثر ۱۰۳ انیز دیگر صفحات پر بھی بہ اندک تغیر دیا گیا ہے۔ مگر اِس بات کا کہیں اشارۃً وکنایتہً بھی ذکر نہیں فرمایا کہ انھوں نے اپنی سوا دو سالہ مدتِ خلافت (۱۱-۱۳ ھ) میں جو کچھ حقِ خدمت بیت المال سے وصول کیا تھا اسے حساب لگوا کر اپنی حالتِ احتضار کے قریب واپس بیت المال میں جمع کروانے کی وصیت فرمادی تھی۔ جسے حسب وصیت واپس کر دیا گیا۔ یہ مال جب خلیفۂ ثانی حضرت فاروق رضؓ اعظم کی خدمت میں پہونچا تو بے ساختہ اُن کا دل بھر آیا۔ وہ روتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے اے ابوبکر! تم نے اپنے جانشینوں کا کام بہت دشوار کر دیا۔[۱]

حضرت علی رضؓ کے تخلف عن البیعۃ کے بارے میں مصنفِ محترم نے فرمایا ہے۔" علی حیدر رضؓ کی بیوی فاطمہ رضؓ بنتِ رسول اللہؐ ابوبکر صدیق رضؓ سے سخت ناراض تھیں اور علی حیدر رضؓ کی بیعت کی راہ میں سنگِ گراں، ان کی ناراضگی کی ایک وجہ یہ تھی کہ ابوبکر صدیق رضؓ اُس عظیم منصب پر فائز ہو گئے تھے جو اُن کی رائے میں اُن کے شوہر

---

[۱] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ صدیقِ اکبر مرتبہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم۔ اے طبع سوم صفہ ۳۰۲، تاریخ الخلفاء مترجم اقبال الدین احمد صہ ۱۲۱، خلافت وملوکیت صہ ۸۲ طبع سوم از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔

کو ملنا چاہیئے تھا۔ دوسرے یہ کہ ابوبکر صدیقؓ نے انھیں رسول اللہؐ کی خالصہ جائیداد دینے سے انکار کردیا تھا جو مخیریق یہودی کے سات نخلستانوں، خیبر، فدک کے فارموں اور باغوں پر مشتمل تھی اور جس کا فاطمہؓ خود کو قدرتی وارث تصور کرتی تھیں، ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے چند ماہ بعد جب اُن (حضرت فاطمہؓ) کا انتقال ہوگیا ..... تو علی حیدرؓ نے بُرے دل سے اُن کی بیعت کرلی ..... علی حیدرؓ نے بیعت تو کرلی لیکن اُن کا دل صاف نہیں ہوا (ص ۷) علی حیدر نے بی بی فاطمہؓ کی حین حیات ابوبکر صدیقؓ کی بیعت نہیں کی تھی (ص ۹۲) خلافت سے محرومی کے بعد اس دوسری ناکامی (خالصہ جائداد سے محرومی) نے علی حیدرؓ کی طبیعت سخت منغص کردی، حکومت کے خلاف اُن کے تیور چڑھ گئے اور زبانِ طعن کھل گئی (ص ۲۰۱-۲۰۲)

لیکن حضرت علیؓ کے بیعتِ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے تخلف (پیچھے رہنا) کے بارے میں اگر ہم عصرِ حاضر کے محقق شہیر مولانا پروفیسر سعید احمد صاحب اکبر آبادی (المتوفی مئی ۱۹۸۵ء) کی تحقیق پر سرسری نگاہ بھی ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ حضرت علیؓ نے خلیفۂ اول سے بیعت کرنے میں ایک دن کا بھی توقف نہیں فرمایا۔ مولانائے موصوف فرماتے ہیں کہ "جب ابوبکرؓ منبر پر بیٹھ گئے تو انھوں نے لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور جب علیؓ کو نہیں دیکھا تو ان کی نسبت پوچھا اس پر کچھ انصاری کھڑے ہوئے اور جاکر علیؓ کو لے آئے۔ ابوبکرؓ نے ان سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور داماد بھی ہیں، کیا آپ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں۔ علیؓ نے کہا اے خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملامت نہ کیجیے، اس کے بعد علیؓ نے ابوبکرؓ سے بیعت کرلی[۱]۔" حضرت ابوسعید خدریؓ کی اس روایت سے ظاہر ہے کہ

۱؎ صدیق اکبرؓ ص ۷۶۔ بحوالہ مستدرک للحاکم ۳/۷۶۔

حضرت علیؓ کی بیعت میں کسی طرح کا تخلف و اکراہ نہ تھا۔ یہ حدیث صحابیؓ مذکور کے علاوہ دوسرے صحابہ کرامؓ سے بھی منقول ہے۔ لیکن چونکہ زیر تبصرہ تصنیف کے فاضل مصنف نے تقدیم وتاخیر زمانی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کتب حدیث سے "قدیم تر کتابوں کے حوالے دینا زیادہ مناسب نہ سمجھا" (ملاحظہ ہو برہان دہلی ص ۹۸ بابت ماہ فروری ۱۹۸۴ء) چنانچہ موصوف نے (خواہ طبقۂ جمہور کے نزدیک احادیث شریفہ کا درجہ استناداً و درایتاً سیرت و مغازی کی روایات سے کہیں بڑھ کر ہے) احادیث سے ارادۃً صرف نظر کرتے ہوئے تاریخی مواد پر ہی اکتفا کیا۔ مگر مندرجہ بالا حدیث شریف کو محدثین کے علاوہ ابن سعد نے بھی روایت کیا ہے جسے پروفیسر صاحب قدیم تر مورخ سمجھتے ہیں (برہان ایضاً) جبکہ انہی ابن سعد سے موصوف نے کم و بیش ۱۲۵ مقامات پر مراجعت فرمائی ہے۔ بیعت کے سلسلہ میں دیگر قرائن و شواہد بھی اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ حضرت علیؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ہر طرح خلافت کا اہل اور مستحق سمجھتے تھے اور یہ کہ بیعت کرتے وقت (اول روز ہی) نہ تو ان کی طبیعت میں کسی قسم کی تنغیص ہی تھی اور نہ دل میں کسی قسم کا تکدر و انقباض ہی جیساکہ اس ضمن میں حضرت ابوسفیانؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مابین مکالمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔[ؔ] فاضل مصنف کی محولہ بالا عبارت کے اس فقرہ "علی حیدرؓ کی بیوی فاطمہؓ بنت رسول اللہؐ ابوبکر صدیقؓ سے سخت ناراض تھیں اور علی حیدرؓ کی بیعت کی راہ میں سنگ گراں" سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی پاکیزہ سرشت میں خلیفۂ اول کی طرف سے کسی طرح کا غبار نہ تھا اور وہ برضا و رغبت بیعت کرنے پر آمادہ تھے مگر حضرت فاطمہؓ ان کی

ؔ (پورا مکالمہ ملاحظہ ہو) خلافت و ملوکیت ص ۹۰ بحوالہ کنز العمال، طبری، ابن عبدالبر الاستیعاب۔

بیعت کی راہ میں سنگ گراں تھیں اس لئے ان کی دل جوئی کی خاطر انھوں نے بیعت سے ممکن ہے کچھ توقف فرمایا ہو، چنانچہ انھیں مجمع عام میں بلوانا پڑا۔ رہا حضرت فاطمہؓ کی کبیدگی خاطر کا دوسرا سبب کہ انھیں رسول اللہؐ کی خالصہ جائیداد سے محروم کر دیا گیا تھا تو اسے حضرت علیؓ کی بیعت سے علیحدگی کے تناظر میں پیش کرنا قیاس مع الفارق پر ہی منتج ہوگا کیونکہ خالصہ جائیداد سے محروم کرنے کا مسئلہ بیعت عامہ کے وقت معرض وجود ہی میں نہیں آیا ہوگا۔ اس کا تعلق نظم مملکت سے ہے جس کی طرف توجہ یقیناً بعد ہی میں مبذول کی گئی ہوگی۔

یہ تسلیم کرنا کہ حضرت علی حیدرؓ نے حضرت فاطمہؓ کے سانحۂ ارتحال کے بعد ہی بادلِ ناخواستہ بیعت کی تھی، شواہد و دلائل کے منافی ہوگا کیونکہ اولاً حضرت علیؓ کا بیعت نہ کرنا مسلمانوں کی اجتماعیت کے لئے سب سے بڑا حادثہ ہو سکتا تھا تو کیا اس وقت جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی فوراً اسلام کی مخالفت کا طوفان امنڈ پڑا تھا۔ حضرت علیؓ جیسی عظیم المرتبت شخصیت یہ کبھی گوارا کر سکتی تھی کہ ان کے کسی فعل سے مسلمانوں کی اجتماعی وحدت میں کسی قسم کا کوئی رخنہ پیدا ہو؟ ثانیاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کا اسلام میں جو مرتبہ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؓ پر جو اعتماد تھا جس کے باعث آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کی طرف قولاً و عملاً اپنا رجحان ظاہر فرمایا تھا، حضرت علیؓ سے زیادہ ان سب سے زیادہ اور کون واقف ہو سکتا تھا۔ اس بنا پر کیا حضرت علیؓ سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ بایں ہمہ وہ بیعتِ عامہ کے وقت سب مسلمانوں سے الگ رہیں۔ حضرت ابوبکرؓ تو ابوبکرؓ، حضرت علیؓ کا کیرکٹر تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی بیعتِ خلافت کے وقت بھی عام مسلمانوں سے الگ نہیں رہے اور اپنے لئے کوئی دعویٰ یا مطالبہ نہیں کیا رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ ثالثاً اگر یہ مان لیا جائے کہ حضرت علیؓ نے واقعی چھ ماہ تک بیعت نہیں کی تھی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس

مدت میں جو اہم واقعات وحوادث پیش آئے اور جو درحقیقت اسلام کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھے۔ حضرت علیؓ ان سب سے بے تعلق رہے اور انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ کوئی تعاون اور اشتراکِ عمل نہیں کیا تو کیا واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے؟ رابعاً اچھا اگر مان بھی لیا جائے کہ حضرت علیؓ نے بیعت نہیں کی تو کیا حضرت ابوبکرؓ اس گو مگو کی صورت کو برداشت کر کے اسلامی وحدت کی دیوار میں یہ ایک رخنہ کھلا رہنے دے سکتے تھے؟ کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت علیؓ کا بیعت نہ کرنا ان کو کم از کم بنو ہاشم کی حمایت و نصرت سے محروم کر دیتا ہے[1]۔" علاوہ ازیں "بعض معتدل خیال شیعی حضرات بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگرچہ رسول اللہؐ کے بعد سیدنا علیؓ افضل الناس اور خلافت کے سب سے زیادہ مستحق تھے لیکن انھوں نے حضرات شیخینؓ کی خلافت کو قبول کر لیا تھا اور اُن کے ساتھ اشتراکِ عمل اور تعاون کو ملحوظ رکھا نیز یہ کہ امت کو اپنے والی اور حاکم کے انتخاب کا حق ہے اور ان کا انتخاب رشد و ہدایت کے لئے کافی ہے[2]۔"

حضرت سعد بن عبادہؓ کی بیعت سے علیحدگی کا واقعہ بھی محل نظر ہے۔ آپ کے بارے میں موصوف ص ۱۳ پر فرماتے ہیں کہ جب وہ ڈرانے دھمکانے کے باوجود اپنے موقف سے نہیں ہٹے تو بڑے پیمانے پر خون خرابہ ہونے کے اندیشہ کے سبب اُن سے مزید تعرض نہیں کیا گیا تاہم انھیں مدینہ میں رہنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اور وہ جلاوطن ہو کر شام چلے گئے۔ عبارت کے خط کشیدہ فقرہ سے ثابت ہوتا ہے

---

۱ صدیق اکبرؓ (مقدمہ ص ۲۱ - ۲۲)۔

۲ مذہب اور باطنی تعلیم از مرزا محمد سعید دہلوی۔ ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس۔ ص ۱۱۲ - ۱۱۴ مطبوعہ اردو مرکز لاہور۔

کہ انھیں مدینۃ الرسول سے زبردستی نکال دیا گیا۔ مگر اس سلسلہ میں موصوف اپنے مضمون "اعتراضات کے جواب" ماہنامہ برہان دہلی بابت فروری ۸۴ء ص ۹۹ پر یوں رقمطراز ہیں: "جب ابوبکر صدیقؓ اور اُن کے حامی قریشی صحابہ انصار کو خلافت دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے اور ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب ہوگیا تو بڑے انصاری لیڈر اور امیدوارِ خلافت سعد بن عبادہؓ نے نئے خلیفہ کی بیعت نہیں کی اور اُن کے پیچھے نماز پڑھنا چھوڑ دی اور بطور احتجاج گھر بار چھوڑ کر شام کے شہر حوران چلے گئے۔" برہان میں مندرج عبارت کے اس آخری فقرہ سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ صحابیٔ مذکور خلیفۂ وقت پر جمہوری طرز کا دباؤ ڈالنے کی غرض سے بطور احتجاج از خود شام کے شہر حوران تشریف لے گئے تھے۔ اور ہمارے ناقص خیال کے مطابق اُن کا یہ احتجاج بالکل ایسا ہی ہوگا جیسا کہ آج کل جمہوری ممالک میں ممبرانِ حزب مخالف سرکار کی بعض پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے پارلیمنٹ سے واک آؤٹ کر جاتے ہیں۔ بہرحال محولہ بالا دونوں عبارتوں میں تناقض ہے جس سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے بھی حضرت صدیق اکبرؓ سے پہلے دن ہی بطیب خاطر بیعت کرلی تھی۔ رہا سوال حضرت سعدؓ کا بعہدِ صدیقی مدینہ میں اقامت گزینی کا تو صحیح یہ ہے کہ وہ بعہدِ خلیفۂ ثانی شام کے شہر حوران تشریف لے گئے ہیں جہاں اپنی رحلت کے وقت تک مقیم رہے۔[۵] حتی خرج الی الشام فی اول خلافۃ عمر فمات بحوران)

---

[۵] صدیق اکبر ص ۸۵-۸۶، سیرۃ الصدیق ص ۳۰۹، تاریخ ابن خلدون جلد اول قسط دوم ص ۲۴۰ مطبوعہ ادارہ درس قرآن دیوبند۔ کنز العمال ۳/۱۳۴ مطبوعہ حیدرآباد دکن۔

دراصل واقعات کی اکثر تصریحات اپنے صحیح تناظر سے اس لیے ہٹی ہوئی ہیں کہ لائق مصنف نے اپنے مصادر و مراجع سے کتب احادیث یعنی صحاح ستہ کو خارج از رجوع رکھا ہے کیونکہ موصوف کے نزدیک کتب سیر و مغازی کے مصنفین کو تقدم زمانی حاصل تھا اور انھوں نے مکے مدینے میں اخبار و آثار کے معتبر معاشرے کے مقبول و معزز لوگوں سے رسول اللہؐ کے صحابہ کے حالات اخذ کیے تھے۔ یہ مصنف خود بھی ثقہ تھے، ان میں سے کوئی ممتاز فقیہ تھا، کوئی مفتی، کوئی قاضی، کوئی عالم حدیث (ایضاً برہان ص ۹۸-۱۰۱) گویا نعوذ باللہ محدثین کرام نے 'مستند ترین احادیث' کا تمام تر ذخیرہ غیر معتبر معاشرے کے مجہول و مردود اور اراذل لوگوں سے اخذ کیا تھا جو خدانخواستہ خود بھی غیر ثقہ تھے اور اُن میں نہ کوئی فقیہ تھا، نہ مفتی اور نہ قاضی ۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔

فاضل پروفیسر صاحب نے اِس بارے میں جو چند نام گنوائے ہیں[۱] ان کی تقدیم و تاخیر زمانی اور ثقاہت و فقاہت کے سلسلہ میں عرض کرنے سے پیشتر یہ گوش گذار کرنا چاہیں گے کہ موصوف کے مصنفین و مؤلفین کو خواہ تقدم زمانی کی فوقیت حاصل ہو مگر انھیں صحت روایت و درایت میں وہ فوقیت اور برتری ہرگز حاصل نہیں جو محدثین عظام کو حاصل رہی ہے اور پھر کلیہ کے طور پر یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اگلے پچھلوں کے لئے بہت کچھ چھوڑ جاتے ہیں اور بسا اوقات علم کے پہلے حاملین سے بعد کے سیکھنے والے بدرجہا فائق ہو جاتے ہیں اور اگرچہ وہ زمانے کے لحاظ سے آخر میں ہوتے ہیں لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں کے علاوہ علمی میدان میں بھی ایسے کارہائے نمایاں انجام دے جاتے ہیں جو متقدمین سے نہیں ہو سکے تھے۔ یہ بات محدثین کرام کی محنت و کاوش پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ بہر حال اگر موصوف صرف طبقۂ قدما کے مؤرخین

---

[۱] ماہنامہ برہان ایضاً ص ۹۸ — ۱۰۱ -

ہی پر انحصار فرماتے تب تک بھی بجا اور درست تھا مگر پوری تصنیف میں جن پچاس ساٹھ مصنفین سے استفادہ واستناد فرمایا ہے، کیا وہ تمام طبقۂ قدماء میں شمار ہوتے ہیں ؟ موصوف نے جن مؤلفین کو قدیم ترین خیال فرمایا ہے اُن میں سے چند کے سنینِ وفات نذرِ ناظرین کیے جاتے ہیں :

موسیٰ بن عقبہ (۱۴۱ھ) محمد بن اسحٰق (۱۵۰ - ۱۵۱ھ) ابو اسمٰعیل ازدی بصری (۱۵۲ھ) ولید بن مسلم القرشی (۱۹۵ھ) محمد بن سعد صاحب طبقات (۲۳۰ھ) مصعب بن عبد اللہ زبیری (۲۴۰ھ) محمد بن عمر الواقدی (۲۰۷ھ) سجستانی (۲۶۱ھ) ابن قتیبہ (۲۱۳ھ) بلاذری (۲۷۹ھ) دینوری (۲۸۱ھ) یعقوبی (۳۰۰ھ) وغیرہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے تقریباً ۳۰۰ھ تک فوت ہونے والے مصنفین کو طبقۂ قدماء میں شمار فرمایا ہے[۵] بعد ازاں متاخرین کا دور ہے۔ ساتھ ہی اگر ہم محدثین کرام کے سنینِ وفات پر بھی ایک نظر ڈالیں تو علامہ شبلی نعمانیؒ کے بقول وہ بھی طبقۂ قدماء ہی میں شمار ہوں گے۔ امام بخاریؒ (۲۵۶ھ) امام مسلمؒ (۲۶۱ھ) امام ابن ماجہؒ (۲۷۳ھ) امام ابوداؤد (۲۷۵ھ) امام ترمذی (۲۷۹ھ) اور امام نسائی (۳۰۳ھ)۔ مگر مستزاد یہ کہ صاحب "تاریخ اسلام۔ خلافت راشدہ و بنی امیہ" نے متاخرین سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا ہے مثلاً ابوالحسن علی بن حسین مسعودی المتوفی ۳۸۶ھ، ابونعیم اصبہانی (۴۳۰ھ) حافظ ابوربیع سلیمان بن موسیٰ الکلاعی صاحب اکتفاء (۶۳۴ھ) ابن ابی الحدید (۶۵۵ھ) ابن ابی اصیبعہ (۶۶۸ھ) ابن کثیر صاحب البدایہ والنہایہ (۷۷۴ھ) وغیرہم۔ پھر ایسی صورت میں صحاح ستہ سے مراجعت نہ فرمانے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر مراجعت فرماتے

---

[۵] سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۳۵ مطبوعہ ۱۳۶۴ھ مطبع معارف اعظم گڈھ۔

تو کوئی وجہ نہ تھی کہ موصوف خلیفۂ اول کی ازواج کی تعداد صرف چار ہی بتلاتے (ص ۱) جبکہ بخاری شریف میں بروایت حضرت عائشہؓ صدیقہ مسطور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے بنوکلب کی ایک عورت سے بھی، جس کا نام اُم بکر تھا شادی کی تھی۔ اور ہجرت کے وقت اُن کو طلاق دیدی تھی۔[۱] اس طرح کی دیگر متعدد مثالیں سیرۃ النبی جلد اول میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ محققین یہ بھی کہتے ہیں کہ حدیث صحیح تمام ارباب سیر کی متفقہ روایت کے مقابلہ میں بھی قابل ترجیح ہے، نیز یہ کہ سیرت میں آج تک کوئی کتاب صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی (علامہ شبلیؒ)

لیکن تقدم زمانی ہی اگر معیارِ ثقاہت ہے تو اس سلسلے میں بھی ڈاکٹر محمد لیسین مظہر صدیقی فرماتے ہیں کہ "ابتداءِ تاریخ نگاری اسلام میں تو راویوں کی شخصیت، دیانت اور ثقاہت وغیرہ کو بھی نہیں پرکھا جاتا تھا۔[۲]

سیرت نبوی کے اولین مؤلف محمد بن اسحٰق کی شخصیت متنازعہ فیہ ہے، اگر ایک گروہ آج کو ثقہ سمجھتا ہے تو اسی درجہ کا دوسرا گروہ ان کو بے اعتبار قرار دیتا ہے۔[۳] مغازی نگاروں کے سرخیل واقدی کی روایتیں تو موجودہ دور کے سنجیدہ علمی حلقوں میں بالکل قابل قبول نہیں سمجھی جاتی ہیں کیونکہ اس کی لغو بیانی مسلمہ ہو چکی ہے۔[۴] ایک صاحب نے تو اُس کے بارے میں بڑی ظرافت آمیز بات کہی ہے کہ اگر واقدی سچا ہے تو دنیا میں کوئی اُس کا ثانی نہیں اور اگر جھوٹا ہے

۱ؔ صدیقِ اکبرؓ ص ۴۵۲۔

۲ؔ ماہنامہ برہان دہلی ص ۳۵ بابت دسمبر ۱۹۸۲ء۔

۳ؔ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ ص ۲۴۶۔۲۴۷ بابت اپریل ۱۹۸۴ء۔

۴ؔ ایضاً۔

تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں[1]۔ علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ "دنیا جانتی ہے کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو کی ہے جس کا شمار معتبر مورخین میں نہیں ہو سکتا۔ تاریخ و سیرت میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے جیسے آپ ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری میں رینالڈس کا حوالہ دیں[2]۔" بہر کیف واقدی... جس کے متعلق تمام دنیا جانتی ہے کہ وہ اندھیری رات میں لکڑیاں چننے والا تھا اور اس کی غلط روایتوں، افسانہ طرازیوں اور جھوٹے قصے کہانیوں اور بے سند باتوں کی وجہ سے اُسے تمام علماء اسلام نے جھوٹا اور نامعتبر قرار دیا ہے[3]۔ علاوہ ازیں وہ شیعیت سے بھی متہم تھا اور تقیہ کیے رہتا تھا گو معتدل شیعہ تھا[4]۔ بہر حال باعثِ تسوید یہ کہ زیر بحث تصنیف کے مصنف نے کم و بیش بارہ ۱۲ مقامات پر واقدی سے رجوع کیا ہے۔ فاضل پروفیسر صاحب نے اپنی تصنیف کے صـ ۱۰۲ پر مؤرخ ابنِ ابی الحدید کو معتزلی عالم قرار دیا ہے۔ جبکہ راقم الحروف کی محدود و ناقص معلومات کی حد تک وہ نہ صرف معتزلی بلکہ مسلک تشیع کا بھی پیرو اور متبع تھا۔ مسلک اعتزال کے بانی واصل بن عطا متوفی ۱۳۱ھ/۷۴۸ء کے بعد اس گروہ کے بعض مشاہیر شیعی عقائد کی طرف میلان رکھنے لگے تھے، چنانچہ اعتزال اور تشیع کی یکجائی کی تاریخ میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مشہور ماہرِ لسانیات امام عمر بن بحر الجاحظ اور ماہر زبان دان ابن ابی الحدید شیعی مسلک اعتزال سے متاثر ہونے والے عرب علماء کی بہترین مثال ہیں۔ چنانچہ ابی الحدید کے شیعہ ہونے کی بنا پر ہی مولانا

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اول صـ ۳۳ نیز ملاحظہ ہوں صفحات ۱۸، ۱۹، ۲۳، ۲۵ اور ۴۸۔

[2] مقالاتِ سلیمان جلد ۲ صـ ۱۱۸۔

[3] ماہنامہ معارف اعظم گڈھ صـ ۲۲۴ بابت ماہ ستمبر ۸۲ء نیز ماہ نومبر ۱۹۸۲ء صـ ۳۳۴۔

[4] سیرتِ نبوی کی اولین کتابیں اور اُن کے مؤلفین مترجم پروفیسر نثار احمد فاروقی صـ ۱۷۵۔

ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی تصنیف "خلافت وملوکیت" میں (ص ۱۳۱) سے صرف ایک روایت
لی ہے کہ "سیدنا علیؓ نے بیت المال میں سے اپنے بھائی عقیلؓ بن ابی طالب کو بھی
زائد از استحقاق کچھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔" اور وہ بھی اس لئے کہ اس روایت
کی دوسرے مورخین مثلاً ابن قتیبہ اور حافظ ابن حجر تائید کرتے ہیں[1]۔ جبکہ پروفیسر صاحب
نے اپنی تصنیف میں تقریباً ۲۷ مقامات میں سے ۲۴ مقامات پر تنہا ابن ابی الحدید
کی روایات پر انحصار کیا ہے[2]۔ مذکورۃ الصدر دونوں مشاہیر کے علاوہ صاحب
مروج الذہب مسعودی بھی معتزلی ہونے کے ساتھ شیعی بھی تھے۔ مصادر و مراجع
کے سلسلے میں ژاژ خائی قدرے طویل ضرور ہوگئی ہے مگر در اصل کسی بھی تصنیف کا معیار
ماخذ پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا چند مثالوں کے پیش نظر یہ نتیجہ نکالنا
نامناسب نہ ہوگا کہ زیر تبصرہ تصنیف کے دیگر مصادر بھی مشکوک ہوں گے۔ سیرت کی
بیشتر کتابوں کا پایہ نہایت بلند اور برتر ہے جیسا کہ سیرت ابن ہشام کے بارے میں
ایک مستشرق کہتا ہے کہ "سیرت نبوی کی عربی تصنیفات جیسے سیرت ابن ہشام کا پایہ
تاریخی حیثیت سے انجیل سے بڑھ کر ہے[3]"۔ دیگر معاندین و مستشرقین نے بھی کتب
سیر و مغازی کی وقعت و صحت کا اعتراف کیا ہے۔

---

۱ خلافت وملوکیت۔

۲ دیکھئے زیر بحث کتاب کے صفحات ۷، ۱۳، ۱۰۲، ۱۳۸، ۱۴۸، ۱۶۵، ۱۶۷، ۱۸۳، ۲۰۰، ۲۰۲، ۲۲۲ نیز ۲۲۵ وغیرہ۔

۳ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ بابت مارچ ۸۳ء ص ۱۸۳۔

برہان

مدیر مسئول: عمید الرحمٰن عثمانی

جلد ۹۸	ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۶ء	شمارہ ۶

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

آج کا انسان اب یا تو پہاڑوں پر جاکر خوبصورتی دیکھ سکتا ہے، یا خلاء لبسیط میں جاکر
دنیا پر ایک نظر ڈالنے سے اس کی خوبصورتی کا احساس کرسکتا ہے، لیکن جو اصل دنیا ہے، اس
میں سکون اور خوبصورتی اب کسی کے لئے نہیں رہ گئی ہے، سیاست جب تک اصولی حکمرانی کا
تھا، اس دنیا میں ہزار جنگوں کے باوجود نسبتاً امن قائم رہا، لیکن جب سے سیاست ایک پیشہ
بن گئی ہے، اس وقت سے یہ حال ہوگیا ہے کہ جنگ نہ بھی ہو تو اس کی دہشت اور خوف سے انسان
پیچھا نہیں چھوٹ سکتا، اتنی آوازیں، اتنے بلاوے، اتنے نظریات، اور اتنے فلسفے کسی زمانے
بھی دنیا میں جمع نہیں ہوئے جتنے کہ آج نظر آتے ہیں لیکن ہر فلسفہ کا خول اترتا ہے تو اس میں
انسان کے ــ خواہ وہ فرد کی صورت میں یا قوم کی ــ استحصال کرنے والی ننگی قوت برآمد ہوجاتی

ان ملکوں میں جن میں ہندوستان بھی شامل ہے حالت اور زیادہ خراب ہے، جہاں سماجی
مکمل نہیں ہوا ہے اور انھیں، ناپختگی کی حالت میں ہی ایک دور سے دوسرے دور میں چھلانگ لگانی پڑی
ہے۔ اس طرح کے ملک اور ان میں ہندوستان بھی شامل ہے ذہنی طور پر دولخت ہوگئے ہیں، اور ا
ایسی مضحکہ خیز صورت حال کا شکار ہوگئے ہیں کہ ان کے ذہن کا ایک حصہ پرانے دور میں لگا ہوا
اور دوسرا حصہ نئے دور سے وابستہ ہوگیا، نتیجہ یہ ہے کہ وہ نہ تو پورے طور پر قدیم رہ سکے ہیں، نہ
طور پر جدید بن سکے ہیں۔

ترقی یافتہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ اپنی دولت کے سہارے پر ایک ایئر کنڈیشنڈ
کیٹیلاگ خرید کر اس میں سونے کے پتروں کا جڑاؤ ہر قسم کا آسائشی سامان فراہم کرلیں، لیکن
آپ کا دماغ اٹھارویں صدی کا ہی رہے، ایسی صورت میں چاہے آپ خلاء میں چکر لگا رہے
ہوں، ذہنی اعتبار سے قدیم ہی رہیں گے۔ جدید اور ترقی یافتہ ہرگز نہیں بن سکتے۔ اس

یس آپ بیسویں صدی کے جدید ذہن کے ساتھ پھٹے پرانے کپڑوں میں دوپہر کے وقت شام کی
ٹی کی فکر میں پیدل دوڑتے نظر آئیں تو اس بے سروسامانی، اور اسباب تعیش سے یکسر محرومی
حالت میں بھی جدید اور ترقی یافتہ ہی بنے رہیں گے، قدیم اور رجعت پسند ہرگز نہیں
سکتے۔

ایسے سبھی ملکوں میں ـــ جن میں ہندوستان بھی شامل ہے ـــ اور جن کی تعداد اس وقت
و سے بھی زیادہ ہوگی، ایسے ہی جدید اور ترقی یافتہ لوگ نظر آتے ہیں جو اٹھارھویں صدی کا
ماغ کندھے پر رکھے ہوئے، ائیر کنڈیشنڈ محلوں اور کوٹھیوں میں سکونت پذیر ہیں، اور جدید ترین
اسوں میں ایر کنڈیشنڈ کاروں کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہیں، ان لوگوں نے جاگیردارانہ
ر سامراجی نظام کے دور میں مشینوں کی شکل تو دیکھ لی تھی، لیکن ان مشینوں کی کھٹ کھٹ سے
بھرنے والے اس صنعتی دور کی جھلک بھی نہیں پائی جس نے حقیقی ترقی یافتہ اور جدید ملکوں
اس ذہنی انقلاب کو جنم دیا تھا، جو آج ایٹمی اور خلائی دور سے مناسبت پیدا کرنے
لئے ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔

اسی صورت حال کا نتیجہ ہے کہ صرف دو چار ملک پورے طور پر جدید اور ترقی یافتہ ذہن
ساتھ خلائی اور ایٹمی دور کے ہر تقاضے کا ساتھ دینے پر قادر ہیں، اور دس بیس
تیزی کے ساتھ قدم مار کر ان کے برابر آنے اور قدم سے قدم ملانے کی تگ و دو
جد و جہد میں لگے ہوئے ہیں، باقی ملک وہ ہیں، جو خلائی اور ایٹمی دور کی برکتوں پر رشک
ں کی نظریں ڈالنے اور اس کے تباہ کن اثرات اور خوفناک عمل سے لرزہ براندام ہونے
سوا کوئی سکت اپنے اندر نہیں پاتے، وہ معاشی ترقی، فوجی قوت اور سیاسی استحکام
لئے عملی طور پر بڑی قوتوں کی مدد پر انحصار کرنے اور بعض اوقات ان کے دست نگر
پر مجبور ہوتے ہیں، لیکن سماجی اور معاشرتی شعبوں میں ان کی ہمسری کی کوشش
باز نہیں آتے۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ناپختہ سیاسی اور ذہنی کیفیتوں کے سبب وہ تمام کمزوریاں، خرابیاں

اور وہ تمام نقائص اور تضادات ان ملکوں کے اندر بھی داخل ہو جاتے ہیں، جن کے یہاں سیاسی اور سماجی تبدیلیاں ایک تاریخی عمل کے بجائے محض روایت اور تقلید کے ذریعہ واقع ہوتی ہیں مثال کے طور پر جمہوری نظام ــــ جو مشرقی ملکوں میں صرف اس لئے ناکام رہا کہ وہ کرپشن پر قابو نہیں پا سکے، جو خالص جاگیردارانہ اور سماجی دور کی دین تھا۔ انھوں نے جمہوری نظام تو ان ترقی یافتہ ملکوں کی تقلید میں اپنے یہاں قائم کر لیا، جو اس کے قیام کے تمام مرحلوں کو طے کرنے کے بعد اس کی برکتوں سے مالا مال ہونے کے فی الواقعہ مستحق بن گئے تھے۔ لیکن ان خرابیوں اور ان محرکات کو ختم کرنے میں ناکام رہے، جن کی موجودگی میں جمہوریت دو قدم بھی آگے کی طرف نہیں چل سکتی۔ اسی لئے افریقہ اور ایشیاء کے بیشتر ملکوں میں جمہوری نظاموں کا جو انجام ہوا، وہ سب پر ظاہر ہے، ایک ہندوستان میں جمہوریت ابھی تک چل رہی ہے لیکن اس کا دامن بھی بڑھتے ہوئے کرپشن نے جس طرح تار تار کر رکھا ہے، اسے ہر شخص دیکھ سکتا ہے اس لئے اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔

جیسا ہم نے کہا کہ ان ملکوں میں جہاں جاگیردارانہ دور کے خاتمہ کا عمل قدرتی طور پر مکمل نہیں ہو سکا۔ جتنے بھی سیاسی نظام قائم ہوئے، وہ خود اپنے اندرونی تضادات کے بوجھ سے خم کھا کر اور لچک کر کچھ کے کچھ ہو گئے، ان ملکوں میں طبقہ واری کشمکش بھی ابتدائی درجوں میں رہ گئی ہے، سوشلزم اور جمہوریت اور آمریت کے تجربے بھی عملی طور پر ناکام ثابت ہوئے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ آدھی سے زیادہ دنیا میں جس چیز کا راج نظر آتا ہے وہ بے یقینی کی حالت ہے، جہاں آمریت اور ڈکٹیٹرشپ قائم ہے، وہاں بھی لوگ پریشان ہیں، جہاں فوجی حکومتیں ہیں، وہاں بھی امن و سکون کے کوئی آثار نہیں۔ ناپختہ ذہنی کیفیتوں سے ٹکرا کر ہر نظریہ چکنا چور نظر آتا ہے اور ہر نظام کی روح اس کے قالب سے باہر دکھائی دیتی ہے۔ اسی بے سکونی، اسی پریشانی اور اسی شورش جیسی حالت کا قدرتی رد عمل اسی غیر منطقی اور مصنوعی فضا کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جس میں احیائیت کی طرف لوٹ جانے کی خواہش غالب نظر آنے لگتی ہے۔ لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ نئے طریق علاج اور نئے مرہموں سے تو چارۂ زخم نہیں ہو سکا تو آؤ

پرانا ہی طریقہ استعمال کر دیکھیں، لیکن مصیبت جب آتی ہے کہ اس خلفشار، پارہ پارہ سیاسی اور معاشی نظریوں کے گورکھ دھندے اور سماجی اور معاشرتی تبدیلیوں کی ایک لمبی زنجیر کے ساتھ اس پرانے دور میں لوٹنا بھی مشکل اور ناممکن دکھائی دینے لگتا ہے۔ اور نجات کے اس راستہ کو بھی بند دیکھ کر جھلاہٹ میں اور اضافہ ہونے لگتا ہے جو پہلے ہی کچھ کم نہیں تھی۔

مثال کے طور پر جو لوگ مذہبی تعصب اور منافرت سے مجبور ہو کر ہندوستان پر ہندو راج قائم کرنے کا تصور پیش کرتے ہیں، ان کے جمہوریت سے غیر مطمئن ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں، البتہ ان کی بے اطمینانی اور مایوسی کی وجوہات پر بحث کی جاسکتی ہے، اور اس کا قیاس لگایا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ جمہوری نظام سے اس درجہ مایوس ہو گئے ہیں کہ آگے بڑھنے کے بجائے انھیں پیچھے ہی ہٹنے میں عافیت نظر آتی ہے، لیکن ان کی ذہنی کیفیت اس وقت پوری طرح مشتبہ اور غیر معتبر ثابت ہوتی ہے، جبکہ وہ ان سوالات کا جواب دینے میں بے بس ٹھہرتے ہیں کہ وہ ایک پورے ملک کو اس کی صدیوں کی تبدیلیوں، نیم پختہ اور پختہ رسوم و رواج اور معاشرتی اور سیاسی روایتوں کے ساتھ ہزاروں برس پہلے کی فضا میں کیسے لے جا کر ٹیک دیں گے اور یہ کیسے ممکن ہوگا کہ وہ نظام جو گاؤں اور دیہات کی پنچایتوں اور وسائل آمد و رفت سے محروم آبادیوں میں مروج تھا، ایسے عظیم اور گنجان شہروں پر منطبق کر دیا جائے، جن کی آبادی اب لاکھوں کی حد سے گذر کر کروڑ کی حدوں تک پہونچ رہی ہے۔ اور ان متضاد عناصر میں مناسبت کی کیا شکل ہوگی، جو ایک طرف ذاتوں کے مستقل نظام اور دوسری طرف پچھڑی ہوئی جاتیوں کو مساوی درجہ دینے کے اصول، بینکوں کے ملکی اور غیر ملکی روابط، اور تجارت کے نئے اور بین الاقوامی ضابطوں کی پابندی اور اسی طرح کے صدہا مسائل کی صورت میں پرانے ہندو راج کے لئے ایک چیلنج کی صورت میں سامنے آئیں گے۔ جب تک مسلمان، عیسائی، اور اب — کہنا چاہیئے کہ سکھ قومیتیں، ایک ناگوار اور ناقابل برداشت بوجھ کی صورت میں سامنے ہیں، اس وقت تک تو ہندو راج کا تصور یقیناً دلکش اور دلفریب نظر آسکتا ہے

کیونکہ اس میں ان مذکورہ تمام قومیتوں کو ختم کر کے، اقتدار اور اس کے تمام لوازمات کو صرف ہندو قوم کے لئے مخصوص کر لینے کے تمام خواب آگیں اور سحر انگیز عناصر موجود ہیں لیکن ایک لمحہ کے لئے یہ مان کر چلنے کے بعد کہ ہندوؤں کے علاوہ کوئی دوسری قومیت اور کوئی دوسرا فرقہ ملک میں موجود نہیں رہا۔ خود ہندو راج کا نظریہ کس درجہ ناقابل عمل اور بے معنی نظر آنے لگتا ہے اس کے بارے میں سوچنے تک کی ضرورت غالباً کسی کو محسوس نہیں ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندو راج کے نظریہ کی ساری دلکشی اور آب و رنگ، غیر ہندو قومیتوں اور غیر ہندو مذاہب کی وجہ سے قائم ہے۔ یہ قومیتیں درمیان سے نکل جائیں تو یہی مسئلہ طے نہ ہو پائے گا کہ ہندو راج سناتن دھرمیوں کے اقتدار میں قائم ہوگا، یا آریہ سماجیوں کے ــــ اور اس اقتدار میں شمالی ہندوستان کے ہندوؤں کے معتقدات کا غلبہ ہوگا یا جنوب کے ہندوؤں کے فکر و خیال کا ــــ اور یہ کہ اس راج کی سرکاری زبان ہندی ہوگی یا انگریزی بولنے والے ہندوؤں کے نظریات اس مسئلہ پر قطعی اور آخری ثابت ہوں گے ــــ اور یہ کہ اس راج میں سرکاری مذہب مورتی پوجنے والوں کا مذہب ہوگا یا مورتی کھنڈن کرنے والوں کا۔ اس کا ایک نمونہ تو پاکستان میں دنیا دیکھ ہی رہی ہے، جہاں اسلام کے سرکاری مذہب پر سب کا اتفاق ہے لیکن اس کی تعبیر و تعریف مختلف طبقوں اور مختلف پارٹیوں کی طرف سے اتنے مختلف انداز میں کی جاتی ہے کہ صاف طور پر محسوس ہونے لگتا ہے کہ پیپلز پارٹی کا اسلام اور ہے، مسلم لیگ کا اور ہے، جماعت اسلامی کا اسلام اور ہے، اور حکمراں مسلم لیگ کا اسلام اور دیوبندی عقائد کے لوگوں کا اسلام اور ہے، بریلوی جماعت سے متعلق لوگوں کا اور ــــ نتیجہ یہ ہے کہ ملک پر اسلامی نظام کے نفاذ سے زیادہ متنازعہ وہاں کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے۔

جن قوموں کے سیاسی نظاموں کو کامیاب اور مستحکم سمجھا جاتا ہے وہ بھی نظریاتی تضاد کا اسی درجہ شکار ہیں کہ ان کے دعووں اور نظریاتی اعتبار

کا سارا معاملہ مشکوک دکھائی دینے لگتا ہے، مثال کے طور پر روس کے کمیونسٹ نظام میں جس کی بنیاد ہی مزدوروں کی پرولتاریت اور اقتدار کے نظریہ پر قائم ہے اور جو مزدوں کے ہڑتال اور زیادہ بہتر زندگی کے حق کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے، اس کے اپنے اور حلقہ اقتدار میں آنے والے ملکوں میں مزدوروں کو ہڑتال کا حق حاصل نہیں ہے، وہ ساری دنیا میں مزدور تنظیموں کی جدوجہد اور ان کے ہڑتال کے حق کی حمایت کرتے ہیں، لیکن لیخ والیسا کے ہڑتال کے حق کے مطالبہ کا جواب، وارسا میں فوجی کارروائیوں اور ٹینکوں کے استعمال کے ذریعہ دیتے ہیں، ساری دنیا میں قوموں کے حق خوداختیاریت کی تائید کرتے ہیں لیکن ہنگری، پولینڈ، چیکوسلاویکیہ اور افغانستان کے لوگوں کو حق خوداختیاریت دینے پر کسی طرح تیار نہیں ہوتے۔ ان کے مقابلہ میں مغربی ملکوں میں جہاں مساوات، جمہوریت اور قوموں کو آمریت سے آزاد کرانے کا موقف اتنا مستحکم ہے کہ وہ اس کو جمہوری اور آزاد نظام کی کامیابی کا ثبوت اور اس کی ضمانت قرار دیتے ہیں، کمزور ملکوں کو ڈپلومیسی، تجارت اور قرضوں کے جال میں پھنسا کر بے بس اور محکوم بنانے کے منصوبے دھڑلے کے ساتھ روبہ عمل لائے جاتے ہیں، اور ان ملکوں کی حقیقی نمائندہ حکومتوں کو گرا کر اپنی آلۂ کار حکومتیں قائم کرنے کی سازش دن رات چلتی رہتی ہے۔

ہندوستان میں جہاں سب طبقوں، تمام مذاہب اور تمام فرقوں کے لئے مساوی سلوک اور مساوی مواقع کے اصول پر جمہوریت قائم ہوئی تھی، تھوڑی دور آگے چل کر ہی، سیکولرازم اور جمہوریت کا نقشہ اس لئے دھندلا پڑ گیا کہ لوگ پرانے جاگیرداری نظام سے اپنا ذہنی رشتہ توڑنے کے لئے تیار نہ تھے، اور حکومت کو بدستور، ایک ایسی چیز سمجھتے تھے، جو راجاؤں اور بادشاہوں کی طرح ہر اختیار اور ہر طرح کے وسائل کی بلاشرکت غیرے مالک ہو۔ اس جاگیرداری اور شہنشاہی ذہنیت

کالازمی نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کو خود اپنی ملکیت سمجھنے کا تصور عوام سے مفقود ہو گیا، اور وہ حکومت میں شرکت کے جذبہ کے بجائے، حکومت کو اپنے سے الگ، بلکہ اپنے اوپر حاکمیت قائم کرنے والا ایک ادارہ سمجھنے لگے، اور اس طرح وہ ایک ایسی ذہنی کیفیت کا شکار ہو گئے جس میں حقوق کے مطالبہ اور مراعات کے حصول کا جذبہ غالب اور فرائض کا احساس اور ذمہ داریوں کا خیال اس طرح مغلوب و معدوم ہو کر رہ گیا کہ آج اس کا نشان تک بھی عوامی نقل و حرکت اور سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں دکھائی نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ کہنے کو تو ہندوستان میں دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت قائم ہے لیکن عملی طور پر، اور ذہنی طور پر یہاں کے عوام اٹھارھویں صدی کے ماحول میں رہ رہے ہیں، اس ذہنی انتشار کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں عام انسانی زندگی، بے اطمینانی، بدنظمی اور ایسی مشکلات کا شکار ہو گئی ہے کہ کسی جگہ سکون اور دل جمعی کا نشان نہیں رہا۔

اسلام و سائنس

مولانا عبدالرؤف جھنڈانگری (نیپال)

حق تعالیٰ نے انسان کو دماغ دے کر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت بخشی۔ مگر تنہا دماغ کافی نہیں ہے کیونکہ اس کو علم کی ضرورت ہے جیسے آنکھیں دیکھنے کی صلاحیت دی گئی ہے مگر تنہا آنکھ کافی نہیں ہے کیونکہ اس کو خارجی روشنی کی ضرورت ہے۔ روشنی کے بغیر کوئی آنکھ اس کو دیکھ نہیں سکتی۔ چنانچہ رات کے وقت ایک تاریک کمرہ میں آنکھ رکھتے ہوئے بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر بجلی کا بلب روشن کر دیا جائے تو ہر چیز صاف نظر آنے لگتی ہے۔ اسی طرح وحی الٰہی دماغ اور عقل کے لئے روشنی ہے، اس روشنی کے بغیر ہم تنہا دماغ سے اشیاء کی معرفت حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ کائنات کیا ہے؟ اس کا خالق و مربی کون ہے؟ اور اس کائناتی نظام کا سلسلہ کب تک رہے گا؟ اس کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ انسان کا فائدہ کس چیز میں ہے؟ نقصان کس چیز میں ہے؟ یہ سب باتیں وحی الٰہی سے معلوم ہوتی ہیں، علم الٰہی کے بغیر جو لوگ حقائق اشیاء معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ سب بھٹکتے رہتے ہیں۔

اس علم الٰہی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو خدا شناس بناتی ہے۔ ایک مثال پر غور کیجئے کہ ایک آدمی کسی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر موجود ہے لیکن وہاں روشنی نہ

لائٹ کا گزر نہیں ہے تو تاریکی میں اس کو اپنے چچا، استاذ، والد نظر نہیں آتے ہیں۔ حالانکہ اتفاق سے وہ لوگ بھی پلیٹ فارم پر موجود ہوتے ہیں۔ لیکن اگر روشنی ہوتی تو سبھی لوگ نظر آتے اور وہ شخص ان کی مناسب تکریم و خدمت بجالاتا۔ اسی طرح دماغ کی روشنی علم الٰہی ہے اس علم و معرفت کے بغیر آدمی اپنے رب کی اطاعت و عبادت کو بجا نہیں لا سکتا کیونکہ وہ اپنے رب کو پہچانتا ہی نہیں تو اطاعت و خدمت کیسے بجالا سکے گا اس لیے علم کی تحصیل ضروری ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں پڑھتے تھے۔ "رَبِّ زِدْنِی عِلْماً" (سورۂ طٰہٰ) یعنی اے میرے رب ہمیرے فہم و بصیرت میں علم کے ذریعہ زیادتی پیدا کر۔

اس قرآنی دعا کو ہم بھی اپنا وظیفہ بنائیں تاکہ صحیح علم حاصل ہو اور ہم خداشناس بن سکیں۔ شیخ سعدی شیرازی نے کیا ہی خوب لکھا ہے ؎

پئے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

علم کی فضیلت وجدانی ہے

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ علم کے محمود و مستحسن ہونے کا فیصلہ خود وجدان سے ہو جاتا ہے چنانچہ دیکھیے کہ آپ جاہل مطلق ہوں لیکن آپ کو حسب واقعہ کوئی جاہل کہہ کر خطاب کرے تو آپ کو بُرا لگے گا کہ دیکھو فلاں شخص مجھ کو جاہل کہتا ہے۔ لیکن آپ کی جہالت کے باوجود کوئی آپ سے کہے کہ آپ بڑا اچھا علم رکھتے ہیں آپ کے علم و فہم کا کیا کہنا۔ تو اگرچہ آپ جاہل مطلق ہوں پھر بھی اس کا یہ کہنا آپ کو اچھا معلوم ہوگا۔ کیونکہ اس نے علم کی طرف آپ کی نسبت کردی اس لئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ علم کے انتساب کو ہر انسان اپنے لئے وجہ عظمت اور باعثِ فضیلت جانتا ہے۔

خداشناسی بغور دیکھئے! زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے اور ہوا، بارش وغیرہ کے فوائد و منفعت ہمیں حاصل ہو رہے ہیں، دنیا کی ایک معمولی سی چیز حتی کہ ایک سوئی تک بھی ہمیں مفت نہیں مل سکتی مگر یہ ہماری عظیم الشان خدمت کرنے والے، سورج، چاند، ستارے ہمارے غلہ پکانے والے، اور اس میں دودھ، خوشبو، مزہ، رنگ وغیرہ ڈالنے والے سارے عملے ہماری مفت خدمت انجام دے رہے ہیں۔ شیخ سعدیؒ اسی حقیقت کی طرف ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری
ایں ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار
شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نبری

دنیا کا قاعدہ ہے کہ احتیاج طرفین سے ہوتا ہے ہم دھوبی کے محتاج ہیں کہ وہ ہمارے کپڑے صاف کرے۔ دھوبی ہمارا محتاج ہے کہ ہم سے پیسے لے۔ ہم معمار کے محتاج ہیں کہ وہ مکان تعمیر کرے وہ ہمارا محتاج کہ ہم سے پیسے حاصل کرے۔ ہم ڈاکٹر کے محتاج کہ وہ ہمارا علاج کرے اور وہ ہمارا محتاج ہے کہ ہم سے پیسے حاصل کرے اس طرح کی صدہا مثالیں ہیں۔ یہاں قاعدہ الٹ گیا۔ یہاں احتیاج! صرف ایک طرف سے ہے ہم ان تمام چیزوں، آسمان، زمین، سورج، چاند، ستارے، ہوا، بارش وغیرہ کے محتاج ہیں۔ مگر یہ چیزیں ہماری ذرہ بھر محتاج نہیں ہیں۔ ہم نہ ہوں گے جب بھی یہ ساری چیزیں اپنے فیوض کو جاری رکھیں گی ؎

دریغا کہ بے مایۂ روزگار
بروید گل و بشگفد لالہ زار

یہاں انصاف کیجئے کہ جب ہم ایک سوئی اور ایک قلم بلا دام نہیں پاسکتے تو اتنی عظیم الشان اور ضروریات زندگی کی اتنی اہم چیزیں ہمیں مفت اس فیاضی اور پوری طرح کے نظم کے ساتھ بلا ناغہ کون دے رہا ہے؟ حکومت سڑک بناتی ہے تو ٹیکس لیتی ہے۔ پانی کا انتظام کرتی ہے تو ٹیکس لیتی ہے۔ بجلی و روشنی فراہم کرتی ہے تو ٹیکس لیتی ہے۔ الیکٹرک پنکھوں کی سپلائی پر ٹیکس لیتی ہے۔ مگر چاند، سورج اور کھربوں ستاروں کی روشنی اور فیوض پر اور آسمان کے مسلسل پانی اور باران رحمت کے نزول پر ہوا ول کے سرد و خنک جھونکوں پر کسی قسم کا آج تک کوئی ٹیکس نہیں لگایا گیا تو جس ذات نے بلاعوض بلاٹیکس یہ فیض جاری کر رکھا ہے۔ ہم اسی کو خالق کائنات رب العالمین اور خدائے برحق سمجھتے ہیں اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہتے ہیں۔ اور صرف وہی اطاعت کے لائق ہے ارشاد ہے: لا تسجدو للشمس ولا للقمر واسجدوا للہ الذی خلقھن ان کنتم ایاہ تعبدون (سورۂ حٰم سجدہ) یعنی چاند سورج کی پرستش نہ کرو۔ بلکہ اس ذات کی پرستش کرو جس نے ان کو پیدا کیا۔ اگر تم اطاعت کرنا چاہتے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ چاند و سورج کے فوائد و فیوض کو دیکھ کر تم یہ نہ سمجھو کہ ان کے یہ ذاتی فیوض ہیں۔ بلکہ یہ فیوض و فوائد ان چیزوں میں ان کے خالق و مالک نے رکھا ہے اس لئے مستحق عبادت صرف ان کا خالق ہی ہے۔ کسی نے کیا ہی خوب لکھا ہے ؎

خرد اور ادراک رنجور ہیں واں
مہ و مہر ادنیٰ سے مزدور ہیں واں
جہاں دار مغلوب و مقہور ہیں واں
نبیؐ اور صدیقؓ مجبور ہیں واں

نہ پرستش ہے رہبان و احبار کی واں
نہ پروا ہے اخیار و ابرار کی واں

چاند و سورج کائنات میں خدا کے احکام کے تابع ہیں اور پھر کسی طرح بھی کوئی ذاتی اختیار نہیں رکھتے۔ خدا جب چاہتا ہے انھیں گہن میں ڈال دیتا ہے۔ ان کی روشنی مدھم پڑجاتی ہے۔ یہ ان کے مخلوق و مملوک ہونے اور خالق کائنات کی عظمت و جلالت اور قدرت مطلقہ پر ایک واضح دلیل ہے۔

زمین کے فوائد پر غور

ارشاد باری ہے: والارض فرشنا ھا فنعم الماھدون۔ یعنی ہم نے ہی زمین کو بچھایا اور ہم اچھے ہموار کرنے والے ہیں۔

دیکھئے زمین نہ ہوتی تو رہائش و آسائش کے لئے ہمارے مکانات اور کوٹھیاں اور بلڈنگیں کس چیز پر کھڑی ہوتیں، زمین نہ ہوتی تو کہاں ہمارے کاروبار کے لئے فیکٹریاں، ملیں اور کارخانے قائم ہوتے۔ زمین نہ ہوتی تو کہاں ہمارے آم کے باغات ہوتے۔ انار، سیب، انگور، اخروٹ اور بادام وغیرہ فروٹ و پھل کہاں سے حاصل ہوتے۔ زمین نہ ہوتی تو گلاب، چمیلی، جوہی وغیرہ کے درخت کہاں لگتے اور ہم طرح طرح کے خوشبو، عطریات و زعفران کہاں سے حاصل کرتے۔ زمین نہ ہوتی تو ہماری کھیتیاں کہاں ہوتیں۔ چاول، گیہوں، مٹر، چنا وغیرہ اناج ہم کس طرح حاصل کرسکتے۔ زمین نہ ہوتی تو ہمارے کنوئیں، پوکھر، تالاب، آبشار کہاں ہوتے؟ ہم کو اور ہمارے جانوروں کو پانی کہاں سے میسر آتا؟ پھر اس سے حاصل کردہ بجلی کیسے مل سکتی؟ جس سے سارے کارخانوں اور ملوں میں رونق ہے۔ زمین نہ ہوتی تو مریضوں کے اسپتال، شفاخانے کہاں ہوتے؟ اور دوائیں کہاں رکھی جاتیں، آپریشن روم کہاں ہوتا؟ مریضوں کے بستر کہاں لگتے؟ اور پھر یہ زمین نہ ہوتی تو ہماری دوائوں کے لئے جڑی بوٹیاں

کہاں پیدا ہوتیں؟ اور دواؤں میں کام آنے والے پھل، پھول، پتے، پتیاں، سنبل الطیب برگ، سنار، شاہترہ وغیرہ کس طرح حاصل ہوتے۔ یہ زمین نہ ہوتی تو علمی کارخانے، سائنسی لیبورٹری، اور یہ یونیورسٹیاں، دارالعلوم اور کالجز، اور اسکول کہاں قائم ہوتے؟ زمین نہ ہوتی تو ڈاک خانے کہاں قائم ہوتے اور اخبارات ورسائل دنیا بھر میں کیسے بھیجے جاتے؟ زمین نہ ہوتی تو اسٹیشن کہاں اور کس پر قائم ہوتے اور پورے ملک میں ہم سفر کس طرح کرتے؟

یہ زمین نہ ہوتی تو ہوائی جہازوں، خلائی راکٹوں، ہیلی کوپٹروں کے لئے ہوائی اڈے کہاں بنائے جاتے؟ اور ہم بین الاقوامی سفر اور ممالک غیر کی سیاحت کیسے طے کرتے؟ یہ زمین نہ ہوتی تو ہمارے عدل وانصاف کے لئے عدالت گاہیں اور سرکاری عمارت کہاں قائم ہوتی؟ زمین نہ ہوتی تو ہمارے اکتشافات وایجادات، تحقیقات اور ریسرچ کے لئے محفوظ کمرے اور معمل کہاں قائم ہوتے؟ اور یہ زمین نہ ہوتی تو گائے، بھینس اور مویشیوں کے لئے چراگاہیں کہاں ہوتیں؟ اور گھاس وچارہ کی چیزیں کہاں میسر ہوتیں؟ پھر دودھ، کھویا، بالائی، مکھن اور گھی جیسی نعمتوں سے ہم محروم ہی رہ جاتے۔ زمین نہ ہوتی تو لکڑی وغیرہ کے درخت کہاں لگتے؟ اور پھر ہماری عمارتیں کیسے بنتیں؟ اور ہم جلانے کے لئے ہم لکڑی کہاں سے لاتے؟ زمین نہ ہوتی تو ہم لوہا کہاں سے حاصل کرتے؟ کھیتی کے لئے آلات ٹریکٹر وغیرہ کس سے بنتے؟ ہماری عمارات کے لئے گارٹر وغیرہ کس چیز سے بنتے؟ اگر یہ زمین نہ ہوتی تو ہم ربڑ کہاں سے حاصل کرتے اور ربڑ کی یہ ساری مصنوعات ٹائر، ٹیوب وغیرہ کیسے میسر آتیں؟ اگر یہ زمین نہ ہوتی تو ہم تیل، پٹرول وغیرہ کیسے پاتے؟ یہ سارے خزانے تو زمین کے پیٹ میں دفن ہیں ان کے بغیر ہمارا گزر کیسے ہوتا؟ اگر یہ زمین نہ ہوتی تو یہ پہاڑ کس پر قائم ہوتے ہوتے اور طرح طرح کے پتھر سنگ موسیٰ وسنگ مرمر وغیرہ ہم کہاں سے

حاصل کرتے؟ جن پر آج اچھی اچھی عمارتوں کی رونق وقوت ہے۔ اگر زمین نہ ہوتی تو ہم دنیا بھر کے انجنوں، کارخانوں اور مشینوں کے لیئے کوئلہ کہاں سے پاتے؟ جبکہ کوئلہ کا سارا خزانہ زمین کے بطن میں دفن ہے۔ زمین نہ ہوتی تو ہم روئی کہاں سے حاصل کرتے اور ہمارے کپڑے کیسے بنتے؟ زمین نہ ہوتی، تو ہمارے بھیڑ و دنبے کہاں پرورش پاتے؟ اور ان کے بغیر ہم اونی کپڑے کیسے تیار کر سکتے؟ زمین نہ ہوتی تو ریشم کے کیڑے کہاں پیدا ہوتے؟ اور ان کے بغیر ہم ریشمی کپڑوں کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے اگر زمین نہ ہوتی، تو سونا وچاندی کی کان اور لعل وگہر کے معدن کہاں ہوتے؟ اور سارے عالم میں جو کاروبار روپیوں اور اشرفیوں کے ذریعہ چلتے ہیں وہ کس طرح انجام پاتے؟ اگر زمین نہ ہوتی تو یہ کاغذ کے درخت اور اس کے کچے سامان کہاں بنتے؟ اور پھر کاغذ کے بغیر ساری دنیا میں علمی وتصنیفی کاموں کا کس طرح کال ہوتا؟ اور آج ہزاروں، لاکھوں اوراق جو طرح طرح کے کاغذوں پر چھپتے ہیں ان کا کس قدر فقدان ہوتا؟

الغرض زمین نہ ہوتی تو سارے عالم کی رونق ہی یکدم کافور ہوجاتی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس زمین کو کس نے بنایا۔ کس نے اس کا فرش بچھایا؟ کس نے اس کو ڈانواڈول اور اضطراب سے محفوظ رکھا اور پرسکون بنایا؟ ہم اس بنانے والے فاطر السماوات والارض کا نام خدا رکھتے ہیں۔ سچ فرمایا ہے خدا تعالیٰ نے وَفِی الْاَرْضِ اٰیَاتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ۔ یعنی اصحاب علم ویقین کے لیئے زمین ہی میں معرفت رب کی بہت سی نشانیاں ہیں۔ آج کے سائنس دانوں میں بایں ہمہ اکتشافات و ایجادات یہ طاقت نہیں ہے کہ خدائی کائنات سے کچھ لئے بغیر صرف ایک چٹکی دھول بنادیں۔ یا ایک گز زمین ہی بنا کر دکھادیں۔ ہرگز نہ کبھی بنا سکے ہیں اور نہ بناسکیں گے۔ اس کا خالق صرف خداوند کریم ہے اور وہ رب العالمین بھی ہے۔

علّت مؤثرہ زمین نہیں لیکن زمین میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ انار، سیب، گلاب اور موتیا پیدا کرے۔ رنگ برنگ کی چیزوں اور مختلف خواص کی دواؤں کو پیدا کرے۔ ان تمام پیداواروں کے لئے زمین علت و سبب مؤثر نہیں ہے بلکہ زمین تو صرف ایک معدن و مخزن ہے اور منبع و مخرج ہے نہ کہ علت و سبب، اصل سبب مؤثر تو خدا ہے۔ اس لئے کہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ شکر بنانے والی مشین سے صرف شکر برآمد ہوگی۔ اور بسکٹ والی مشین سے صرف بسکٹ اور کاغذ ساز مشین سے صرف کاغذ برآمد ہوتا ہے۔ لیکن یہ زمین تو مختلف اجناس، مختلف پھول، مختلف پھل، مختلف رنگ اور مختلف خواص کی چیزوں کو جنم دیتی ہے۔ کسی عارفِ خدا نے زمین کے اس خاصہ کے متعلق کیا ہی خوب لکھا ہے ؎

چرا در یک زمیں چندیں نباتِ مختلف بینم
ز نخل و انار و سیب و بید و چوں آبی و چوں زیتوں
اگر علت طبائع شد وجود جملہ را چوں شد؟
یکے ممسک یکے مسہل یکے دارو یکے طاعوں

معلوم ہوا کہ ان مختلف پیداواری کے لئے زمین علت مؤثرہ نہیں ہے بلکہ ایک اور ہی طاقت ہے جو زمین کے بطن سے مختلف خواص اور مختلف ذائقوں، مختلف قابلیتوں اور مختلف منافع کی چیزوں کو پیدا کرتی ہے۔ اسی کا نام ہم خدا رکھتے ہیں۔

قدرت کا کمال سائنس کی بنائی ہوئی مشینوں میں ایک من گیہوں یا چنا یا مٹر ڈال دیجئے تو ایک من آٹا نکال کر دے گی۔ لیکن خداوند کریم کی ایک زبردست و پر حکمت مشین ہے اس کا نام زمین ہے اس میں ایک دانہ ڈال دیجئے تو سینکڑوں دانے باہر نکال دیتی ہے۔ ایک من دانہ

ڈال دیجئے تو سینکڑوں من دانہ پیدا کر دیتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضاعف لمن یشاء واللہ واسع علیم ○ (سورہ بقرہ)

یعنی ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانہ کی طرح ہے جس نے اس دانہ سے سات بالیوں کو اگایا اور ہر بالی میں سو دانہ ہے اور جسے اللہ چاہتا ہے اس سے بھی بڑھا دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا اور بڑے علم والا ہے۔

پوری خلق خدا اس کی زمین سے بیش بہا فوائد اٹھا رہی ہے اور ساری مخلوقات کی زندگی اور شاہ و گدا کے عیش کا مدار زمین اس بے پناہ پیداوار اور بے حد و بے حساب خیر و برکت پر ہے اقبال مرحوم نے کیا خوب لکھا ہے ؎

کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ
یہ زمیں کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
موتیوں سے کس نے بھر دی خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلایا ہے خوئے انقلاب؟

دہ خدا، یا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

پہاڑوں کے بطن سے زور و شور کے ساتھ دن رات بہنے والے چشمے، یہ ناپیدا کنار سمندر، یہ فلک بوس اور عظیم المنافع پہاڑ اور قدرت کے

خزانوں سے یہ مالا مال جنگلات، یہ پٹرول کے چشمے، یہ سونے، چاندی کے دفائن ارض سب خدا کی بے پناہ بخشش اور انعام اور بے حد و بے حساب فیاضی کو یاد دلانے کے لئے کافی وافی ہیں ان فی ذالک بعبرۃ لاولی الابصار۔

تخلیق انسانی پر غور ارشاد ہوتا ہے وفی انفسکم افلا تبصرون یعنی اپنے نفسوں میں غور کیوں نہیں یعنی آدم کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا اور اپنی قدرت سے اس میں روح ڈالی اور حضرت حوا کو پیدا فرما کر پھر ماں باپ کے نطفہ سے انسان کا سلسلہ قائم کیا۔ مقام غور ہے۔ اور خاص طور پر جدید دنیا کے لئے بھی ...... جو موٹر، ہوائی جہاز، تار، ٹیلیفون، ریڈیو وغیرہ ایجاد کرتی ہے کہ یہ سب چیزیں انسان کی پیدائش اور اس کی کاریگری کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ موٹر یا ہوائی جہاز یا دوسری مشینوں اور انجنوں وغیرہ میں لوہے وغیرہ کے ہزاروں پرزوں کو پیٹ پاٹ کر، ڈھال ڈھول کر اور مختلف مقامات میں جوڑ جاڑ کر پٹرول اور ڈیزل اور کروڈ آئل وغیرہ ان کی نالیوں میں پہونچا کر اس کو دوڑایا، چلایا اور اڑایا کرتے ہیں۔ یہ سب انسانی صنعت سے پیدا ہوتی ہیں اور ان کے پلاسٹک پرزوں کے خراب ہونے پر دوسرے پرزے بدل کر کام نکالا کرتے ہیں۔ مگر منی کے ایک تولہ ڈیڑھ تولہ پانی پر اس طرح کاریگری کرنا اور اس کے تمام اعضاء و لوازمات کے ساتھ جیتا جاگتا انسان بنانا قدرت کا شاہکار ہے۔ ذرا دیکھئے کہ منی کے نطفہ میں سے سر کی کھوپڑی بنائی جو کتنی سخت ہڈی ہے اور اسی نطفہ سے سر کا بھیجہ اور دماغ کی گودی بنائی جو کتنی نرم و ملائم ہے۔ پھر دماغ میں سیکڑوں تاروں کا کنکشن ڈالا اور اس میں چمکتی ہوئی آنکھ بنائی پھر اسی نطفہ سے بولنے والی بلبل ہزار داستان زبان بنائی۔ حرکت و نطق کے زیر و بم پیدا کرنے کے لئے دو ہونٹ عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم الشان کاریگری کو یاد دلاتے ہوئے فرمایا: الم نجعل لہ عینین ولسانا و شفتین

یعنی کیا ہم نے اُن کے لئے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے ایک اور جگہ ارشاد ہے: انا خلقنا الانسان من نطفۃ امشاج نبتلیہ فجعلناہ سمیعا بصیرًا (دھر)

یعنی ہم نے انسان کو مرکب القوی نطفہ سے پیدا کیا کہ اس کی آزمائش کریں پس ہم نے اس کو دیکھنے والا اور سننے والا بنایا۔ ذرا غور کیجئے کہ اس نطفہ سے خدا نے دل، جگر، گردہ، مثانہ بنایا۔ اس نطفہ سے معدہ کے دیگر تمام اعضاء و احشاء بنائے اور اس میں اتنی زیادہ رگ اور باریک نسیں اور ریشے بنائے جن میں روزانہ خون جذب ہوتا ہے اگر ان تمام رگ و ریشوں کو ایک قطار میں کر دیا جائے تو بقول ایک فرنگی محقق کے نوسو اسی میل لمبی لائن تک یہ پہونچ جائے گی۔ پھر اسی نطفہ سے اعضاء رئیسہ بنائے۔ وہ دل بنایا کہ اگر وہ بگڑ جائے تو دوسرا دل نہ بنایا جا سکے اور اگر اس کی حرکت بند ہو جائے تو پھر اس میں حرکت نہ پیدا کی جا سکے۔ اعضاء رئیسہ کے علاوہ دوسرے اعضاء کا بھی یہی حال ہے اگر آنکھ ضائع ہو جائے تو دوسری آنکھ نہ مل سکے۔ اگر زبان گونگی ہو جائے تو دوسری زبان نہ بن سکے۔

الغرض ایک تولہ ڈیڑھ تولہ منی کے نطفہ میں خالق اکبر نے تمام ضروری طاقتوں اور صلاحیتوں کو پیدا فرمایا پھر خدا نے چاہا تو نر بنایا اور چاہا تو مادہ بنایا چنانچہ ارشاد ہے: الم یک نطفۃ من منی یمنی ثم کان علقۃ فخلق فسوی فجعل منہ الزوجین الذکر والانثی الیس ذالک بقادر علی ان یحیی الموتی (سورۂ قیامہ)
یعنی کیا انسان کو منی کے نطفہ سے نہیں بنایا جو پہلے گوشت کا لوتھڑا بنا پھر اس میں تمام اعضاء کو پیدا کیا پھر اس کو سیدھے قد کا بنایا پھر اس سے نر و مادہ کے جوڑا حسب منشاء بنایا۔ پھر ایسا زبردست کاریگر اور قادر مطلق کیا اس پر قادر نہیں ہے کہ مرنے کے بعد پھر انسان کو زندہ کرے۔ شیخ سعدی نے ا[illegible] تخلیق انسانی پر

کیا خوب لکھا ہے ؎

دہد نطفہ را صورتے چوں پری
کہ کردہ است برآب صورت گری؟
ازاں قطرہ لولوء لالا ر کند
وزیں صورتے سرو بالا کند

پانی پر یہ بے مثال کاریگری خدائے مطلق کے علاوہ کیا کوئی اور بھی کرسکتا ہے؟ حاشا وکلاّ۔

نطفہ تخلیق انسانی کے لئے علت مؤثرہ نہیں

اس نطفہ سے انسان ضرور ہی پیدا ہو جائے ایسا ضروری نہیں ہے کیونکہ اصل سبب مؤثر خود اللہ تعالیٰ اور اس کی مشیت ہے ایسا دیکھا گیا ہے کہ باہم نطفہ ملتا ہے مگر نہ لڑکا پیدا ہوتا ہے اور نہ لڑکی اور کبھی دونوں پیدا ہوتے ہیں اور کبھی صرف لڑکا اور کبھی صرف لڑکی۔ چنانچہ ارشاد ہے:

للہ ملک السماوات والارض یخلق مایشاء ویھب لمن یشاء اناثا ویھب لمن یشاء الذکور اویزوجھم ذکرانا واناثا ویجعل من یشاء عقیما ہ (سورۂ شوریٰ)

یعنی خدا ہی کے لئے زمین و آسمان کی بادشاہت ہے اور جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکا ہی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں دونوں عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے۔

پھر یہ نطفہ تمام اعضاء کی سلامتی کا ضامن بھی نہیں ہے کیونکہ انسان کبھی اندھا اور کبھی بہرا اور کبھی لولا، لنگڑا بھی پیدا ہوتا ہے اور کبھی کبھی کچا لوتھڑا بن کر ساقط

ہوجاتا ہے اور کبھی بے جان اور مردہ پیدا ہوتا ہے تاکہ معلوم ہوجائے کہ یہ نطفہ روح کے لئے یا جسمانی اعضاء کی صحت وسلامتی کے لئے مؤثر نہیں ہے بلکہ مؤثر اس کی مشیت ہے۔

کائنات عالم کے لیئے انسان کی ضرورت

موٹر، ہوائی جہاز، تار، ٹیلیفون، کارخانے، فیکٹریاں، ملیں، ریلیں، ٹرین، سب بے کار اور ایک قلم معطل ہوجائیں۔ اگر ان کا بنانے والا انسان اور ان کو حرکت میں لانے والا انسان درمیان سے حذف ہوجائے۔

انسان جس روز صفحۂ ہستی سے ختم ہوجائے گا تو یہ تمام مصنوعات، ایجادات اور کارخانے، مشنریاں، فیکٹریاں سب لغو محض ہوجائیں گی۔ اور غور کیجئے ایک مثال کو سامنے رکھئے۔ ٹیلیفون سے آپ بات کرتے ہیں۔ اور مدراس میں بیٹھکر کلکتہ بمبئی سے گفتگو کر لیتے ہیں اور خوش ہوجاتے ہیں کہ سائنس کے کمال سے آپ کو کس قدر فائدہ پہونچ رہا ہے۔ لیکن قدرت کے عطیہ کو بالائے طاق رکھ کر قدرت کی اس عظیم کاری گری کو بھول جاتے ہیں۔ سوچئے کہ اگر طرفین سے بولنے والی زبان اور سننے والے وہ کان نہ ہوں تو وہ ٹیلیفون ہے کس کام کا۔ ٹیلیفون آپ کی میز پہ رکھا ہوگا اور کسی کام کا نہ ہوگا۔ مگر جب آپ ہاتھ سے اٹھاتے ہیں اور ہیلو، ہیلو اپنی زبان سے پکار کر اپنے کان سے اس کی بات سنتے ہیں تو یہ ٹیلیفون کارآمد بن جاتا ہے اور دونوں طرف سے زبان، کان اور ہاتھ اور دل کا ارادہ اور دماغ کی سلامتی کام کر رہی ہے جو قدرت کے ان شاہکاروں پر غور کرے گا اُسے یہ ایجاداتِ عادۃ متحیر نہیں کر سکتیں۔ اکبرؔ الہ آبادی مرحوم نے کیا ہی خوب لکھا ہے ؎

جو ہے محو تاروں کی چال کا اسے انجنوں کا خیال کیا
وہ نظر زمیں پہ کیوں جھکے کہ جو آسماں سے قریب ہے

معلوم ہوا کہ کائنات عالم کے لئے خود حضرت انسان بھی بیحد ضروری مخلوق ہے۔

ایک تمثیل

دراصل انسان نہ ہو تو ایک ذرا سا کام بھی موجودہ صنعتی ومشینی دور میں انجام نہ پا سکے۔ انسان اگر درمیان سے اُٹھ جائے تو دنیا ومافیہا کے سارے کارخانے بیکار، خلائی راکٹوں کی اڑان ختم، چاند تک رسائی بے معنی۔

کسی نے یہ لطیفہ بیان کیا ہے کہ شاہجہاں کے پاس دو کنیزیں تھیں ایک کا نام "جہاں" تھا دوسرے کا نام "حیات" تھا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ تم دونوں میں سے میرے لئے زیادہ کار آمد کون ہے۔ جس کا نام "جہاں" تھا اس نے برمحل عرض کیا ؎

تو بادشاہ جہانی جہاں بکار آید

دوسری کنیز نے جس کا نام "حیات" تھا فی الفور کہا ؏

اگر حیات نہ باشد جہاں چہ کار آید

بظاہر یہ ایک لطیفہ ہے مگر اس میں حقیقت کا ایک خزانہ پنہاں ہے۔ دنیا میں سب کچھ ہو مگر انسان نہ ہو تو ان چیزوں کو برتنے والا ان کو استعمال کرنے والا ان سے فائدہ اٹھانے والا اور ان کو کار آمد بنانے والا کون ہوگا؟

سائنس نے کوئی بنیادی چیز پیدا نہیں کی

اب اس پر بھی غور کیجئے کہ خداوند کریم نے غلہ، اناج، گیہوں، مٹر، چنا، چاول، دال وغیرہ پیدا کیا، مگر سائنس والے اب تک کوئی غلہ نہ بنا سکے، خداوند کریم نے انار، سیب موسمی، کیلا، اخروٹ اور بادام پستہ، فروٹ وغیرہ بنایا ہے۔ طرح طرح کے مغزیات دنیا کو عطا فرمائے ہیں۔ سائنس دالوں نے اس قسم کا کوئی نیا پھل اور مقویات و مغزیات میں سے کوئی نئی چیز تیار نہیں کی۔

دنیا کے یہ معروف غلے اور یہ فروٹ چھوڑ کر سائنس والے اپنے ایجاد کردہ کسی پھل اور کسی بنائے ہوئے غلے کی نشاندہی تو فرمائیں۔ یہ نہ اُن کے دائرہ اختیار کی چیز ہے

اور نہ کسی ایسی چیز کی تخلیق کے لئے ان کا دعویٰ ہے۔ خالق کائنات نے ایسا دعویٰ کیا ہے اس کو اس کا حق بھی ہے: فلینظر الانسان إلی طعامہ، انا صببنا الماء صبًا، ثم شققنا الارض شقًا، فانبتنا فیھا حبًا و عنبا و قضبا و زیتونا و نخلا و حدائق غلبا و فاکھۃ و ابًا متاعا لکم و لانعامکم (سورۂ عبس)

یعنی آدمی کو اپنے کھانے کی طرف دیکھنا چاہیئے کہ ہم نے زمین پر پانی ڈالا اور پھر زمین کو پھاڑ دیا پھر ہم نے اناج کے دانے اگائے اور انگور، ترکاری اور زیتون اور کھجوریں اگائے اور گھنے باغات، میوہ جات اور چارے پیدا کئے جس میں تمھارے اور تمھارے چوپایوں کے لئے فائدہ ہے۔

پھر جب قدرت کے عطا کردہ غلوں اور اس کے پیدا کردہ پھلوں اور مقویات و فواکہات کو ہم کھاتے اور انھیں سے فائدہ اٹھاتے ہیں پھر تو ہم کو اس کے سامنے سر نیاز و سر عبودیت خم کرنا چاہیئے اور صاف صاف شکریہ ادا کرنا چاہیئے اور اس کی آقائی کا دم بھرنا چاہیئے۔

تیرا دیا کھاتا ہوں میں تیری ثنا گاتا ہوں میں
تیرا ہی کہلاتا ہوں میں تجھ بن نہیں کوئی مرا

دنیا میں کبوتر، مرغ، تیتر، بٹیر اور دوسری چڑیوں کے علاوہ ختی و دنبے وغیرہ کے گوشت مروج ہیں، مچھلی وغیرہ بھی میسر ہے۔ کیا کبھی سائنسداں نے بھی کوئی گوشت ایجاد کیا ہے۔؟

(باقی)

عربی ادب میں ہندوستانی فضا

(۲)

مولوی سید محمد ضیاء الدین شمسی طہرانی لکچرار شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نویں صدی ہجری کے مجدد امام جلال الدین سیوطی نے ہندوستان کے کئی لفظوں کا استعمال قرآن میں ثابت کیا ہے۔ ان میں یہ تین لفظ خصوصی اہمیت کے مالک ہیں:

فلفل یہ پیپلا کا معرب ہے۔ عربی میں اس سے صیغے بھی بنائے گئے ہیں۔ مثلاً مفلفل اس چیز کو کہتے ہیں جس میں فلفل کی خوشبو ملائی گئی ہو۔ عربی ادب میں اس لفظ کا استعمال بہت کثرت سے ہوا ہے۔ امرء القیس کہتا ہے ؎

کأنَّ مُکاکیَ الجواءِ غُدَیّۃً
صُبِحْنَ سُلافاً مِن رَحیقٍ مُفَلفَلٖ

یعنی مقامِ جوار کی مُرغابیاں ایسی حواس باختہ تھیں گویا ان کو کالی مرچ ملی ہوئی بہترین صبوحی پلائی گئی ہے۔

ساج یہ ساگوان کا معرب ہے جو ہندوستان کی بہترین عمارتی لکڑی سمجھی جاتی ہے اس کا استعمال قدیم زمانے سے عرب میں ہوتا تھا۔ احادیث سے

اس کا ثبوت ملتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اس لکڑی سے بنا ہوا سامان استعمال فرمایا ہے۔
نابغہ شیبانی کہتا ہے ؎

وقبۃ لا تکاد الطیر تبلغھا
اعلی محاریبھا بالساج مسقوف

یعنی اس قبہ کی بلندی کو پرندے بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی سب سے اونچی محراب پر ساگوان کی چھت بنی ہے۔

قسط یہ لفظ کُٹھ کا معرب ہے اسے کُسط اور کُشت بھی کہتے ہیں۔ یہ ہندوستان کی مشہور دوا ہے جو عرب میں بھی مشہور تھی اور بکثرت استعمال کی جاتی تھی۔ احادیث میں اس کے بہت سے فضائل و فوائد درج ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ نے اس کے استعمال کی تاکید کی ہے۔ ابن ابی حاتم نے تجارتی کشتی کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے ؎

فقد اوقرن من قسط ومن ندا
ومن مسک احم ومن سلاح

یعنی یہ کشتیاں بھاری مقدار میں قسط، عود، مُشک اور اسلحہ لائیں۔

داذی یہ تاڑی کا معرب ہے۔ اگرچہ تاڑی عرب میں بھی ہوتی تھی مگر ابن خُردا ذبہ کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہند سے بھی تاڑی عرب میں جاتی تھی۔ ایک عرب شاعر نے اس کا ذکر یوں کیا ہے ؎

شربنا من الداذی کاننا
ملوک لنا بر العراقین والبحر

یعنی ہم نے یوں تاڑی پی کہ نشہ میں بادشاہ بن گئے اور عراق عرب اور عراقِ عجم اور سمندر ہمارے قبضے میں آگئے۔

ان الفاظ کے استعمال کے علاوہ عرب شعراء نے ہندوستان کے مقامات و
احوال پر اشعار کہے ہیں اور اس ملک کی ہمہ گیر فضا کی بڑے ہی دلکش انداز میں
تصویر کشی کی ہے۔ اس سلسلے میں غالباً سب سے پہلا شاعر فرزدق ہے جس نے
حاکم سندھ تمیم بن زید قینی کے پاس ایک سپاہی کے بارے میں منظوم سفارش
لکھی تھی۔ عباسی دور کے مشہور شاعر ابو العتاہیہ ۲۱۳ھ نے بھی اپنے دو شعروں
میں سندان کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ابو عبادہ بُحتری (۲۸۴ھ) نے سندان
بیاس اور رجاس کا تذکرہ کیا ہے۔ حکم بن عمرو تغلبی اور اعشیٰ ہمدانی نے
مکران اور ہندوسندھ کا تذکرہ کیا ہے۔ ابو الضلع سندھی جس نے بغداد میں
زندگی گزاری اور وہیں انتقال کیا، ایک نظم لکھی ہے جس میں سرزمین ہند کو
خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ابو الضلع کی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ دعبل نے
اس کی فصاحت و بلاغت کا اعتراف کیا ہے۔ ابن الجراح نے کتاب الورقہ میں
اڑسٹھ ۶۸ منتخب و ممتاز عربی کے شعراء کا ذکر کیا ہے ان میں ابو الضلع کا چالیسواں
ہے۔ قزوینی نے ہندوستان سے متعلق اس کے مندرجہ ذیل اشعار آثار البلاد
میں درج کئے ہیں (ص ۸۵) ۔

لقد انکر اصحابی وما ذالک بالامثل
اذا ما مدح الهند وسهم الهند فی المقتل
لعمری انها ارض اذا القطر بها ینزل
یصیر الدر والیاقوت والدر لمن یعطل
فمنها المسك والكافور والعنبر والمندل
واصناف من الطیب یستعمل من ینغل
ومنها العاج والساج ومنها العود والصندل
وان التوتیا فیه کمثل الجبل الاطول

وفیہ الدار صینی وفیہ نبت الفلفل
ومنہا الببر والنمر ومنہا الفیل والدعقل
ومنہا الکوک والببغا والطاؤس والجوزل
ومنہا شجر الرائح والشاسم والفلفل
سیوف مالہا مثل قد استغنت عن الصیقل
اماح اذا ماھزت اھتزلہا والجحفل
فہل ینکر ھذا الفضل
الا الرجل الاخطل

ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ جب میدان جنگ میں ہندوستان کی او
اور اس کے سامان کی تعریف کی گئی تو ہمارے دوستوں نے اسے ناپسند کیا لیکن ان لوگوں کی ناپسندیدگی بالکل نامناسب تھی۔

زندگی کی قسم یہ تو ایک ایسی سرزمین ہے کہ یہاں کی بارش کا ہر قطرہ زیور سے محروم انسانوں کے لئے یاقوت، موتی اور شیریں دودھ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہندوستان مشک، کافور اور صندل کا مخزن ہے۔ یہاں عنبر اور عود پیدا ہوتا ہے اور طرح طرح کی خوشبودار چیزیں یہاں پیدا ہوتی ہیں اور ان لوگوں کے کام آتی ہیں جنھیں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں ہاتھی دانت، جائے پھل، عود، صندل اور توتیا کثرت سے پایا جاتا ہے۔ یہاں شیر، ببر، چیتا، ہاتھی، بھالو، سارس، طوطا، مور، اور کبوتر بھی اکثرت سے ہوتے ہیں یہاں ناریل اور آبنوس کے درخت اور سیاہ مرچوں کے پودوں کی فراوانی ہے اس ملک کی تلواریں بے نظیر ہیں جنھیں صیقل کرنے کی

ضرورت نہیں ہوتی اور یہاں ایسے نیزے بنتے ہیں جن کے استعمال
سے بڑی بڑی فوجیں بھاگ کھڑی ہوتی ہیں۔"

عربی کے مشہور شاعر ابوالعلامعری سے متعلق ڈاکٹر طہٰ حسین مصری نے ایک محققانہ کتاب لکھی ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ وہ بھارت کے اکھنڈ اہنسا وادی اصولوں سے بہت متاثر تھا۔ وہ گوشت مطلقاً نہ کھاتا اور اکثر برت رکھا کرتا تھا۔ اس نے یہ وصیت بھی کی تھی کہ اسے مرنے کے بعد دفن نہ کیا جائے بلکہ ہندوؤں کی طرح جلایا جائے۔ عربی ادب کے امام جاحظ نے ایک رسالہ گوروں اور کالوں کے متعلق لکھا ہے اُس میں اس نے اہلِ ہند کے خصائل وشمائل، ان کے علوم وفنون اور ان کی صنعت وحرفت کا تذکرہ نہایت شاندار الفاظ میں کیا ہے:

"میں جانتا ہوں کہ اہل ہند نے علم ریاضی وہیئت ونجوم میں بہت ترقی کی ہے۔ علم طب میں بھی ان لوگوں کو کمال حاصل ہے اور اس علم کے مخفی رازوں سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ مشکل امراض کے علاج میں وہ بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ سنگ تراشی، معماری، مصوری اور دوسرے فنون میں انھیں آخری درجہ کا کمال حاصل ہے۔ ان کی بنائی ہوئی رنگین تصویریں محراب اور دوسری عمارتوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں شطرنج کا اعلیٰ درجے کا کھیل رائج ہے۔ اس کے لئے دوسرے کھیلوں کی بہ نسبت عقل وفہم کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ یہ لوگ نہایت عمدہ چمکدار تلواریں بناتے ہیں۔ وہ بہترین شمشیر باز ہیں اور اس میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ انھیں ایسے منتر معلوم ہیں جن سے جسم سے زہر کے آثار دفع کئے جاسکتے ہیں اور جسمانی درد اور دکھ کا علاج کیا جاتا ہے۔ ان کا فن موسیقی بہت ہی دلفریب ہے۔

ان کے ایک باجے کا نام کنکولا ہے۔ یہ باجا کدو پر صرف ایک تار لگا کر بنایا جاتا ہے اور ستار اور جھانجھ کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے ہاں مختلف قسم کے ناچ مروج ہیں۔ نیزہ بازی میں خاص کمال حاصل ہے۔ یہ لوگ فن . . . سے بھی واقف ہیں۔ ان کا ایک خاص رسم خط ہے، جو مختلف زبانوں کے حروف تہجی پر مشتمل ہے۔ اس رسم خط کے علاوہ دوسرے متعدد رسم خط بھی رائج ہیں۔ ان کے ادب میں طویل نظموں اور خطبوں کی کثرت ہے۔ فلسفہ اور ادب سے انھیں خاص ذوق ہے۔ کتاب کلیلہ و دمنہ (جو دراصل پنچ تنتر کا ترجمہ ہے) ان ہی سے ہم لوگوں کو ملی ہے۔ غرض یہ لوگ نہایت طباع اور مستعد ہوتے ہیں۔"

(رسائل الجاحظ ص ا طبع مصر ۱۳۲۴ھ)

جاحظ کے اس اقتباس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عربی ادب میں ہندوستانی فضا کی رنگا رنگی کا تصور کس قدر وسیع و ہمہ گیر ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد یہاں کی فضا عربی ادب پر براہ راست اثر انداز ہو رہی ہے۔ ہندوستان کے رسم و رواج، فلسفہ، تہذیب و تمدن، ادب پر اور اہم شخصیتوں پر عربی میں مضامین، کتابیں اور نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔ یہاں کی اکثریت مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد، رابندر ناتھ ٹیگور، اقبال اور اندرا گاندھی کا احترام کرتی ہے اور ان کے افکار و تاثرات سے غیر معمولی طور پر متاثر ہے۔

تنبیہ الغفول
ایک تعارف

جناب محمد صلاح الدین عمری - ریسرچ اسکالر، شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

زیر نظر مخطوطہ "تنبیہ الغفول فی اثبات اسلام آباء الرسول" کے مصنف قاضی ارتضا علی خاں خوشنود، انیسویں صدی کے ایک متبحر عالم اور باذوق فارسی وعربی شاعر ہیں۔

قاضی صاحب کی پیدائش قصبہ گوپامئو (ضلع ہردوئی، اودھ) کے ایک علمی گھرانے خاندان فاروقیاں میں ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۳ء میں ہوئی۔ علوم دینیہ کے علاوہ قاضی صاحب کو دنیاوی علوم پر بھی عبور حاصل تھا۔ نیز آپ ایک صاحب طرز ادیب اور اچھے عربی و فارسی شاعر بھی تھے۔ آپ کی متعدد علمی تصانیف کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے جس موضوع پر لکھا اس میں اپنی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کے جوہر لٹائے ہیں۔ علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کے بعد آپ اپنے والد قاضی مصطفیٰ علی خاں بہادر فاروقی کے پاس مدراس چلے گئے تھے، جہاں ایک عرصہ تک درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ آپ کی علمی لیاقت کو سراہتے ہوئے وہاں کے نواب عظیم الدولہ بہادر

نے آپ کو دارالافتار کی ذمہ داریاں سونپ دیں۔ پانچ سال کے بعد چتوڑ میں حکومت کی جانب سے قاضی القضاۃ کے عہدہ پر سرافراز کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد مفتی صدر عدالت کے منصب پر آپ کا تقرر ہوا اور پھر آپ کی بے پناہ علمی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت نے آپ کو تمام ممالک محروسہ متعلقہ حکومت مدراس کے عہدۂ قضاء کی عظیم خدمت سپرد کردی۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"وکان رحمہ اللہ من کبار العلماء وانتهت الیہ ریاسۃ العلم والتدریس بمدراس، انتفع بہ جمع کثیر من العلماء ولہ مصنفات مفیدۃ ممتعۃ۔"

(یعنی آپ کا شمار عظیم علماء میں ہوتا تھا، مدراس میں درس وتدریس کی سربراہی آپ ہی پر ختم ہوگئی۔ آپ سے علماء کی ایک بڑی تعداد نے استفادہ کیا ہے۔ آپ کی مفید اور نفع بخش تصنیفات بھی ہیں)۔

قاضی صاحب کی مستقل علمی تصانیف میں نفائس ارتضیہ، نقد الحساب، فرائض ارتضیہ، فوائد سعدیہ، مواہب سعدیہ، صلوٰۃ ارتضیہ، تنبیہ الغفول، رسالہ در امام مہدی علیہ السلام اور تصریح المنطق کے علاوہ بہت سی کتابوں کی شرحیں اور حاشیے بھی آپ نے لکھے ہیں۔ جن میں قصیدہ بردہ کی فارسی شرح مراصد ارتضیہ فی کواکب المضیئہ، منحۃ السرار فی شرح الدعاء المسمیٰ بکاشف الضرار، حاشیہ صدرا، حاشیہ میر زاہد، حاشیہ ہدایۃ الحکمۃ، حاشیہ جلالیہ، شرح چہل کاف، حاشیہ شرح مواقف، حاشیہ بر نفائس ارتضیہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ آپ کی یہ سب تصانیف کتب خانہ فاروقی، گوپامئو میں محفوظ ہیں۔ چند کتابوں کے علاوہ آپ کی بیشتر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔ قاضی صاحب فارسی، عربی اور ہندی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ خوشنود تخلص تھا۔ ایک فارسی دیوان بھی کتب خانہ فاروقی میں محفوظ ہے۔ عین ممکن ہے کہ آپ کی اور بھی علمی تصانیف مدراس کے

کسی کتب خانہ میں موجود ہوں ۔

زیر بحث کتاب تنبیہ الغفول بھی مخطوطہ کی شکل میں کتب خانہ فاروقی میں موجود ہے ۔ اس کا اصل نسخہ تو فارسی زبان میں ہے لیکن اس کا ایک عربی ترجمہ بھی اسی نام سے کتب خانہ میں ہے ۔ اگرچہ تصریح الانساب (مصنفہ مولانا یاور حسین صاحب نقشبندی) میں قاضی صاحب کے تذکرہ کے تحت ان کی اس کتاب کو مطبوعہ لکھا گیا ہے لیکن کوئی تفصیل نہیں کہ کب کہاں اور کتنی تعداد میں طبع ہوئی ۔ اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ کتب خانہ فاروقی میں بھی موجود نہیں ۔ کتاب میں جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے ۔ آباء رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلام کے بارے میں مدلل بحث کی گئی ہے ۔ آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ نسب بھی حضرت آدمؑ تک مرتب کیا گیا ہے ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد کتاب کو اس مسجع عبارت سے شروع کیا گیا ہے :

"جائیکہ تاجدار لولاک ، وشہریار سریر افلاک ، زبان فصاحت بیان بکلمہ لا احصی کشاید ، از دست وزبان کہ برآید کز عہدۂ شکرش بدر آید ، جل جلالہ عم نوالہ و در مقامیکہ عرفان وعارج معارج ایقان نغمۂ ما عرفناک سرآید الخ"

تقریباً دو صفحوں کی اس تمہیدی عبارت کے بعد مصنف اپنا مقصد واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "بداں اے عزیز وفقك اللہ بالتقوی وایدك باتباع سنن الہدی کہ باجماع اہل ایماں ایذار آں سرور انس وجاں ، موجب نکال دنیا وخسران عقبی است ، وا ذیتے بالا تر ازیں نتواند بود کہ در حق آباد آں رسول اکرم کہ شریف ترین مخلوقات حسباً ونسباً از دے ظہور نمودہ نسبت غلو و عذاب واستحقاق جہیم کردہ شود ۔"

پھر وہ قرآن کریم کی آیت إن الذین یؤذون اللہ ورسولہ لعنہم اللہ فی الدنیا والآخرۃ وأعد لہم عذابا مهینا (یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں، اللہ نے ان پر دنیا و آخرت میں لعنت بھیجی ہے اور ان کے لئے اہانت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے) نقل کرنے کے بعد ذخائر العقبی کی حضرت ابوہریرہ رضؓ سے مروی ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ جب سُبیعہ بنت ابی لہب نے دربار رسالت میں شکایت کی کہ اے رسول اللہ! لوگ مجھے بنت حمالۃ الحطب کہتے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غضبناک ہو گئے اور فرمایا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ میرے اعزہ کو بُرا بھلا کہہ کر مجھے اذیت دیتے ہیں اور میری اذیت خدا کی اذیت کا موجب ہے ...... قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ جب سُبیعہ ــــ جس کے والدین یقیناً دوزخی ہیں ــــ کو ان الفاظ سے پکارنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی شدید اذیت پہونچاتا ہے تو آبار رسول ــــ جن کے بارے میں آثار صریحہ خاموش اور اخبار صحیحہ مشتبہ ہیں ــــ کے بارے میں اس قسم کا کوئی فیصلہ کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کس قدر اذیت ناک ہوگا۔ پھر وہ شیخ کمال الدین تسمنی سے نقل کرتے ہیں کہ کسی نے قاضی ابوبکر مالکی سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص والد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دوزخی کہتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ وہ ملعون ہے۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "بدانکہ در اثبات این مقصد لطیف و مطلب ضعیف دو مسلک است۔"

(۱) پہلا مسلک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آبار و اجہات کرام، اخبار صحیحہ اور آثار صریحہ کی رُو سے زمانۂ جاہلیت میں مروّج زنا سے مبرّا تھے اور پاک و صاف زندگی گذارتے تھے اور جو بھی ان صفات و خصائل حمیدہ سے متصف ہو

وہ مشرک نہیں ہے۔ اپنے اس موقف کو مدلل انداز میں ثابت کرتے ہوئے اس ضمن میں بارہ مختلف راویوں کی احادیث بیان کرتے ہیں۔ مثلاً پہلی حدیث میں وہ لکھتے ہیں کہ حضرت انس رض سے ابونعیم نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "آدم کے وقت سے ہی اللہ تعالیٰ مجھے پاک اصلاب سے، صاف، عیوب سے مبرّا اور آراستہ ارحام میں منتقل کرتا رہا اور کسی نسب میں اگر دو فرقے ہوئے تو میں ان میں سے بہتر فرقہ میں تھا۔ اسی طرح دیگر احادیث بھی تقریباً اسی مضمون کی شامل کی گئی ہیں۔

(۲) دوسرے مسلک کی تفصیل میں وہ لکھتے ہیں کہ آدم ؑ سے کنانہ تک سب ہی موحّد تھے۔ پھر آدم سے نوح بن لمک بن متوشلخ بن اخنوع یعنی ادریس ؑ بن بیارد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم سب ہی شریعت حقہ پر تھے اور بت پرستی نوح کے زمانہ میں رائج ہوئی۔ چنانچہ مستدرک، تفسیر ابن جریر اور ابن منذر وغیرہ میں آیۃ "کان الناس اُمۃ واحدۃ" (لوگ ایک ہی قوم تھے) کے سلسلہ میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ "آدم و نوح کے درمیان دس صدیاں گذریں، ان صدیوں کے سب لوگ شریعت حق پر تھے پھر جب ان میں اختلافات ہونے لگے تو اللہ نے نبیوں کو مبعوث کیا۔" اس ضمن میں بھی مصنف نے تین روایتیں نقل کی ہیں پھر وہ لکھتے ہیں کہ اسی طرح نوح کے عہد سے لے کر ابراہیم بن تارخ بن ناخور بن شاروح بن اُراغو بن فالغ بن عابر بن شالخ بن اُرفحشد بن سام بن نوح علیہ السلام تک کوئی بھی مشرک نہیں ہے۔ اس کو بھی وہ طبقات ابن سعد کی روایت سے ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ان الناس من عہد نوح لم یزلوا ببابل وھم علی الاسلام الخ" طوفان نوح کے زمانہ سے لوگ ہمیشہ بابل میں اقامت گزیں رہے اور سب کے سب شریعت اسلامیہ کے پیرو تھے۔ یہاں تک کہ ان کے بادشاہ نمرود بن کوش بن کنعان نے ان کو عبادت اصنام کی دعوت دی۔ اس مسلک میں بھی وہ بہت وضاحت

اور دلائل و براہین کی روشنی میں بحث کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آباو اجداد کے اسلام کو ثابت کرتے ہیں۔

پھر حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے احیار کے سلسلہ میں حضرت عائشہ رضؓ اور دیگر محدثین کی روایتیں نقل کرتے ہیں کہ جب ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع میں جا رہے تھے کہ آپ کا گذر عقبۃ الحجون سے ہوا۔ اس وقت آپؐ پر رقت طاری ہو گئی اور آپؐ رنجیدہ ہو گئے۔ آپؐ کو دیکھ کر میں بھی آبدیدہ ہو گئی۔ پھر آپؐ کو کامیابی حاصل ہوئی اور آپؐ اتر کر بولے اے حمیرا (عائشہ) تو یہیں ٹھہر، میں اونٹ کے پہلو میں کھڑی ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کافی دیر کے بعد تشریف لائے تو آپؐ کے چہرہ سے خوشی و مسرت جھلک رہی تھی۔ میں بولی آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں! آپؐ جب گئے تھے تو بہت غمزدہ اور آبدیدہ تھے، میں بھی آپؐ کے رونے سے رو دی تھی۔ کیا بات ہے اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ آپؐ نے فرمایا۔ میں اپنی ماں کی قبر کے پاس گیا اور خدا سے دعا کی کہ ان کو زندہ کر دے۔ چنانچہ خدا نے ان کو زندہ کر دیا اور وہ مجھ پر ایمان لے آئیں۔ پھر اللہ نے ان کو اسی حالت پر واپس کر دیا یعنی وہ فوت ہو گئیں۔ مصنف نے اس طرح کی پانچ روایتیں نقل کر کے دلائل پیش کئے ہیں۔

آخر میں مصنف نے اس سلسلہ میں دس اعتراضات کے جوابات بالترتیب بڑے تفصیلی اور مدلل انداز میں دیئے ہیں۔

اختتام کے طور پر وہ لکھتے ہیں کہ فافھموا استقموا ولا تتبع خطوات الشیطان فان الشیطان للانسان عدو مبین، الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سید الخلق محمد و الہ وصحبہ اجمعین۔

خاتمہ میں جو کاتب کا تحریر کردہ ہے اس طرح کی عبارت ہے:

تمت والفائدۃ عمت، الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم۔ رسالہ تنبیہ الغفول فی اثبات اسلام آباء الرسول تصنیف جناب زبدۃ العلماء والعارفین وافضل العلماء الراسخین حضرت قاضی مولانا محمد ارتضیٰ علی خاں صاحب وقبلہ مدّ اللہ ظلال افضالہم وضاعف اجلالہم موافق حکم جہاں مطاع صاحب علو گہر والا نسب صاحبزادہ بلند نسبت بتاریخ ہفتم شہر جمادی الثانی ۱۲۴۷ھ از خط کمترین بدر الدین بتکملہ رسیدہ۔ تمت۔

اس کے بعد نیچے سرخ روشنائی سے یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

الٰہی بیامرز ایں سہ را
مصنف، نویسندہ، خوانندہ را

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ نسب اس طرح دیا ہوا ہے:

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبداللہ بن عبدالمطلب، بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان بن اُد بن اُدد بن الہمیسع بن سلامان بن ثابت بن حُمل بن قیدار بن اسماعیل بن ابراہیم بن آزر بن ناخور بن شارخ بن ارا غوبن فالغ بن خار (یا عابر) بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح بن لمک بن متوشلخ بن اخنوخ بن یارد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

ان سب اسناد کی تفصیل حاشیہ پر دی گئی ہے جس میں ہر فرد کی اولاد ذکور و اناث، اس کے ماں باپ کے نام کے ساتھ کنیت، بھائی بہنوں کا تذکرہ، دیگر حالات اور سکونت نیز اختلافات کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔

منطق و فلسفہ

ایک علمی و تحقیقی جائزہ

جناب محمد اطہر حسین قاسمی بستوی

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی رائے

مولانا محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ معقولی کتابوں سے متنفر رہتے تھے اور ان کو اشراقیین و مشائین کا جمع کیا ہوا گوہ موت کہتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ جب حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ کے قافلہ کا ریاست رامپور جانے کا ارادہ ہوا تو وہ زمانہ نواب احمد علی خاں کا تھا، جب علمائے رامپور (جو معقولات کے شیدائی تھے) کو اس ارادہ کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو سید صاحب کے لوگوں کو بالخصوص مولوی اسمٰعیل صاحب کو نیچا دکھایا جائے اور مشورہ سے ایک عالم صاحب کو گفتگو کے لئے منتخب بھی کر لیا گیا۔ اس زمانہ میں رامپور میں ایک صاحب شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے شاگرد تھے جو رامپور ہی کے رہنے والے تھے، جب ان کو اس مشورہ کی اطلاع ہوئی تو وہ رامپور سے پیدل روانہ ہوئے اور دو تین منزل چل کر سید صاحب کے قافلہ سے ملاقات کی

اوران لوگوں سے کہا کہ آپ صاحبوں کا رامپور تشریف لے جانا مصلحت نہیں ہے کیونکہ وہاں کے علماء نے آپ لوگوں سے مناظرہ کا مشورہ کیا ہے اور وہ مناظرہ پر تلے ہوئے ہیں اور اگر جانا ہی ہے تو اور لوگ جائیں مگر مولانا اسمٰعیل صاحب کا جانا کسی طرح مصلحت نہیں ہے کیونکہ وہاں کے علماء ان کے خاص طور پر درپے ہیں، اس کے بعد وہ مولانا اسمٰعیل صاحب کے پاس گئے اور ان سے خصوصیت سے اس واقعہ کو بیان کیا اور درخواست کی کہ آپ ہرگز رامپور تشریف نہ لے جاویں۔ مولانا نے فرمایا کہ:

"یہ آپ کا احسان ہے کہ آپ نے ہم لوگوں کی وجہ سے اس قدر تکلیف گوارہ کی اور ہم آپ کے ممنون ہیں لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی وجہ سے اتنی پریشانی ہو کیونکہ وہ لوگ یا معقول میں گفتگو کریں گے یا منقول میں گفتگو کریں گے، تو جو بات ہمیں معلوم ہوگی ہم اس کا جواب دیں گے اور جو نہ معلوم ہوگی ہم صاف کہدیں گے کہ ہم نہیں جانتے اور اگر وہ معقول میں گفتگو کریں گے تو خدا نے عقل ہمیں بھی دی ہے، وہ اشراقیہ اور مشائیہ کا جمع کیا ہوا گوہ اچھالیں گے، اس کے جواب میں ہم بھی اپنی عقل سے گوہ اچھالیں گے، دیکھیں وہ کہاں تک چلتے ہیں۔"

غرض مولانا نے اپنا ارادہ فسخ نہیں کیا اور قافلہ کے ہمراہ رامپور پہونچے، جب رامپور پہونچے ہیں تو حسب قرارداد باہمی علمائے رامپور نے اپنے منتخب عالم کو مناظرہ کے لئے بھیجا، اس نے پہونچ کر مولانا سے سوالات شروع کئے اور مولانا نے تمام سوالات کا جواب دیا، یہ گفتگو تین روز تک رہی، جب سائل کے سوالات کا سلسلہ ختم ہوا تو مولانا نے فرمایا کہ آپ کے سوالات تو ختم ہوئے، اب مجھے اجازت ہو تو چند سوالات میں بھی کروں، انھوں نے اجازت دی مولانا نے صرف چار سوالات کئے دو معقول کے اور دو منقول کے، مگر ان کو جواب نہ بن آیا، اس لئے انھوں نے مہلت چاہی

کریں کل جواب دوں گا، آپ نے اجازت دے دی، اگلے دن صبح کی نماز کے وقت اُن کا حجرہ نہیں کھلا، لوگوں نے نماز کے لئے اٹھانا چاہا مگر وہاں سے کوئی جواب نہ آیا، تب لوگوں کو شبہ ہوا تو لوگ کواڑ اتار کر اندر داخل ہوئے، دیکھا تو عالم صاحب مرے پڑے ہوئے ہیں اور انھوں نے سر میں پتھر مار کر خودکشی کر لی ہے۔

(ارواح ثلاثہ صہ ۸۵)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح کا ارشاد

بیہقیٔ وقت حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ حکمت و فلسفہ کو لاشئ محض فرماتے تھے اور اس میں کمال پیدا کرنا گویوں کا کمال قرار دیتے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں :

وخواندن حکمت فلاسفہ لاشئ محض است	اور فلسفیوں کی حکمت پڑھنا لاشئ
کمال درآں مثل کمال مطربان است	محض ہے، اس میں کمال پیدا کرنا
درعلم موسیقی کہ موسیقی ہم فنے است	ایسا ہی ہے جیسے فن موسیقی میں گویوں
ازفنون حکمت ریاضی۔	کا کمال کہ وہ بھی حکمت ریاضی کے
(مالا بد منہ صہ ۱۶۳)	فنون میں سے ایک فن ہے۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی رح کا فرمان

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنی زندگی ارسطو اور افلاطون کے وسوسوں اور ان کے پراگندہ خیالات میں گذارتے ہیں وہ کبھی قرآن کریم کے حقائق و دقائق اور اس کے رموز و اسرار سے واقف نہیں ہو سکتے اور انھیں اس کے علوم عجیبہ کی ہرگز ہوا نہیں لگ سکتی، چنانچہ لکھتے ہیں :

واما من صرف عمرہ بوساوس	جو عمر اپنی ارسطو کے وسوسوں اور
ارسطاطالیس واختار	خیالات میں بسر کرے اور مور دل

شوك القنافذ على ريش الطواويس فهو بمعزل من فهم غوامض الكتاب وادراك ماتضمنه من العجب العجاب	کے پر دل پرٹیلوں کے کانٹوں کو ترجیح دے وہ نہ تو کتاب اللہ کے غوامض و اسرار کا ادراک کرسکتا ہے اور نہ اس کے عجائبات کو پاسکتا ہے۔

(تفسیر روح المعانی جلد اول ص۷)

دیکھیئے کتنے فصیح و بلیغ انداز میں علامہ بغدادیؒ نے بندگان خدا کو قرآن کریم کی ترغیب اور معقولات سے ترہیب کا سبق دیا ہے۔

مفتی محمد صادق جونپوریؒ کا ارشاد

مصنف شمس بازغہ (فلسفہ) ملا محمود جونپوری متوفی ۱۰۶۲ھ کے شاگرد مفتی محمد صادق جونپوریؒ متوفی ۱۰۶۴ھ ایک عابد وزاہد اور متقی انسان تھے، طبیعت میں توکل اور فقر و استغنا زیادہ تھا، دنیا و اہل دنیا سے کوسوں دور رہتے تھے اور اس کے ساتھ بڑے صاحب کشف و کرامت تھے، ان کی بہت سی کرامتیں مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے دیار پورب میں علم اور علماء میں لکھی ہیں، بایں ہمہ مفتی محمد صادق صاحب جونپوری رحمۃ اللہ علیہ معقولیوں کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے، ایک دن ان کے استاذ مشہور فلسفی ملا محمود جونپوریؒ نماز کے وقت تشریف لائے اور امامت کے لئے آگے بڑھے مگر استاذ ہونے کے باوجود مفتی صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے ہٹا دیا اور خود آگے بڑھ کر امامت کی، نماز پڑھنے کے بعد مفتی صاحب نے دست بستہ اپنے استاذ سے عرض کیا کہ:

"حضرت! میں حتی الامکان نماز نہیں پڑھاتا ہوں مگر مجھے حکماء و فلاسفہ کے کلام میں ایمان مشتبہ معلوم ہوتا ہے اس لئے میں نے نماز ضائع نہیں

ہونے دی بلکہ خود ہی امامت کردی۔"

ملا محمود جونپوری اپنے عزیز شاگرد کی یہ بات سن کر بے انتہا خوش ہوئے اور فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اپنے شاگردوں میں ایک کو عابد و زاہد اور عالم باعمل پایا۔

(دیارِ پورب میں علم اور علماء ص ۳۳)

شاہ اسحٰق دہلوی رحؒ کی رائے

شاہ اسحٰق صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فلسفہ کو لغو اور مہمل سمجھتے تھے اور اس کو لایعنی و بیکار قرار دیتے تھے، اسی لئے اس کو کبھی نہیں پڑھایا، ہمیشہ حدیث و تفسیر ہی پڑھاتے رہے، ایک مرتبہ انھوں نے ایک طالب علم کو بے چین دیکھا، اس سے وجہ پوچھی تو اوّلاً اس نے متکبرانہ طور پر اعماض کیا کہ کچھ نہیں، پھر اصرار کرنے پر بتایا کہ شمس بازغہ (فلسفہ) کا ایک مقام حل نہیں ہوا اور استاذ سے اس کے بارے میں اختلاف ہو گیا، میں تین روز سے اس میں الجھا ہوا ہوں، شاہ اسحٰق صاحب رحؒ نے از روئے شفقت فرمایا کہ ذرا ہمیں تو دکھاؤ، اس نے یہ سمجھ کر کہ یہ ایک محدّث علم حدیث کے ماہر ہوں گے، فلسفہ کی کتابوں سے کیا واسطہ، بڑے استغنا سے کتاب ان کے آگے رکھ دی، شاہ صاحب رحؒ نے اس مقام کا مطالعہ کرکے اس کی ایک ایسی واضح تقریر کردی کہ اس کے سب شبہات جاتے رہے، اب تو یہ طالب علم قدموں میں گر پڑا، شاہ صاحب رحؒ نے فرمایا "میاں ہم نے پڑھا سب کچھ ہے مگر اس کو لغو سمجھ کر چھوڑ رکھا ہے۔"

(مجالس حکیم الامت ص ۲۳۶)

محققین صوفیاء کا ارشاد

فلسفہ اور اس کے معانی میں غور و خوض عقل کے لئے حجاب بن جاتا اور وصول حق سے مانع ہو جاتا ہے اس لئے اس سے ضرور بچنا چاہئے، چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"محققین اہل کشف و صوفیاء نے فرمایا ہے کہ لطائف قلبیہ کے ہر ہر لطیفہ میں

دس دس ہزار حجابات ظلماتی و نورانی ہیں اور لطیفۂ قالبیہ کو ملا کر سات لطیفے ہیں تو ستر ہزار حجاب ہوئے، ذکر سے ظلمت دفع ہوتی ہے اور نور لطیفہ کا سالک کو نظر آتا ہے، یہ علامت ان حجابات کے اٹھ جانے کی ہے مثلاً:

حجاب نفس کا شہوت و لذت ہے اور حجاب دل کا نظر کرنا ہے غیر حق پر اور حجاب عقل کا معانیٔ فلسفہ میں غور و خوض کرنا اور حجاب روح کا مکاشفات عالم مثال کے ہیں وعلیٰ ہذا، ان میں سے کسی کی طرف ملتفت نہ ہو، مقصود حقیقی کی طرف متوجہ رہے اور غیر مقصود کی نفی کرتا رہے۔"

(تعلیم الدین صہ ۱۲۴)

حضرت تھانوی رح کے ارشادات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ معقولات کو مذموم عادات میں شمار فرماتے تھے اور اس میں توغل و انہماک کو واجب المنع قرار دیتے تھے، چنانچہ اس کے مفاسد کو بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"منجملہ ان رسوم کے طالب علموں کا بڑے بڑے عہدوں کو حاصل کرنے کے لئے باوجود ضائع ہونے دین کے انگریزی پڑھنا یا معقول و فلسفہ میں دینیات سے زیادہ توغل و انہماک ہے، چونکہ ان دونوں چیزوں کا ضرر رساں ہونا تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہوچکا ہے اس لئے داخل وعید قرآنی ہو کر واجب المنع ٹھہریں گے حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ یعنی یہ لوگ ایسی چیز سیکھتے ہیں جو انھیں نقصان دیتی ہے نفع نہیں دیتی۔"

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ دوسری جگہ فلاسفہ کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:

"تمہارا فلسفہ ایسا ہے کہ پڑھتے پڑھتے دماغ خراب کر لیا اور آخر میں نتیجہ کیا؟ کچھ بھی نہیں، سوائے اس کے کہ اشراقیین کی رائے یہ ہے اور

مشائین کی رائے یہ ہے، معلوم نہیں کہ کونسی غلط ہے اور کونسی صحیح ہے اور ہمارا
علم یہ ہے کہ اول ہی دن ہم نے پڑھا کہ وضو میں اتنے فرض ہیں اور وضو
کرنا شروع کر دیا، اسی وقت سے حاصل نکلنے لگا اور (؟) پر ثواب کی امید
ہوئی اور تمہیں کیا ملا؟ کونسا ثواب مشائین اور اشراقیین کی رائے پر ملنے کی
امید ہے، بس یہی فرق ہے انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیم میں اور حکماء
کی تعلیم میں، فلسفہ تو آگے ہے منطق ہی میں دیکھئے کس قدر مباحثات اور مناظرات
ہیں، ایک ذرا سی بات ہی طے نہیں ہو پاتی، خواہ مخواہ فضول جھگڑے بکھیڑے
اور اس پر نازاں ہیں کہ ہمارے علوم بڑے دقیق ہیں مگر اس دقت کا حاصل
کیا ہے؟ اگر کوئی بات مشکل سے حاصل ہو لیکن یہ امید ہو کہ اس کو حاصل
کر کے کوئی نتیجہ معتدبہ حاصل ہوگا تب بھی مضائقہ نہیں لیکن یہاں حاصل
کا نام صفر ہے۔"

(اشرف الجواب لشفاء المرتاب جلد چہارم صفحہ ۱۷۶)

مجدد الف ثانیؒ کا ارشاد

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فلاسفہ کو شیطانی گروہ قرار دیتے تھے اور ان کے لئے ناکامی و نامرادی
لازم گردانتے تھے اور فرماتے تھے کہ فلاسفہ کی تصدیق انبیاء کی تکذیب ہے اور ان کے
علوم کی تکذیب ہے، چنانچہ ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"خلاصہ یہ ہے کہ فلاسفہ کی تصدیق اور ان کے علوم کی تصدیق انبیاء کی
تکذیب اور ان کے علوم کی تکذیب ہے اس لئے کہ ان دونوں کے علوم
ایک دوسرے سے بالکل مقابل سرے پر واقع ہوئے ہیں، ایک کی تصدیق
دوسرے کی تکذیب کو مستلزم ہے، اب جو چاہے انبیاء کے دین کا پابند
ہو اور اللہ تعالیٰ کی جماعت میں سے اور اہل نجات میں سے ہو اور جو چاہے

فلسفی ہو جائے اور شیطان کے گروہ میں سے ہو اور ناکام و نامراد ہو،
مَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا
اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي
الْوُجُوْهَ ط بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا ۝ (جس کا جی چاہے ایمان
لائے اور جس کا جی چاہے کافر ہو جائے، بیشک ہم نے ظالموں کے لئے
ایسی آگ تیار کی ہے جن کی قناتوں نے ان کو گھیر لیا ہے اور اگر وہ پیاس سے
فریاد کریں گے تو ان کی دادرسی ایسے پانی سے کی جائے گی جو پگھلے سیسہ کی طرح
ہوگا جو منہ کو جلا دے گا اور وہ بری چیز ہوگی) اور سلامتی ہو اس پر جس نے
ہدایت کی پیروی کی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ کے اتباع کی پابندی کی، ان پر
اور ان کے برادران انبیائے کرام اور ملائکہ عظام پر مکمل ترین اور اعلیٰ ترین
درود و سلام ہو۔"

(مکتوب ۲۳ ج ۳ بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی)

مولانا گیلانی رح کا ارشاد

مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۳۷۵ھ معقولات کو مردہ تصور کرتے تھے اور اس
کے تشغل کو مہمل اور اس کے پڑھنے پڑھانے کو اضاعت وقت قرار دیتے تھے، چنانچہ
نہایت درد و کرب کے ساتھ لکھتے ہیں:

"فلسفہ کا تعلق حقائق و واقعات سے نہیں ہوتا بلکہ وہ مفروضہ اوہام سے زیادہ
اور کچھ نہیں ہوتے اس لئے مقبول ہونے کے بعد تھوڑے دنوں پر پھر زمانہ
کا فلسفہ مسترد ہوتا رہا ہے، پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے، ....
... اب بھی یہی ہو رہا ہے، آئندہ بھی یہی ہوتا رہے گا۔ ہمارے زمانہ میں
یہ فلسفہ قطعی طور پر مردہ ہو چکا ہے لیکن ہمارے علماء محض موروثی روایات

کے زیر اثر مرحوم و مدفون فلسفہ کی کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں، آپ ہی بتائیے کہ طلباء کا قیمتی وقت اور عمر کا گرانمایہ حصہ ایک ایسے مہمل شغل میں برباد ہو رہا ہے۔"

(سوانح قاسمی جلد دوم ص ۲۹۷)

مولانا دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"میرا خیال تو یہ ہے کہ واقعی غور و فکر اور محنت و کاوش کی جو مقدار اور جو وقت معقولات کی کتابوں کی عبارتوں کو سمجھنے میں خرچ کیا جاتا ہے اور اب بھی خرچ کرنے والے بیدردی کے ساتھ اسی مشغلہ میں صرف کرتے ہیں، اگر ان کے بجائے اللہ کی کتاب کے ساتھ یہی تعلق پیدا کر لیا جائے تو علم کا نیا باب لوگوں پر کھل جائے گا اور حضرت نانوتوی رح کا یہ ارشاد بجا طور پر صادق آئے گا کہ قرآن مجید کے الفاظ ہی میں غور کرنا چاہیئے۔"

(سوانح قاسمی جلد اول ص ۳۷۶)

شیخ الاسلام رح کی تنقید

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۳۷۷ھ بھی معقولات کی کثرت سے بیزار تھے اور موقع بموقع نصاب تعلیم میں ان کی زیادتی پر تنقید فرماتے تھے، ۱۹۲۸ء میں لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس ہوئی جس میں نہرو رپورٹ پیش کی گئی، شب کی نشست میں مرحوم تصدق حسین شیروانی نے کسی تجویز پر تقریر فرمائی، اس کے بعد حضرت شیخ الاسلام رح ندوۃ العلماء میں تشریف لے گئے، وہاں طلباء کے درس قرآن کے متعلق ایک جلسہ منعقد کیا گیا تھا جس میں آپ نے تقریر فرمائی، دوران تقریر قرآن کریم کے فضائل و آداب بیان کیے اور قدیم نصاب درس میں معقولات کی زیادتی اور قرآن مجید کے درس و مطالعہ کی کمی اور اس کی حق تلفی پر تنقید فرمائی۔ (شیخ الاسلام معاصرین اور عقیدت مندوں کی نظر میں ص ۱۶۱)

حضرت شیخ رح کا ارشاد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۴۰۲ھ معقولات کو کافروں کی زبان قرار دیتے تھے اور اس کے مضر اثرات سے بچنے کی تلقین فرماتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

"قرآن وحدیث میں جو اثرات ہوں گے وہ ظاہر ہے اور کافروں کی زبان میں جو اثر ہوگا وہ بھی ظاہر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جس دن میں نے میبذی (فلسفہ) شروع کی تھی اس رات کو میں نے خواب دیکھا تھا کہ میں ہاتھی پر سوار ہوں، بڑی خوشی سے خواب اباجان کو سنایا، انھوں نے کہا کہ ہاتھی اور سور کی صورت ایک سی ہوتی ہے (صرف بڑے اور چھوٹے ہونے کا فرق ہے) میبذی شروع کرنا ظاہر میں تو ہاتھی پر بیٹھنا ہے لیکن حقیقت میں سور پر بیٹھنا ہے۔"

(فضائل زبان عربی ص۳۱)

حضرت رائے پوری رح کی نفرت حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۳۸۲ھ معقولیوں سے سخت نفرت کرتے تھے اور ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے سے اکثر احتراز فرماتے تھے، چنانچہ ان کا سوانح نگار لکھتا ہے:

"آپ علمائے معقولات کے پاس اٹھنے بیٹھنے اور ان کے حالات سے واقف ہونے کی بنا پر ان سے زیادہ متاثر اور ان کے عقیدت مند نہیں رہے تھے، ان کی آزادروی اور ان میں بعض کے عدم تورع اور بلند بانگ دعاوی سے آپ کی طبیعت متنفر ہوگئی تھی، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ان منطقیوں اور ادیبوں میں تکبر اور حب جاہ دیکھا، وہ کسی عالم کو خاطر میں نہیں لاتے اور ہمچو من دیگرے نیست ان کا قول ہوتا ہے۔"

(سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری ص۴۶)

حضرت شیخ الہند کا طریقۂ کار

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ بھی معقولات سے کچھ زیادہ مانوس نہیں تھے بلکہ یک گونہ اس سے متنفر اور بیزار تھے، چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے کبھی حدیث کی چوکی پر منطق و فلسفہ کی کتاب نہیں رکھی جیساکہ ان کے شاگرد مولانا ثناء اللہ امرتسری بیان کرتے ہیں کہ:

"حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ بڑے پایہ کے عالم تھے، ہرفن کی تعلیم دیتے تھے مگر حدیث کے ساتھ آپ کو خاص انس تھا، میرا چشم دید واقعہ بلکہ روزانہ کے واقعات ہیں کہ آپ جس چوکی پر حدیث کی کتاب رکھ کر پڑھاتے تھے معقولات کی کتابیں اس پر نہیں رکھتے تھے، یہ واقعہ میں ساری مدت تعلیم میں دیکھتا رہا، بحق حدیث آپ کے حسن عقیدہ کا اظہار ان اشعار میں کردوں تو بجا ہے، آپ گویا زبان حال سے فرماتے تھے ؎

کیا تجھ سے کہوں حدیث کیا ہے ڈر دانۂ درج مصطفےٰ ہے
صوفی عالم حکیم دینی کرتے رہے اسی کی خوشہ چینی
بابا کے ہاں سے کون لایا جس نے پایا یہیں سے پایا"

(اخبار اہلحدیث امرتسر ص ۸ ۲۶ محرم ۱۳۶۱ھ)

مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی کا ارشاد

مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی معقولات کے مداح نہیں تھے بلکہ اس کو پڑھنے کی ترغیب بھی نہ دیتے تھے، ان کے صاحبزادے مولانا محمد زکریا کاندھلوی لکھتے ہیں کہ مدرسہ مظاہر علوم میں مشکوٰۃ اور حدیث کی کتابیں لمبی لمبی تقریروں سے ہوتی تھیں تو میں نے اپنے والد ماجد مولانا محمد یحییٰ صاحب سے کئی دفعہ اجازت چاہی کہ حدیث کی فلاں کتاب کی سماعت کرلوں مگر انھوں نے بڑی شدت سے منع فرمایا اور یہ فرمایا کہ:

"حدیث کی کتاب اپنے حضرت قدس سرہٗ (مولانا خلیل احمد سہارنپوری) کے علاوہ

کسی سے نہیں پڑھی، البتہ منطق و نطق کی کتاب کسی اور سے پڑھے تو مضائقہ نہیں اور تو چونکہ بے ادب اور گستاخ ہے، منطق اور فلسفہ وغیرہ کے اساتذہ میں سے اگر کسی کی گستاخی کرے گا تو وہ کتابیں جاتی رہیں گی، بلا سے جاتی رہیں لیکن حدیث کے اساتذہ میں سے اگر کسی سے تو نے گستاخی کی تو یہ گوارہ نہیں ہے کہ تیری حدیث ضائع ہو۔"

(ولی کامل صـ ۳۲)

سید الطائفہ حضرت حاجی صاحبؒ کا موقف واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ بھی معقولات سے ناراض اور برافروختہ ہوتے تھے، اور ان کی آمد پر معقولات کا درس بند کر دیا جاتا تھا چنانچہ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ لکھتے ہیں:

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مولانا مملوک علی نانوتوی سے دین کی کوئی کتاب نہیں بلکہ منطق کا مشہور متن سلّم العلوم پڑھتے تھے، اسی عرصہ میں سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ مولانا مملوک علی صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لائے، ابھی قریب بھی نہیں پہونچے تھے کہ مولانا مملوک علی صاحب کی نظر سید الطائفہ حضرت حاجی صاحب پر پڑی، دیکھنے کے ساتھ ہی مولانا مملوک علی صاحب نے پڑھنے والے طلبہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ "لو بھائی کتاب اٹھاؤ حاجی صاحب آرہے ہیں" مولانا گنگوہی نے جھنجلا کر حضرت نانوتویؒ سے کہا بھئی یہ اچھا حاجی آیا ہمارا سبق ہی گیا، حضرت نانوتوی نے فرمایا بابا ایسا مت کہو یہ بزرگ ہیں، اور ایسے ایسے ہیں، مولانا گنگوہیؒ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فرماتے تھے کہ ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی حاجی ہمیں مونڈیں گے۔"

(سوانح قاسمی جلد اول صـ ۲۸۷)

مولانا محمد تقی امینی کا ارشاد مولانا محمد تقی امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی فلسفہ سے خوش نہیں ہیں، بلکہ وہ اس کو روح انسانی کے لئے سخت مہلک اور مضر سمجھتے ہیں اور اس کو جسم بے جان اور درخت بے پھل گردانتے ہیں، چنانچہ اپنی فصیح و بلیغ زبان میں رقمطراز ہیں:

"فلسفہ کسی دور میں بھی انسانی دکھ درد کا علاج کرنے اور نیز روح انسانی کو مطمئن کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے اور دنیا بالآخر مذہب ہی کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہر جدید فلسفہ مذہب کے انحطاط کے دور میں بروئے کار آتا ہے لیکن روح انسانی کو اس سے تشفی نہ ہونے کی وجہ سے بعد میں مذہب کے ساتھ سمجھوتہ کی صورتیں نکالی جاتی ہیں اور مذہب کو تاویل و تزویر کے ذریعہ اس کے مطابق بنانے کی کوشش ہوتی ہے، یہ صورت حال فلسفہ کے لئے یقیناً مفید ہوتی ہے کہ مذہب کے ذریعہ وہ اپنے پائے چوبیں کو مضبوط کرتا ہے لیکن مذہب کے لئے سخت مضر ہوتی ہے، اس سے اس کا اصلی کردار ختم ہو جاتا ہے، اس کی جذب و انجذاب کی حالت [illegible] ہو جاتی ہے اور بالآخر وہ فلسفہ کی صف میں اپنی اقدامی حیثیت کو ختم کر کے [illegible] مدافعانہ صورت میں باقی رہتا ہے۔"

(لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر ص ۱۲۳)

مولانا ابو الکلام آزادؒ کی رائے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم فلسفہ کے شیدائی و فدائی تھے مگر خود اس کے حق میں نہیں ہوئے بلکہ اس کو کلیلہ و دمنہ کی کہانی اور الف لیلیٰ کی داستان کہتے تھے اور اس کے مفاسد و مضر اثرات کو برملا ظاہر کرتے تھے، چنانچہ "غبارِ خاطر" میں فرماتے ہیں:

"طالب علمی کے زمانہ سے فلسفہ میری دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے، عمر کے

ساتھ ساتھ یہ دلچسپی برابر بڑھتی گئی لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ عملی زندگی کی تلخیاں گوارہ کرنے میں فلسفہ سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی، یہ بلاشبہ طبیعت میں ایک طرح کی رواقی بے پروائی پیدا کردیتا ہے اور ہم زندگی کے حوادث و آلام کو عام سطح سے کچھ بلند ہوکر دیکھنے لگتے ہیں لیکن اس سے زندگی کے طبعی انفعالات کی گتھیاں سلجھ نہیں سکتیں، یہ ہمیں ایک طرح کی تسکین ضرور دے دیتا ہے لیکن اس کی تسکین سرتاسر سلبی ہوتی ہے۔ ایجابی تسکین سے اس کی جھولی ہمیشہ خالی رہی، یہ نقدان کا احساس کم کردے گا لیکن حاصل کی کوئی امید نہیں دلائے گا، اگر راحتیں ہم سے چھن گئی ہیں تو فلسفہ ہمیں کلیلہ ودمنہ کی دانش آموز چڑیا کی طرح نصیحتیں کرے گا لیکن کیا اس کھونے کے ساتھ پانا بھی ہے اس بارے میں وہ ہمیں کچھ نہیں تبلاتا کیونکہ تبلا سکتا ہی نہیں اور اس لئے زندگی کی تلخیاں گوارہ کرنے کے لئے صرف اس کا سہارا کافی نہ ہوا۔"

(غبارِ خاطر ص۳۶)

مولانا دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اسے بند نہیں کرسکے گا۔"

(غبارِ خاطر ص۳۷)

مولانا محمد ادریس کاندھلوی رح کا ارشاد

التعلیق الصبیح اور تفسیر معارف القرآن ادریسی کے مصنف مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ معقولات کو اغلوطات اور خرافات کہا کرتے تھے اور اس کی ملمع سازکارروائیوں سے بچنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ معقولیوں کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:

فیا معشر الاخوان والخلان
مالکم قد اعرضتم عن هذه
اللسان ومالکم قد صدفتم
عن علوم السنة والقرآن و
علوم الصحابة والذین
اتبعوهم باحسان ومالکم
قد اشرب فی قلوبکم
حب مزمنة البرطانیة
ورطانتها والاغلوطات
المنطقیة وتلمیعاتها وتمویهات
فلسفة الیونان ان هی الا
اسماء سمیتموها انتم
وآباءکم ما انزل الله
بها من سلطان۔

دوستو اور بھائیو! تمھیں کیا ہوا کہ
اس زبان (عربی) سے اعراض کئے
بیٹھے ہو اور قرآن وحدیث اور صحابہؓ و
تابعین کے علوم سے منہ موڑ لئے
ہو، تمھیں کیا ہوا کہ تمھارے دلوں میں
انگریزیت کی آگ اور اس کی بکواس
اور منطقیانہ بیہودگیاں اور خرافات
اور فلسفہ یونان کی ملمع سازیاں گھونٹ
گھونٹ کر پلادی گئی ہیں، وہ چند
گنے چنے نام ہیں جن کو تم نے اور
تمھارے باپ، دادوں نے رکھ رکھا
ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن کی کوئی
حجت نہیں اتاری ہے۔

(دیباچہ مقامات حریری محشی بحواشی مولانا کاندھلوی ص۵)

باب ہشتم

تکفیرات و تعزیرات

ماضی کی تاریخ بتاتی ہے کہ معقولیوں نے جب جب دنیا میں اپنا سر غرور ابھارا تو علمائے دین نے انھیں کچل کر رکھ دیا اور کبھی انھیں پنپنے کا موقع نہیں دیا، نہیں قتل کئے گئے، کہیں تلوار سے اڑائے گئے، کسی کو زہر ہلاہل دیا گیا، کسی کو قید وبند

کی مشقت میں جکڑا گیا، کسی کی کتابیں نذر آتش کی گئیں، کسی کے خلاف منصوبے بنائے گئے، غرضیکہ انھیں زندگی بھر ذلت و رسوائی اٹھانی پڑی اور چین و اطمینان کا سانس کبھی نہ لینے پائے۔ اگلی سطروں میں انہی واقعات سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے۔ اور ان کے مخفی چہروں کی پورے طور سے نقاب کشائی کی جا رہی ہے:

فلاسفہ کی تکفیر فلاسفہ کے عقائد و خیالات اور ان کے افکار و نظریات مثلاً تعدد قدماء کا قول، آسمانوں میں فرق و التیام کا انکار، ہیولیٰ و صورت کی قدامت کا قول، حق تعالیٰ کے جزئیات کے عدم علم کا قول وغیرہ وغیرہ اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ انھیں مطلقاً دائرۂ اسلام سے خارج کیا جائے اور انھیں اسلام اور مسلمانوں کے لئے سم قاتل گردانا جائے خواہ وہ متقدمین ہوں یا متاخرین، اوائل میں ہوں یا اواخر میں۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فانی رأیتھم اصنافا ورأیت علومھم اقساما وھم علی کثرۃ اصنافھم یلزمھم سمۃ الکفر والالحاد وان کان بین القدماء منھم والاقدمین وبین الاواخر منھم والاوائل تفاوت عظیم فی البعد عن الحق اصنافا۔	میں نے فلاسفہ کی اور ان کے علموں کی کئی قسمیں دیکھی ہیں مگر مختلف اقسام میں منقسم ہونے کے باوجود ان پر کفر و الحاد لازم آتا ہے خواہ حق سے قریب یا دور ہونے میں ان کے متقدمین و متاخرین اور اوائل و اواخر کے درمیان کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو۔

(المنقذ من الضلال ص۱۱)

جبلی باطنی کی تکفیر

یونان کے نامور فلسفی ایبذقلیس کا پیروکار عہد اسلام میں محمد بن عبداللہ الجبلی الباطنی القرطبی تھا مگر علمائے دین نے اس پر بھی کفر کا فتویٰ لگایا جس کا سبب اس کے وہ کفریہ عقائد تھے جو یونانی فلسفہ کے زیراثر پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنے مرشد کے فلسفہ کا بڑا شیدائی تھا، اس نے زندگی بھر اس کی اشاعت کی، اس نے اپنے والد اور ابن وضاح الخشنی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا لیکن جب اس نے اپنے پیشوا کے فلسفہ کا پرچار شروع کیا تو لوگ اس سے متنفر ہو گئے، علماء نے کفر کا فتویٰ لگایا، چنانچہ وہ مشرق کی طرف بھاگ نکلا، مدتوں مشرقی ممالک میں گھومتا رہا، وہاں اعتزال وکلام اور ارباب جدل ومناظرہ کی مجلسوں میں شامل ہوگیا پھر اندلس چلا گیا جہاں زہد وتقویٰ کا لبادہ اوڑھ کر اپنے فلسفہ کی اشاعت میں لگ گیا، کچھ لوگ اس کی صورت سے دھوکا کھاکر اس کے جال میں پھنس گئے اور کچھ متنفر ہو گئے، لوگوں کے عقیدت کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی چرب زبانی سے بڑی بڑی مشکلوں کو سر کر لیتا تھا۔

(تاریخ الحکماء اردو ص ۳۹)

امام منطق کی جلاوطنی

تاریخ بتاتی ہے کہ معقولی افراد جب کہیں پہونچتے اور وہاں اپنی حرکات شروع کرتے تو وہاں کے علماء ان کو جلاوطن کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ شاہ توران عبداللہ ازبک کے عہد میں جب معقولی عالم ملا عصام الدین اسفرائنی کے ذریعہ سمرقند وبخارا میں معقولات کا کچھ زور بندھا تو خبیث الطبع شریر طلباء جہاں کہیں سیدھے سادے سلیم الطبع آدمی کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ گدھا ہے کیونکہ اس سے لاحیوان مسلوب ہے اور چونکہ انتفاء عام مستلزم انتفاء خاص ہوتا ہے اس لئے سلب انسانیت بھی لازم ہے، گویا اس طریقہ سے ہر اچھے بھلے مانس کو ثابت کر دیا کرتے کہ وہ گدھا ہے، اس لئے قاضی ابوالمعالی نے

عبداللہ ازبک شاہ توران کے حکم سے ملا عصام الدین اسفرائنی کو ان کے طلباء کے ساتھ ماوراء النہر سے نکلوا دیا اور معقولات کی تعلیم و تعلم کی نامشروعیت کو ثابت کر دیا۔

(ظفر المحصلین باحوال المصنفین ص۳۱۱)

منطقی کی بری سزا بہت سے معقولیوں اور فلسفیوں نے بڑی بڑی ڈینگیں ماریں کہ ہم یہ کریں گے وہ کریں گے ایسا کر سکتے ہیں ویسا کر سکتے ہیں مگر آخر کار انھیں منہ کی کھانی پڑی، بری طرح سے سزائیں پائیں اور زندگی بھر افسوس کرتے رہے۔ ایک قاری نے قرآن پاک میں جب اس آیت کی تلاوت کی:
إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَعِينٍ ۝ (یعنی اگر تمھارے چشموں کے پانی خشک ہوجائیں تو کس میں قدرت ہے کہ پانی اوپر لاسکے) یعنی یہ میری ہی قدرت ہے کہ پانی کو زمین کی گہرائی میں مخفی کر دیتا اور چشموں کو خشک کر دیتا ہوں پھر میں ہی اس کو دوبارہ چشموں میں لاتا ہوں، اس آیت کو سن کر ایک منطقی فلسفی نے کہا کہ میں لاسکتا ہوں، بس جب وہ رات کو سویا تو خواب میں دیکھا کہ ایک بہادر مرد نے اس کو ایک طمانچہ مارا جس سے اس کی دونوں آنکھیں اندھی ہوگئیں پھر اس بہادر نے کہا او بدبخت! اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو اپنی آنکھوں کا نور واپس لے آ۔ جب وہ خواب سے بیدار ہوا تو اپنی آنکھوں کو بے نور پایا اور اندھا ہوگیا۔

(معارف مثنوی ص۲۳۵)

یعقوب کندی کے خلاف سازش یعقوب بن ابی اسحٰق کندی متوفی ۲۶۰ھ جس کو مامون الرشید نے یونانی کتابوں کے ترجمہ کے لئے مقرر کیا تھا۔ علماء اسلام نے اس کی بھی مخالفت کی اور اس کے درپے

ہو گئے، بلخ کے ایک فقیہ ابو معشر اس غرض سے بغداد گئے کہ وہ بغداد میں جاکر کندی کے حلقہ درس میں شریک ہوں اور علم نجوم کی تعلیم حاصل کرنے کے بہانے سے موقع پائیں تو اس کو قتل کر دیں لیکن ناکام رہے، ابو معشر کے سوا یعقوب کندی کے سب سے بڑے دشمن موسیٰ بن شاکر کے فرزند محمد اور احمد تھے، انھوں نے یعقوب کندی کے خلاف سازش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متوکل نے اس کو سزا دی، موسیٰ بن شاکر کے بیٹوں نے اس کی تمام کتابیں ضبط کرلیں، ایک اور بڑا تاجر بھی جو یعقوب کندی کے پڑوس میں رہتا تھا اس کا سخت مخالف تھا اور لوگوں کو اس کے خلاف بھڑکایا کرتا تھا۔

(تاریخ حکمائے اسلام جلد اول صہ ۸۶)

ابن باجہ کو زہر دیدیا گیا چھٹی صدی ہجری کے نامور فلسفی ابن باجہ متوفی ۵۳۳ھ کو سرقسطہ کے رئیس ابوبکر بن ابراہیم صحراوی نے اپنا وزیر بنالیا کیونکہ اس نے اس کی شان میں بہت سے قصائد مدحیہ لکھے مگر عوام ابن باجہ کے فلسفہ دانی کی وجہ سے اس کی وزارت کو ناپسند کرتے تھے، تاہم ابوبکر بن ابراہیم صحراوی نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اور ابن باجہ بدستور اس کا وزیر رہا لیکن وزارت کے زمانہ میں اس کو کبھی اطمینان حاصل نہیں ہوا، چنانچہ وہ ایک بار ابوبکر بن ابراہیم کا سفیر ہوکر عماد الدولہ بن ہود کی خدمت میں گیا تو اس نے اس کو قید کرلیا اور اس کے قتل کے درپے ہوگیا جب ابن باجہ کو اس کی خبر ہوئی تو کسی حیلہ سے بھاگ نکلا، سب سے بڑی مصیبت عوام کی ناراضگی تھی، ابتدا میں تو ابوبکر بن ابراہیم صحراوی نے اس کی چنداں پرواہ نہ کی لیکن رفتہ رفتہ فوج میں بھی شورش پیدا ہوگئی اور ایک بڑی جماعت ملازمت ترک کرکے چلی گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نے مرابطین کے دربار کا رخ کیا اور شاطبہ میں ابراہیم بن یوسف بن تاشفین کی سرکار میں ملازمت کرنی چاہی لیکن یہاں بھی

اس کو ناکامی ہوئی۔ ابراہیم بن یوسف نے اس کو قید کر دیا اور اس کا تمام مال و دولت ضبط کرلیا۔

(تاریخ حکمار اسلام جلد دوم ص۲۲)

ابن باجہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے جوانی کی حالت میں زہر دیدیا گیا کیونکہ وہ اپنے فلسفہ میں بہت آزاد خیال تھا۔

(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ص۳۷ فروری ۱۹۸۵ء جلد ۶۷ شمارہ ۵)

(باقی آئندہ)

سرسید احمد خاں
کی
ایک نادر نعت

جناب حکیم محمد حسین خاں شفا رام پور

کچھ کیفیتیں اور لذتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کو آدمی محسوس تو کرتا ہے لیکن ان کا الفاظ میں اظہار ممکن نہیں ہوتا۔ اسی قسم کی لذتوں میں سے ایک لذت القا، یا الہام بھی ہے۔ "اہلِ دل" اور "خاصانِ خدا" کا کہنا ہے کہ جب عبادت وریاضت یا تدبر وتفکر کے دوران ایک استغراقی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وجدانِ سلیم "عالم سفلی" سے ملاء اعلیٰ اور پھر مبدا فیاض سے مل جاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں انسان کو "انکشاف حق" یا "دیدار حق" میسر آجاتا ہے۔ اس لمحے اسے یقین ہوتا ہے کہ زندگی کا بھید مل گیا۔ عقدۂ لاینحل کھل گیا۔ معراج ہو گئی۔ اس کیفیت کے دوران کبھی کبھی صاحبِ کشف ایسی باتیں کہہ جاتا ہے یا ایسے کام کر جاتا ہے جو عام انسانوں کی سمجھ اور صلاحیت سے بالاتر ہوتے ہیں۔ کاملین وعابدین کی حیات وملفوظات اس قسم کے واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔

سرسید احمد خاں کی زندگی میں بھی ایک واقعہ کچھ اسی قسم کا پیش آیا جس کا

ذکر انھوں نے اپنی مرتبہ "تفسیر قرآن" میں کیا ہے۔ سرسید اپنے مذہب اور قوم پر فدا تھے۔ انھوں نے سیرتِ رسول اکرمؐ اور تفسیر قرآن اس جذبہ کے تحت تصنیف کی تھیں کہ یوروپ کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد مغربی افکار کی یلغار اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا سائنسی ذہن و معقولیت پسندی کہیں حال و مستقبل کی نسل کو اسلام اور اسلامی تعلیمات سے برگشتہ نہ کردے۔ جیسے قد ما کی غلط تشریحات اور فلسفۂ یونان کی روشنی میں اسلامی عقائد کی تعبیرات نے پہلے ہی مشکوک بنا دیا تھا۔ تدبرِ قرآن کے دوران سرسید کو حیاتِ بعد ممات، حشر اجساد، جزا و سزا، وغیرہ ایسے عقائد پر غور کرنا پڑا جن کی معقول و عصری ذہن کے لئے قابل قبول تشریح سے سرسید کی عقل قاصر تھی۔ ان مسائل پر غور کرتے ہوئے سرسید پر استغراقی کیفیت طاری ہوئی اور انھیں یہ محسوس ہوا کہ خود شارع اسلامؐ ان مسائل کے رموز و نکات سرسید کو بتا رہے ہیں۔ جن سے ان کا ذہن مطمئن ہوگیا اور پھر انھوں نے ایک بحث روح سے متعلق سورۃ الاعراف میں صفحہ ۸۴ سے ۱۳۵ تک تحریر کی اور اپنے نزدیک ان مسائل کو عقل کی روشنی میں جدید ذہن کو مطمئن کرنے کے لئے حل کر دیا۔ چونکہ سرسید کا خیال تھا کہ وہ پہلی مرتبہ غیبی اشارے سے اُن مسائل کو حل کر رہے ہیں اور انھیں اس اہم کام میں اپنے جدِ اعلیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید حاصل ہے۔ اس بنا بر اس بحث کے اختتام پر بدیۂ تشکر کے بطور فی البدیہہ ایک فارسی نعت موزوں ہوگئی جس کو انھوں نے اسی بحث میں تحریر کر دیا تاکہ یادگار رہے۔

سرسید نے جس زوال پذیر زمانہ میں جنم لیا تھا اس میں بے عملی، خود فریبی اور شعر و شاعری عام تھی۔ ابتدائے جوانی میں رسم زمانہ کے موافق آہی تخلص رکھ کر سرسید نے شعر و شاعری شروع کی چنانچہ متعدد تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن جلد ہی سرسید نے ضروریات ملک و قوم کو سمجھ لیا اور اپنا وقت

میں صرف کرنا شروع کر دیا جس نے انھیں زندہ جاوید بنا دیا۔ یہ سر سید کی پہلی و آخری نعت ہے جو تفسیر قرآن کا جزو ہونے کی وجہ سے عام نظروں سے اب تک اوجھل تھی۔ ہم اسے معہ اردو ترجمہ کے پیش کر رہے ہیں۔

اس نعت سے قبل بطور شان نزول سر سید نے تحریر کیا ہے۔

کچھ حقائق ہیں جو نہ حکمت یونان میں پائے جاتے ہیں اور نہ فلسفۂ علم کلام میں بلکہ یہ انوار ہیں مشکوٰۃ نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے جو بلاواسطہ سفینۂ سینۂ منور محمدی سے سینۂ احمدی یعنی "میرے سینہ" میں پہنچے ہیں گو کہ نابلد ان کو بہ حقیقت ان انوار محمدی کو نعوذ باللہ کفر و زندقہ سے تعبیر کریں۔

اس کے بعد سر سید نے مؤلفہ کہہ کر اپنی یہ نعت لکھی ہے ؎

نعت	ترجمۂ نعت
(۱) فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم	اس یونان یعنی مدینۃ العلم النبی میں جو میں رکھتا ہوں افلاطون جیسا حکیم ایک طفل مکتب ہے۔
مسیحا رشک میدارد بہ درمانے کہ من دارم	روگی انسانوں کے لئے میرے پاس جو دوا ہے مسیحا بھی اس پر رشک کرتے ہیں۔
(۲) زکفر من چہ می خواہی ز ایمانم چہ می پرسی	میرے کفر اور میرے ایمان کے بارے میں اے لوگو تم کیا پوچھتے ہو۔
ہماں یک جلوۂ عشق است ایمانے کہ من دارم	میرا ایمان خدا اور رسول کے عشق کا ایک جلوہ ہے۔

(۳) خدا دارم دلے بریاں زعشق مصطفےٰ دارم
میں اللہ والا ہوں اور دل عشقِ مصطفےٰ میں بھنا ہوا ہے۔

ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم
لوگ مجھے کافر کہتے ہیں" جبکہ جو ساز و سامان میرے پاس ہے (یعنی دولت ایمان) وہ کسی کافر کے پاس نہیں ہے۔

(۴) ز جبریل امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
میں جبریل امیں سے قرآن کا پیغام سننا نہیں چاہتا۔

ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من دارم
میرے پاس تو وہ قرآن ہے جو مکمل میرے محبوب کی زبان سے ادا ہوا ہے

(۵) فلک یک مطلعِ خورشید دارد باہمہ شوکت
آسمان کے پاس اس قدر شان و شوکت کا صرف ایک خورشید ہے

ہزاراں ایں چنیں دارد گریبانے کہ من دارم
لیکن میرے گریبان میں اس جیسے ہزاروں سورج موجود ہیں

(۶) ز برہاں تا بہ ایماں سنگ ہا دارد رہ واعظ
واعظ عقل و دلائل سے میلوں کے پھیرسے ایمان تک پہنچتا ہے

ندارد ہیچ واعظ ہمچو برہانے کہ من دارم
لیکن میرے پاس جو دلائل ہیں وہ کسی واعظ کے پاس نہیں ہیں۔

تفسیر القرآن ص ۱۱۴ (۱) سورۃ الاعراف ۷ جلد سوم نولکشور لاہور۔

(۲) گلستانِ سخن مطبوعہ ۱۲۷۱ھ میں سرسید کا بحیثیت شاعر صفحہ ۱۲۷ سے ۱۳۰ تک تذکرہ ہے۔

(۳) سرسید کی چند فارسی غزلیں مختلف کتابوں میں منفرد اشعار کئی کتابوں کے ساتھ اول و آخر میں طویل منظومات بھی ہماری نظر سے گذرے ہیں سرسید کی نودریافت کتاب "فقرات" مرتبہ راقم میں بھی ایک شعر ہے۔

جناب حکیم ظل الرحمٰن کے اعتراضات

محمد ثناء اللہ عمری ایم اے عثمانیہ

"مساجد اور معابد قرآن کی روشنی میں"۔ اس عنوان سے راقم کا ایک مضمون دو قسطوں میں برہان کے جنوری اور فروری ۸۵ء کے شماروں میں شائع ہوا تھا۔ اس پر اکتوبر ۸۵ء کے برہان میں جناب حکیم ظل الرحمٰن صاحب دہلوی نے کچھ نقد وارد فرمایا ہے اس سلسلے میں کچھ گزارشات پیش کرتا ہوں:

۱۔ پہلا اعتراض "خداپرستی کے معبد و مرکز اور عبادت گاہ" پر ہے، جواباً عرض ہے کہ یہ سورۂ آل عمران کی آیت ۹۶ کا ترجمہ ہے، اور ترجمہ اس بضاعت کا نہیں ہے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، ملاحظہ ہو ترجمان القرآن جلد اول۔

۲۔ دوسرا اعتراض اَوَّلَ بَیْتٍ کی تشریح سے متعلق ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے اپنی کتاب "سفر حجاز" (مطبوعہ ادارۂ انشائے ماجدی کلکتہ) کے صفحہ ۲۸۹ پر ابن ابی حاتم کے حوالے سے حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کا یہ قول نقل فرمایا ہے: کَانَتِ الْبُیُوْتُ قَبْلَهٗ وَلٰکِنَّهٗ اَوَّلُ بَیْتٍ وُّضِعَ لِعِبَادَةِ اللّٰہِ۔ اس سے ناچیز کی لکھی ہوئی بات ہی کا ثبوت ملتا ہے، نہ کہ حکیم صاحب کے ارشاد کا۔

۳۔ تیسرا اعتراض سورۂ فیل کی شانِ نزول سے متعلق ہے۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں "مکہ کے قریب قیام کے بعد ابرہہ کی فوج کے ساتھ کسی حجازی قبائل کے حملہ اور لڑائی کی شہادت نہیں ملتی اور نہ ہی کسی بیماری کے پھیلنے کی تاریخی شہادت ہے"۔ سردست میرے پاس وہ مآخذ موجود نہیں ہیں جن سے اخذ کر کے میں نے لکھا تھا کہ ابرہہ کی فوج اور حجازی قبائل کے مابین جھڑپ ہوئی تھی۔ میں نے کوشش کی مگر متعلقہ تفسیری کتاب دستیاب نہ ہو سکی، البتہ بیماری پھیلنے کی تاریخی شہادت کے لئے حکیم صاحب قطب شہید کی تفسیر ظلال القرآن کی چھٹی جلد کا صفحہ ۳۹۷۶ ملاحظہ فرمالیں یا مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کی تفہیم القرآن جلد ششم کا صفحہ ۴۶۷ دیکھ لیں۔

۴۔ چوتھا اعتراض واقعہ نخلہ کے سلسلہ میں "غنیمت" کے لفظ پر ہے۔ بعض عرب مفسرین کے علاوہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے بھی اس ضمن میں لفظ غنیمت کا استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول ص ۱۶۵۔

شکر گزار ہوں کہ حکیم صاحب نے میرے مضمون کو درخور التفات گردانا۔ امید کہ ان تصریحات سے ان کی تشفی ہو جائے گی، البتہ ابرہہ اور حجازی قبائل کی جھڑپ کی بات متعلقہ ماخذ دستیاب ہونے کے بعد لکھ سکوں گا۔ وباللہ التوفیق۔

سنہ ۱۹۵۴ء — حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت ۔ تاریخ صقلیہ ، تاریخ ملت جلد نہم

سنہ ۱۹۵۵ء — اسلام کا زرعی نظام ، تاریخ ادبیات ایران ، تاریخ علم فقہ ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول ۔ تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

سنہ ۱۹۵۶ء — ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت طبع جدید دلپذیر ترتیب ، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد دوم ، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

سنہ ۱۹۵۷ء — لغات القرآن جلد پنجم صدیق اکبرؓ ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم ، انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد

سنہ ۱۹۵۸ء — لغات القرآن جلد ششم ، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ، تاریخ گجرات ، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

سنہ ۱۹۵۹ء — حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ، صحابہؓ بعد و کرد بعد

سنہ ۱۹۶۰ء — تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ - ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط ۔ امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام ۔

سنہ ۱۹۶۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد اول ، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ، اسلامی کتب خانے ، عرب کی نیا ، تاریخ ہند پر نئی روشنی

سنہ ۱۹۶۲ء — تفسیر مظہری اردو جلد دوم ، اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ، معارف الآثار ۔ نیل سے فرات تک ۔

سنہ ۱۹۶۳ء — تفسیر مظہری اردو جلد سوم ۔ تاریخ روہیلکھنڈ ، ضلع بجنور ، علماء ہند کا شاندار ماضی اول

سنہ ۱۹۶۴ء — تفسیر مظہری اردو جلد چہارم ، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط ، عرب و ہند عہد رسالت میں ۔ ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

سنہ ۱۹۶۵ء — ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات لادینی دور کا تاریخی پس منظر ، ایشیا میں آخری نو آبادیات

سنہ ۱۹۶۶ء — تفسیر مظہری اردو جلد پنجم ۔ موز عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

سنہ ۱۹۶۷ء — ترجمان السنہ جلد چہارم ، تفسیر مظہری اردو جلد ششم ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

سنہ ۱۹۶۸ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ۔ تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات ۔ اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

سنہ ۱۹۶۹ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم ، تاریخ الفخری ، حیات ذاکر حسین ، دین الٰہی اور اس کا پس منظر

سنہ ۱۹۷۰ء — حیات عبدالحی ، تفسیر مظہری اردو جلد نہم ، مآثر و معارف ، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

سنہ ۱۹۷۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد دہم ، بیماری اور اس کا روحانی علاج ، خلافت راشدہ اور ہندوستان

سنہ ۱۹۷۲ء — فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ، انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل ، عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

No. D (DN) 231 PHONE : 262815 DECEMBER 1986
965—57 Subs. 40/- Per Copy Rs. 3-50

BURHAN (Monthly)

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006.

عبدالرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

سرورق ٹائیٹل با اہتمام جلال پریس مٹیا محل دہلی طبع شد